منتخبات

اُصولِ تفسیر وعلومِ قرآن

اُردو ترجمہ

یتیمۃ البیان فی شيءٍ من علوم القرآن

تالیف

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ

ترجمہ

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مکتبہ بینات

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی



طبع دوم: ۱۴۴۱ھ/2020ء

مکتبہ بینات

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

Tel: 92-21-34927233 Ex. 146-147
E-mail: bayyinat@banuri.edu.pk
www.banuri.edu.pk


بسم الله الرحمن الرحيم

وما يعلم تأويله إلا الله

والراسخون في العلم يقولون آمنا به

كل من عند ربنا وما يذكر إلا أولوا الألباب

(آل عمران ، ٥)

طبعِ جدید

الحمد لله والشكر لله والثناء الجزيل على الله، والصلاة والسلام
على رسول الله، صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وصحبه ومن والاه،
أما بعد:

والد ماجد محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ (۱۳۲۶ھ-۱۹۰۸ء/ ۱۳۹۷ھ-۱۹۷۷ء) کی کتاب ''يتيمة البيان في شيء من علوم القرآن'' کا اردو ترجمہ ''اصولِ تفسیر وعلومِ قرآن'' چند سال قبل شائع ہوکر عام ہو چکا ہے، علمی حلقوں اور متعدد اکابر اہل علم نے اس ترجمہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور مفید آرا و تجاویز سے نوازا، لیکن متنوع مشاغل کی بنا پر نظر ثانی کا موقع نہ مل پایا، اب اس ترجمہ پر نظرِ ثانی کر کے نئی طباعت پیش کی جارہی ہے، اس طباعت میں:

① ترجمہ میں موجود سقم کو دور کیا گیا ہے۔

② پیچیدہ تعبیرات کو حتی الامکان سہل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

③ پوری کتاب میں آیاتِ قرآنیہ کے تحت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا مقبول اردو ترجمہ درج کیا گیا ہے۔

④ حسبِ ضرورت بعض مقامات پر اصل مآخذ سے مراجعت کر کے کتاب اور اس کے ترجمہ میں دَر آئی اغلاط درست کی گئی ہیں۔

⑤ عربی اشعار پر اعراب کا اہتمام کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ اب ان امور کی بنا پر یہ ترجمہ پہلے سے زیادہ مفید ثابت ہوگا، ان شاء اللہ۔

بہرکیف! اپنی وسعت کے مطابق کوشش صرف کرنے کے باوجود اس کاوش میں غلطی کا امکان ہے، لہٰذا اہل علم سے التماس ہے کہ کسی بھی نوع کی خامی محسوس ہو تو ہمیں ضرور اطلاع دیں۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول سے نواز کر صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین!

سید سلیمان یوسف بنوری

۲۵ رجب ۱۴۴۱ھ

فہرست مضامین

عرضِ مترجم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، وبعد:

پیشِ نظر کتاب محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی علوم قرآن کے موضوع پر عربی تالیف "یتیمۃ البیان" کا اردو ترجمہ ہے، حضرت بنوری رحمہ اللہ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے زمانۂ تدریس میں اپنے محبوب شیخ واستاذ، امام العصر، محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "مشکلات القرآن" کا مقدمہ ۱۳۵۶ھ میں "یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن" کے نام سے تحریر فرمایا، جو اس کتاب کے ساتھ "مجلس علمی" کی طرف سے شائع ہوتا رہا، اس کے چالیس سال بعد ۱۳۹۶ھ میں یہی مقدمہ مزید علمی نکات کے اضافے اور نظر ثانی کے بعد "یتیمۃ البیان في شيء من علوم القرآن" کے نام سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی طرف سے علیحدہ مستقل کتابی صورت میں شائع ہوا، یہ اضافات دراصل وہ محاضرات تھے جو ۱۳۷۹ھ کے ماہِ رمضان میں آپ نے طلبہ کرام کے سامنے پیش کیے تھے۔

کسی ذی علم وشعور سے یہ بات مخفی نہیں کہ علوم القرآن کا موضوع انتہائی وسیع ہے اور اس کا احاطہ کسی بھی بشر کے لیے ممکن نہیں، متقدمین ومتاخرین علمائے امت واکابرین نے اس موضوع، بلکہ اس کی جزئیات پر بہت کچھ لکھا، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر اہم باتوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں خاص طور پر درج ذیل امور کے متعلق سیر حاصل قیمتی جواہر پارے قلم بند فرمائے:

① تفسیر قرآن میں اہم اور معتبر ذریعہ تفسیر

② چند مطبوعہ مفید تفاسیر کی خصوصیات وامتیازات

③ مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرائی

④ تفسیر قرآن میں صوفیاء کے اقوال، فرقہ باطنیہ اور صوفیا کی تفسیری تاویلات میں فرق

⑤ تفسیری میدان میں اکابر علماء ہند کے کارہائے نمایاں، نیز اہل باطل واہل حق کی تفاسیر کی نشاندہی

⑥ قرآن کریم کی وجوہ اعجاز کا تفصیلی اور تحقیقی بیان

⑦ قرآن کریم کے چند تفسیری نکات ولطائف، امام العصر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات کی روشنی میں

جامعہ علوم اسلامیہ سے شائع ہونے والے قرآن کریم وسنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کے علمبردار ماہ نامہ "بینات" میں یہ ترجمہ قسط وار شائع ہوتا رہا، اب اسے مکمل کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ کسی بھی کتاب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ایک مشکل کام ہے اور پھر خاص طور پر "یتیمة البیان" علوم القرآن کے ساتھ ساتھ والد ماجد حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے عربی ادب کا ایک بے مثال شاہ کار ہے، اس لیے اسے اردو قالب میں ڈھالنا آسان نہ تھا، یہ محض اللہ کے فضل اور توفیق سے ایک ابتدائی کوشش ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ اور ان کے استاذ وشیخ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے اور ہمیں اکابرین امت کے علمی ذخیروں سے استفادہ کی کامل توفیق عطا فرمائے۔

آمین بحرمة النبي الكريم!

سید سلیمان یوسف بنوری

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

تقدیم

الحمد لله العلي العظیم والصلوٰۃ والسلام علی حبیبه الکریم،

محمد وآله وأصحابه أجمعین، وبعد:

یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے کہ ہم اس قیمتی موتی اور عظیم خزانے کو علماء وطلباء کی خدمت میں پیش کررہے ہیں، جو" یتیمة البیان في شيئ من علوم القرآن" کے نام سے موسوم ہے، پیشِ نظر رسالہ میرے محبوب شیخ، محدث کبیر، علامۃ العصر مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا تالیف کردہ ہے، ان جیسی شخصیت آنکھوں نے نہیں دیکھی، بلکہ خود انہوں نے اپنی جیسی شخصیت نہیں پائی ہوگی۔

یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، یہ وہ گرانمایہ تصنیف ہے جس میں مؤلف نے علوم قرآنی کے متعلق قابلِ قدر مباحث علم کے پیاسوں کے لیے جمع فرمائے ہیں اور گہرے سمندروں سے قیمتی جواہرا کٹھے کرکے اس کتاب میں یکجا فرمادیئے ہیں، قاری اس رسالہ میں ڈوب جائے تو اس کو بھی ایک گہرا سمندر پائے گا، اور اس علمی مذاق کو بھی چکھ لیجیے؛ اس لیے کہ جو چکھتا نہیں اس کو ذائقہ معلوم نہیں ہوسکتا، نفیس تفصیلات اور طویل مباحث کو اس رسالہ میں انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کردیا گیا ہے۔

باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان جیسی کتب سے استفادہ کرنے، اپنی کتاب کی شب و روز تلاوت کرنے، نیز احکاماتِ قرآن پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وهو الموفق والمیسر، وصلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمدٍ وآله وصحبه أجمعین.

ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار

خادمِ جامعہ علوم اسلامیہ کراچی

۱۴۱۶/۱/۲۳ھ۔ 21/06/1995ء

کلماتِ شکر

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان کہ قلبی مشغولیت، انتہائی کم فرصت اور نامساعد حالات کے باوجود مجھے اس رسالہ "يتيمة البيان في شيئ من علوم القرآن" کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے رفیق محبوب استاذ محمد حبیب اللہ مختار کی معاونت، نیز تصحیح وطباعت وغیرہ کے امور میں ان کی نگرانی نے ہی میرے ارادہ کو تقویت بخشی۔

اسی طرح صاحبِ مطبع شاہد حسن صاحب کی طباعت کی محنت نہ ہوتی تو مجھے یہ توفیق حاصل نہ ہوتی، میں تہہ دل سے ان دونوں حضرات کا ممنون ہوں، اللہ ان کو بہترین صلہ عطا فرمائے، آمین!

یہ کتاب میں اس امید کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یہ چھوٹی سی کوشش اس شخص کے لیے نفع مند بنائے، جو قرآن کریم کے ساتھ فکر وتدبر کا تعلق رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ ہی احسان وانعام فرمانے والے اور ہر نیک کام کی توفیق دینے والے ہیں۔

محمد یوسف بنوری

بروز جمعہ/ ٢١ رمضان المبارک/ ١٣٩٦ھ

مقدّمۂ طبع جدید

الحمد لله حمدا يستجلب رضی الله سبحانه و تعالیٰ، والصلاة والسلام علی سيدنا الرسول محمد مايُكافئ منزلته العليا، وعلی آله وصحبه وتبعه دائمًا أبدًا، وبعد:

اب سے چالیس سال قبل میں نے امام العصر، محدث کبیر، حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۵۲ھ) کی کتاب ”مشکلات القرآن“ کے لیے ایک مقدمہ تحریر کیا تھا، جو کئی اہم مباحث پر مشتمل تھا، اس مقدمہ کا مرکزی موضوع امام العصر رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق اعجازِ قرآنی کی تشریح اور قرآنِ کریم کے مضامین میں فہم وبصیرت کے لیے مفید بنیادی قواعد کا بیان تھا، اس کے علاوہ کچھ دیگر امور بھی اتفاقاً ذکر ہوئے تھے، کافی عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اس مقدمہ کو ایک مستقل رسالہ کی شکل دے دوں اور جن مباحث کو قرآنِ کریم کے فہم سے بالواسطہ تعلق نہ ہو، ان کو حذف کردوں اور چند دیگر موضوعات کا بطورِ تکملہ ذکر کردوں، اگرچہ ان کا ذکر اختصار کے ساتھ ہی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا ارادہ اس رسالہ میں تمام مباحث کی تفصیل کا ذکر کرنا ہرگز نہ تھا، بلکہ منتشر موضوعات کے متعلق صرف اشارات پر اکتفا مقصود تھا، پھر یہ مقدمہ بھی انتہائی جلدی میں لکھا گیا، بلکہ گویا فی البدیہہ یکجا کیا گیا؛ اس لیے کہ ”مشکلات القرآن“ کی طباعت اپنے انتہائی مراحل میں تھی اور خود مجھے بھی حج کا سفر اور دیگر اسفار (۱) درپیش تھے، لیکن جب یہ مقدمہ طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا تو طوالت

(۱) یہ سفر حج بیت اللہ اور دربار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری سے شروع ہوا تھا، پھر اس کے بعد ”مجلسِ علمی“ کی جانب سے مولانا سید احمد رضا بجنوری حفظہ اللہ [مؤلف ”انوار الباری شرح صحیح البخاری“ بزبانِ اردو] کی رفاقت میں علامہ زیلعیؒ کی ”نصب الراية لأحاديث الهداية“ اور امام العصر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ”فيض الباري علی شرح البخاري“ کی طباعت کے سلسلے میں قاہرہ جانا ہوا۔

کی بنا پر اس کی حیثیت کتابی مقدمہ کی نہ رہی تھی، پھر اس مقدمہ کی طباعت کے بعد حافظ برہان الدین زرکشی رحمۃ اللہ علیہ "البرھان في علوم القرآن" اور معاصرین میں سے شیخ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ کی "مناھل العرفان" شائع ہوئی، اسی طرح اعجاز قرآنی کے متعلق بھی مختلف کتب منصہ شہود پر آئیں، جو اگر مجھے اس مقدمہ کی تالیف کے وقت میسر ہو جاتیں تو ان سے میں بھی استفادہ کرتا، لیکن اب جبکہ ہمت کمزور ہوگئی ہے اور قویٰ میں ضعف آچکا ہے، نیز فرصتِ وقت بھی مہلت نہیں دیتی اور اعمال واشغال مزید سے مزید تر ہو رہے ہیں اور خوف کی حالت میں شعر گوئی کہاں ممکن ہے؟! ان تمام امور کے پیشِ نظر اس مقدمہ کی تطویل کے بجائے قدرے حذف واضافہ (۱) کے بعد دوبارہ اشاعت کی جارہی ہے، میں نے اس مقدمہ کی اب مستقل رسالہ کی شکل دے دی ہے اور اس کا نام میں نے "یتیمۃ البیان في شيئ من علوم القرآن" تجویز کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس رسالہ کو اپنے موضوع کے متعلق کارآمد بنائے اور اختصار کے باوجود قارئین طلباء کے لیے نفع بخش بنائے اور اس رسالہ کو اپنے فضل واحسان سے محض رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنائے۔

وھو ولي کل توفیق ونعمۃ، وھو حسبنا ونعم الوکیل!

محمد یوسف بن سید محمد زکریا بنوری حسینی

خادم مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی پاکستان

جمعہ/۸ شعبان/سن ۱۳۹۶ھ

6/اگست/سن 1968ء

---

(۱) یہ اضافات وہ محاضرات تھے، جو طلبہ کرام کے سامنے ماہ رمضان ۱۳۷۹ھ میں پیش کیے گئے تھے، ان محاضرات کو میں نے مختصراً اشارات کی صورت میں قلم بند کر لیا تھا:

① اسماء قرآن اور لفظِ "قرآن" کی تحقیق ② قرآن کریم کی حقیقت اور مسئلہ "کلامِ الٰہی" ③ قرآن کریم، باری تعالیٰ کے لامتناہی علوم کا خزانہ اور علماء امت کی قرآن کے متعلق کاوشیں ④ چند مطبوعہ اور مفید تفاسیر کی خصوصیات و امتیازات کا بیان۔

مقدّمۂ طبع اوّل

الحمد لله أنزل على عبده الكتاب ولم يجعل له عوجًا؛ ففتح به قلوبًا غلفا، وعيونا عميا، وآذانا صما، فأقام به حججا، والصلاة والسلام على النبي الأمي الهاشمي القرشي، أفصح من نطق بالضاد، وأوتي جوامع الكلم ومصابيح الدجى، وعلى آله وصحبه وعلماء أمّته وهداة ملأته، الّذين كابدوا للدّين، وغاصوا لأجله لججا، فنشروا القرآن والسنة، وأنفذوا وسعهم في أثرة العلم ودين الحق، فوصلوا كتدا و ثبجا، فهدوا إلى الطيب من القول، وأصلحوا الفساد، ودفعوا الشر عن البسيط، وأقاموا عوجًا، عليهم رحمة الله وبركاته ما دامت العيون تبتهج بباهر آيات الله، والقلوب تشتفي بمعجز كتاب الله وتطمئن به ثلجًا، أمّا بعد:

علوم القرآن کے متعلق یہ چند مباحث میں نے انتہائی عجلت میں جمع کیے ہیں؛ تاکہ کلام و بیان کے اختصار و تلخیص کے ساتھ مختلف مدارس و جامعات سے تعلق رکھنے والے طلباء ساتھیوں کو علوم القرآن کے متعلق کچھ رہنمائی حاصل ہوجائے، مجھے اعتراف ہے کہ علوم قرآنی ایسا ناپیدا کنار گہرا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے، جس کے نشیب و فراز میں امت کے چنیدہ اشخاص تک کی عقلیں حیران و سرگرداں اور ساحل تک پہنچنے میں قاصر رہی ہیں، اسی طرح ان علماء امت نے گزشتہ صدیوں میں بھی اس کی موجوں میں غوطے کھا کر اس کی اتھاہ گہرائیوں سے بیش بہا انمول موتی اکٹھے کیے ہیں۔

سمجھیے یہ بھی علم ہے کہ یہ وافر ذخیرۂ علم جو حافظ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ جیسے امت کے اربابِ علم وقلم کی جانفشانی سے ہمارے سامنے بکھرا پڑا ہے اور علامہ جرجانی، علامہ زمخشری، ابن منیر، تقی الدین سبکی، تاج الدین سبکی، ابن قیم، سکاکی اور تفتازانی رحمہم اللہ وغیرہ علمائے بلاغت نے بلاغتِ قرآنی کے جو لطائف حاصل کیے ہیں، وہ ایسے علوم وحقائق ہیں، جنھوں نے فکر ونظر کو دنگ کر دیا ہے اور متأخرین صغار اہلِ علم تو کجا، کبار اہلِ علم بھی ان حضرات کے علمی تفوق کے سامنے دہشت زدہ ہیں، ان بہتے بادلوں کے سامنے بھلا یہ چند معمولی سے قطرے کیا وزن رکھتے ہیں؟! اور برستی بارش کے سامنے ان چھینٹوں کی کیا قدر وقیمت ہوسکتی ہے؟! لیکن میرے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ ان علماء کی پیش کردہ کتب، سمندر کی موجیں اور بڑی نہروں کے تھپیڑے ہیں تو یہ ان کی بارشوں کی شبنم کے قطرے ہیں، جو ہم جیسے لوگوں کی ان کوتاہ عقلوں کے لیے کافی ہیں، جن کی کشتیاں اس وسیع وعریض علمی سمندر میں چلنے سے قاصر ہیں۔

امید ہے کہ ان مختصر قطروں کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمارے نئے دور کے افراد کو نفع مند فرمائے، اسی طرح یہ بھی امید ہے کہ قارئین محترم ہمارے زمانے کے اہلِ علم کے پیش کردہ عمدہ مباحث بھی پائیں گے، جو مباحث اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان متأخرین کے لیے سمجھنا طے فرمادیئے تھے اور یہ سب اس حدیث نبوی کا مصداق ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان گرامی یوں منقول ہوا ہے:

”مثل أمّتي مثل المطر لا يدري أوّله خير أم آخره“.

”یعنی میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے، معلوم نہیں کہ اس کا پہلا حصہ بہتر ہے یا پچھلا حصہ“۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل فرمائی ہے، ایک اور حدیث جو حضرت جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے دادا سے یوں نقل فرمائی ہے:

’’أبشروا أبشروا، إنّما مثل أمّتي مثل الغيث لا يدرى آخره خير أم أوّله، أو كحديقة أطعم منها فوج عامًا، ثم أطعم منها فوج عامًا، لعل آخرها فوجًا أن يكون أعرضها عرضا، وأعمقها عمقًا، وأحسنها حسنًا ...الخ‘‘

’’خوش خبری سن لو! خوش خبری سن لو! میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے، نہ معلوم اس کا پچھلا حصہ بہتر ہو یا پہلا حصہ، یا اس باغ کی مانند ہے جس سے ایک سال ایک قوم نے کھایا، پھر اگلے سال دوسری قوم نے کھایا، شاید بعد میں آنے والی قوم ان سے زیادہ چوڑی چکلی ہو، ان سے زیادہ گہرے بدن والی اور ان سے زیادہ حسین وخوب صورت ہو‘‘۔ اس حدیث کو امام رزین رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے‘‘۔

اس وہاب وکریم ذات سے امیدوار ہوں کہ اس مختصر رسالے کو اتنا ہی نفع بخش کردے جتنا نفع ان بڑی بڑی کتب سے امت کو پہنچا، واللہ ذو الفضل العظیم!



اسماءِ قرآنی اور لفظِ "القرآن" کی تحقیق

صاحب "الإتقان في علوم القرآن" (علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ) کا بیان ہے کہ ابو المعالی شیدلہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "البرھان" میں قرآن کے اسماء کو شمار کیا تو تعداد پچپیں تک جا پہنچی، نیز صاحب "مناھل العرفان" لکھتے ہیں کہ علامہ جزائری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "التبیان" میں اسماء قرآنی کی تعداد نوے سے زائد نقل کی ہے۔

میرے نزدیک لفظ "القرآن" تو قرآن کریم کا علم شخصی ہے اور دیگر اسماء قرآن کریم کی صفات ہیں، جن میں مشہور صفات "الکتاب"، "الفرقان"، "التنزیل" اور "الذکر" ہیں، چنانچہ سورۂ یوسف، سورۂ شعراء، سورۂ قصص اور سورۂ دخان وغیرہ میں "الکتاب" کو صفت "المبین" کے ساتھ ﴿الکتاب المبین﴾ ذکر کیا گیا ہے، اور (سورۂ فصلت) سورۂ حم سجدہ میں "العزیز" کے ساتھ ﴿وَإِنَّهُ لَكِتَـٰبٌ عَزِيزٌ ﴿٤١﴾ لَّا يَأْتِيهِ الْبَـٰطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ (فصلت:۴۱) ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح سورۂ فاطر میں "المنیر" ﴿وَبِالْكِتَـٰبِ الْمُنِيرِ﴾ (فاطر:۲۵) اور سورۂ زمر میں "المتشابہ" کے ساتھ "الکتاب" کو متصف کیا گیا ہے: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾، (زمر:۲۳) اسی طرح سورۂ فصلت میں ایک اور صفت "فُصِّلَتْ آيَاتُهُ" بھی "الکتاب" کے ساتھ لائی گئی ہے، نیز سورۂ ہود میں باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ﴾ (ہود:۱) اور میں سمجھتا ہوں کہ "الفرقان" اگرچہ وصف ہے، لیکن یہ بھی لفظ "القرآن" کی طرح علم شخصی بن چکا ہے، پھر اس میں وصفیت کا غلبہ ہوا، اس بات

کی کچھ تائید باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے، جس میں قرآن کے لیے لفظ "الفرقان" استعمال کیا گیا ہے:

"تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا"

(فرقان:۱)

ترجمہ: "بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے بندۂ خاص (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمائی؛ تاکہ وہ (بندہ) تمام دنیا جہاں والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔"

حاصل یہ ہوا کہ قرآن کریم کا علم شخصی لفظ "القرآن" ہے، جیسے لفظ "اللہ" اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور لفظ "الفرقان" کا اطلاق قرآن کریم کے لیے ایسا ہی ہے جیسے لفظ "الرحمٰن" کا اطلاق ذاتِ باری کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ لفظ "الرحمن" بھی اگرچہ حقیقتاً وصف ہے، لیکن علم کے قائم مقام استعمال ہوا ہے، اس امر کی تائید باری تعالی کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

"قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ"

(بنی اسرائیل:۱۱۰)

ترجمہ: "آپ فرمادیجیے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکاروگے سو اس کے بہت اچھے نام ہیں۔"

اسی طرح بعض آیاتِ مبارکہ کے تناظر میں لفظ "الکتاب" پر بھی علمیت غالب ہوگئی ہے، چنانچہ فقہاء اور اصولیین کی اصطلاح میں قرآن کریم پر "الکتاب" کا اطلاق بطور علم ہوتا ہے۔

پھر لفظ "القرآن" کے مشتق ہونے یا نہ ہونے کے متعلق بھی علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ بیہقی، خطیب رحمہما اللہ اور ایک جماعت کی روایت کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مختار قول یہ ہے کہ لفظ "القرآن" علم شخصی غیر مشتق ہے اور اس کتاب کے ساتھ خاص ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

نازل ہوئی۔ نیز لفظ ''القرآن'' معرفہ غیر مہموز ہے (یعنی لام کلمہ حرفِ ہمزہ نہیں، بلکہ الف ہے) اور قراء سبعہ میں سے امام ابن کثیر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے یوں ہی پڑھا ہے، چنانچہ ان حضرات کے نزدیک لفظ ''القرآن''، ''القراءۃ'' سے ماخوذ نہیں ہے۔ امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کے نزدیک لفظ ''القرآن'' دراصل مشتق ہی تھا، لیکن بعد میں علمیت کا غلبہ ہوگیا۔

پھر ان حضرات کا آپس میں لفظِ ''القرآن'' کی اصل (یعنی مشتق منہ کی تعیین) میں اختلاف ہے:

① امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظِ ''القرآن''، ''قرنتُ الشيءَ بالشيءِ یعنی إذا ضممتَہ'' (یعنی ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا) سے ماخوذ ہے، اس میں حرفِ نون اصلی ہے، اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں، آیات اور حروف کا آپس میں ربط اور تعلق ہے، گویا ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اسی بنا پر اسے ''قرآن'' کہا جاتا ہے، لیکن اس قدر وجہ تسمیہ کافی نہ ہوگی (اس لیے کہ اس سبب میں کوئی اضافی اور خاص فضیلت ثابت نہیں ہورہی)۔ البتہ اگر یوں کہا جائے کہ قرآنی کلمات کا آپس میں ربط و تعلق ایسے بلیغ اسلوب اور عجیب ترتیب کے ساتھ ہے کہ گویا قرآن صرف وہی ہے اور بقیہ کلام گویا کہ اس معنی میں قرآن ہی نہیں ہے (تو اس نام کی مناسبت زیادہ واضح ہوگی)۔ ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی قول کی طرف تھا، چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

> ''فارسی میں قرآن کے معنی ''نشست'' کے ہیں، یعنی کلمات کا آپس میں عجیب (فصاحت وبلاغت کے ساتھ) تعلق وربط۔''

② مشہور لغوی امام فراء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظِ ''القرآن''، ''قرائن'' سے مشتق ہے، اس کی وجہ تسمیہ وہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ اس کی آیات آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں،

چنانچہ ان کے نزدیک لفظ ''القرآن'' کا نون حرفِ اصلی ہوگا اور یہ مشتق منہ غیر مہموز ہے، اور لفظِ ''القرآن'' کا وزن ''فُعْآلٌ'' ہوگا، نہ کہ ''فُعْلَانٌ''۔

③ امام زجاج نحوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ ''القرآن'' مہموز ہے، ہمزہ کو تخفیفاً ترک کر دیا گیا ہے اور ہمزہ کی حرکت ماقبل میں ساکن حرف را کو دے دی گئی ہے، ائمہ عربیت کی ایک جماعت نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، جن میں امام ابو عبیدہ معمر بن مثنی، امام لحیانی اور امام قطرب رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات سرفہرست ہیں۔ پھر ان علماء عربیت کے درمیان ایک اور اختلاف واقع ہوا:

۱۔ امام لحیانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظِ ''القرآن''، لفظ ''غفران'' کی طرح مصدر ہے اور ''القرآن'' کو ''شيء مقروء'' (پڑھی جانے والی چیز) کا نام دینا ''تسمیۃ المفعول بالمصدر'' (مفعول کو مصدر کا نام دینے) کی قبیل سے ہے، لہٰذا لفظِ ''القرآن''، ''القراءۃ'' سے مشتق ہے۔

۲۔ بعض حضرات کے نزدیک ''القرآن''، ''قرء'' سے ہے، جو جمع کرنے کے معنی میں ہے، چونکہ قرآن کریم نے سورتوں کو آپس میں جمع کر دیا ہے، اس لیے یہ قرآن کہلاتا ہے۔

۳۔ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے علماء انبیاء پر نازل شدہ کتب کے ثمرات وفوائد کو جمع کر دیا ہے، اس لیے یہ ''قرآن'' کہلاتا ہے۔

ان تمام اقوال کے پیشِ نظر راقم کہتا ہے: چونکہ قرآن کریم نے آخرت کے معاملات کے بارے میں امت کے ضرورت طلب امور کو جمع کر دیا ہے، اسی طرح دنیوی فلاح وسعادت مندی کے ساتھ ساتھ اخروی کامیابی اور نجات کے وسائل کو بھی جمع کیا ہے، اس لیے ''قرآن'' کہلاتا ہے (اس صورت میں لفظِ ''القرآن''، ''القرء'' سے مشتق ٹھہرایا جائے گا)۔ اور اگر لفظِ ''القرآن'' کو ''القراءۃ'' سے مشتق مانا جائے تو وجہ تسمیہ یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم دنیا میں ہر پل، ہر لمحہ، دن رات اور صبح شام برابر پڑھا جا رہا ہے۔ (یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ) قرآن کریم کی محض تلاوت بھی مطلوب ہے اور پڑھنے والے کے لیے اجر کا باعث ہے، اسی لیے ''قرآن'' کہلاتا ہے، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ گویا پڑھی جانے والی کتاب تو درحقیقت قرآن ہی ہے، اس کے علاوہ دیگر کتب اس

طرح نہیں پڑھی جاتیں۔ نیز اس لیے بھی کہ قرآن کریم کے حروف کی ترتیب میں تناسق، کلمات کی ترکیب میں انوکھا نظم وضبط اور اسلوب وآیات میں عجیب ترتیب ہے۔

بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ لفظِ ''القرآن'' درحقیقت ''القرء'' یا ''القراءۃ'' دونوں سے انہی عمدہ معانی کے لیے مشتق قرار دیا گیا، پھر اس کے وصفی معنی پر علمی معنی غالب ہوا تو یہ اللہ تعالیٰ کے کلامِ قدیم کے لیے علمِ شخصی بن گیا، جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا، جس کو حضرت جبرائیل علیہ السلام، حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے لے کر اترے، جو مصحف کے دوگتوں کے درمیان جمع کر دیا گیا، جس کی کسی بھی سمت سے باطل نہیں پھٹک سکتا اور جو حکمت ودانائی سے موصوف ومحمود ذات کی طرف سے اترا ہے (لہٰذا اس کے لیے لفظ ''القرآن'' علم شخصی اور ذاتی نام ہو چکا ہے)۔

رہا الف لام (تعریف) جو لفظِ ''القرآن'' کا جزء ہے تو یہ اس لفظِ ''القرآن'' کی اصل وضع کی رعایت رکھتے ہوئے داخل ہوا ہے؛ اس لیے کہ اس کی اصل وضع معنی وصفی کے لیے عام ہے۔(مذکورہ اقوال کا حاصل یہ ہوا کہ) لفظِ ''القرآن'' اسم علم، غیر مشتق وغیر مہموز اور معنوی اعتبار سے غیر معقول ہو، یا لفظِ ''القرء'' یا ''القراءۃ'' سے وصفِ مشتق، مہموز اور مذکورہ وجوہ کے اعتبار سے معنوی پہلو سے معقول ہو (ان دونوں آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے) ہماری پیش کردہ رائے درمیانی راہ ہے (جو تمام اقوال کی جامع اور موزوں ہے)۔

خلاصۂ بحث یہ ہوا کہ لفظِ ''القرآن'' (علی اختلاف الاقوال) ''القرن''، ''القرء'' یا ''القراءۃ'' سے مشتق وصف ہے، ان تمام صورتوں کی وجہ تسمیہ معقول اور واضح ہے، البتہ علمیت کے غلبے کی وجہ سے معنی وصفیت جاتا رہا، لیکن اس کے باوجود لفظِ ''القرآن'' اپنے اصلی وصفی معانی سے جو اس کے مناسب بھی ہیں، خالی نہ سمجھا جائے گا، اب اگرچہ معنی علمیت غالب ہے، لیکن اصل وجہ تسمیہ بیان کرتے وقت انہی وصفی معانی کو مراد لیا جائے گا، اسی علمیت کے غلبے کے نتیجے میں کبھی کبھی ان بلند پایہ معانی اور باعتبار اشتقاق کے حاصل شدہ مذکورہ بالا صفاتی معنی سے ذہول ہو جاتا ہے اور معنی علمیت، اول درجے میں سمجھا جانے لگتا ہے اور معانی وصفیہ، دوسرے درجے پر، فصیح وبلیغ اُدباء

کی تعبیرات میں ان عمدہ معانی کی رعایت ہوتی ہے اوران کا کلام عام لوگوں کے مقابلے میں انوکھا اورممتاز ہوتا ہے تو پھر قرآن کریم جو بلاغت میں اعجاز کی اعلیٰ انتہا پر ہے اور اہل حقیقت ومجاز اس کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر ہیں تواس کی تعبیرات میں ان معانی کی رعایت کیونکر نہ ہوگی؟!اس (علمی) معرکے میں یہی قولِ فصل کی حیثیت رکھتا ہے،اسے خوش دلی سے قبول کیجیےاورقدر دانی کا مظاہرہ کیجیے۔

قرآنی تعبیر میں ذرا غور کیا جائے تو خوش ذوقی کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کوان تمام صفات کے ساتھ متصف کیا جا سکتا ہے،جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں قرآن کے لیے ذکر فرمایا ہے،چنانچہ ''حکیم''، ''کریم''، ''عظیم''، ''مبین'' اور ''مجید'' وغیرہ تمام الفاظ قرآن کی صفت واقع ہوسکتے ہیں ، اور یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب، ''قرآن حکیم''، ''قرآن کریم''، ''قرآن مجید''، ''قرآن عظیم'' اور ''قرآن مبین'' ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں بیان فرمایا ہے،اوراسی طرح کئی سورتوں میں لفظِ ''الکتاب'' کوصفت ''المبین'' کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے،سورۂ حم سجدہ (فصلت) کی آیتِ مبارکہ ''وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ'' (فصلت:۴۱) میں لفظِ ''عزیز'' کو، اسی طرح سورۂ ص کی آیت ''كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ'' (ص:۲۹) میں ''مبارك'' کو قرآن کریم کی صفات میں سے شمار کیا گیا ہے،اس طرح قرآن کریم کے تمام اسماء اوراس کی تمام صفات میں قرآنی تعبیر کی نکتہ آفرینی مدنظر رکھی جاسکتی ہے اوران تمام اسماء وصفات کے امتیازات کی رعایت بھی رکھی جاسکتی ہے ، لیکن ہم ان لطیف مقامات سے تجاوز نہیں کریں گے، جن کی انتہا تک پہنچنا انسانی عقل کے بس میں نہیں:

رُتَبٌ تَقْصُرُ الْأَمَانِيْ حَسْرىٰ
دُوْنَهَا مَا وَرَاءَهُنَّ وَرَاءُ

ترجمہ: ''ایسے (بلندوبالا) مراتب ہیں کہ آرزوئیں ان تک رسائی سے حسرت زدہ ہیں اوران کے آگے جہاں اور بھی ہیں''۔

قرآن کریم کی حقیقت اور مسئلہ" کلامِ الٰہی"

(اس موضوع کے متعلق ذہنوں میں یہ سوال آسکتا ہے کہ) امت مسلمہ کے محققین کو ان دقیق مباحث کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟

درحقیقت عباسی خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں معتزلہ کو کافی شان وشوکت حاصل ہوئی، احمد بن ابوداود معتزلی (جو فرقہ اعتزال کے رئیس واصل بن عطا کے شاگرد ہیاج بن علاء سلمی اور قاضی یحییٰ بن اکثم کے ہم نشین اور ہم نوا تھے) خلیفہ مامون رشید کے مقرب اور معزز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور خلیفہ مامون بھی احمد بن ابوداود سے متأثر تھے اور ان ہی کی وجہ سے "مسئلہ خلق قرآن" میں بھی معتزلہ کے عقیدے کی طرف میلان رکھتے تھے۔ احمد بن ابوداود نے قربت کو غنیمت جانتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور خلیفہ مامون کو اس بات پر آمادہ کیا کہ مسئلہ خلق قرآن میں محدثین کرام کو آزمائیں اور جو معتزلہ کے موقف کی مخالفت کرے اس کو سزا دی جائے ، چونکہ معتزلہ اور محدثین کے درمیان فکری اور بنیادی اصولوں پر اختلافات تھے ،اسی بنا پر ان کی آپس کی شورش اور دشمنی بھی مشہور تھی اور یہ دونوں جماعتیں دو الگ الگ راہوں پر گامزن تھیں ،اسی سلسلہ کی ایک کڑی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی آزمائش اور ان کا امتحان بھی ہے ،حتی کہ کتب تاریخ میں اس تاریخی واقعہ کا عنوان ہی "مِحْنَۃُ أَحْمَدَ" (امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی آزمائش) قرار پایا ،جس میں اسلامی تاریخ کی ان جلیل القدر بزرگ ہستیوں کے ساتھ ظلم وستم اور عداوت کا کھلا مظاہرہ کیا گیا تھا۔

یہ فتنہ اس قدر مشہور ہوا کہ عہدِ صدیقی کے واقعہ ارتداد اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے

واقعۂ شہادت جیسے واقعات کے پہلو بہ پہلو اس کا شمار ہونے لگا، یہ واقعہ مامون رشید کے دور میں شروع ہوا اور معتصم کے بعد واثق کے عہد کے خاتمے تک تقریباً تیس مہینے جاری رہا، اور متوکل کے زمانۂ امارت میں اختتام پذیر ہوا، اس سارے عرصے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ قید وبند کی زندگی گزارتے رہے، شروع شروع میں امام صاحب کو کوڑوں سے ایسا سخت مارا گیا کہ کئی جگہوں سے گوشت پھٹ گیا اور جب ان زخموں کے بھرنے کی کوئی امید نہ رہی تو گوشت کے ان بے جان ٹکڑوں کو جسم سے علیحدہ کردیا گیا۔ مؤرخین نے اس دردناک واقعہ کو خوب تفصیل سے بیان کیا ہے، اس سلسلے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی "البدایۃ والنہایۃ" اور امام ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کی "الکامل" وغیرہ دیکھی جاسکتی ہیں، اس واقعے نے اہل حق کے دلوں میں معتزلہ کے خلاف عداوت کے بیج بودیئے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے برسرِ عام یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام اور غیر مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم سے صادر ہوا ہے، ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا کہ قرآن کے الفاظ مخلوق ہیں اور ہمارے افعال بھی مخلوق ہیں، جیسا کہ حافظ ابن کثیر کی "البدایۃ" میں مذکور ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی داود معتزلی کے ساتھ پہلے مناظرے میں قرآن پاک کی آیات سے استدلال کیا اور اس کے اعتراضات کے شافی جوابات دیئے، لیکن معتصم کے پاس مامون کی سی ذکاوت اور علم حاصل نہ تھا اور میرے خیال میں اگر مامون کو اجل کچھ اور مہلت دیتی، وہ مزید کچھ عرصہ زندہ رہتا اور اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل سننے کی توفیق ملتی تو عین ممکن تھا کہ وہ معتزلی عقائد سے رجوع کرلیتا، چونکہ معتصم ان دلائل سے بے خبر تھا، اس بنا پر ابن ابی داود نے اس کی جہالت اور علمِ کلام میں کم مائیگی کا فائدہ اٹھایا اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہنا شروع کردیا: "یہ گمراہ کرنے والا اور بدعتی ہے، لہٰذا اس کو قتل کردو اور اس کا خون میری گردن پر ہوگا۔" حقیقت یہ ہے کہ ابن ابی داود کے پاس اس فتوے کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا، چنانچہ علم کلام پر دسترس اور شیریں بیانی نے اس کے نفسِ امارہ کو یہ سجھایا کہ وہ امتِ مسلمہ کی ان نیک ہستیوں کے خلاف یہ چال چلے۔

چونکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، اہلِ حق کے عقیدہ کا بابانگِ دہل اعلان کرتے تھے، اس وجہ سے یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس بارے میں ''توریہ'' سے کام لیتے ہوئے کوئی یوں کہے کہ'' تلفظ بالقرآن مخلوق ہے''؛ اس لیے کہ اگرچہ یہ کلام فی نفسہ درست ہے، لیکن (اندیشہ تھا کہ) اہل باطل اس کو اپنے عقیدے کی طرف نہ کھینچ لیں؛ کیونکہ اس جملے میں بھی معتزلہ کے عقیدے کا ایک گونہ وہم پایا جاتا ہے۔ (اگرچہ اہلِ سنت والجماعت کے ہاں الفاظِ قرآنی مخلوق ہیں) اسی لیے امام موصوف، حسین ابن علی کرابیسی پر تلفظ بالقرآن کو مخلوق کہنے کی بنا پر تنقید کرتے تھے، اس بنا پر محدثین کرام کے دلوں میں علمِ کلام سے کچھ نفرت پیدا ہوگئی۔ جب ان واقعات کی شہرت ہوئی تو دو فرقے معرض وجود میں آئے: ایک لفظیہ اور دوسرا واقفیہ، اور جن جن لوگوں کو (تکلیفیں دی گئیں) اور آزمائش میں ڈالا گیا تھا ان میں صرف چار اشخاص ایسے تھے جو علی الاعلان اور برسرِ عام اہل سنت والجماعت کا عقیدہ واضح فرماتے تھے: ان کے سرخیل امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے علاوہ محمد بن نوح الجند نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ جن کا اسی راہ میں انتقال ہوگیا تھا، نعیم بن حماد خزاعی رحمۃ اللہ علیہ، جو جیل میں انتقال کر گئے تھے، اور ابویعقوب بویطی رحمۃ اللہ علیہ جن کا انتقال واثق کی جیل میں ہوا۔

ان تمام حضرات میں جتنی تکلیفیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو دی گئیں اتنی کسی کو نہیں دی گئیں، چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ہی اصل مرکز و مدار بن گئے، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اہل حق (کے عقائد) کا علم بلند فرمایا، اس کی وجہ سے ان کی خوب شہرت ہوئی، میناروں اور منبروں پر ان کا نام لیا جانے لگا اور یوں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ اور استاذ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مصر میں دیکھا ہوا وہ خواب پورا ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو اہلِ حق کے عقیدہ پر استقامت کی اور قیامت تک ان کا علم بلند رہنے کی خوشخبری سنائی تھی، اور اس خواب کی خبر دینے کے لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد رشید امام ربیع رحمۃ اللہ علیہ کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھیجا تھا، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ مؤرخین نے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

حاصلِ بحث یہ کہ انہی شورشوں کی بنا پر اہلِ حق محققین و متکلمین کو کتاب اللہ اور سنتِ نبوی سے مسئلہ کلام کی توضیح وتشریح کی ضرورت پیش آئی اور پھر ان حضرات نے عقلی، لغوی اور عرفی دلائل بھی قائم کیے، چنانچہ انہوں نے پوری بحث و تحقیق کے بعد کسی جھگڑا اور شورش برپا کرنے والے کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا، ان تمام محققین کرام میں سب سے زیادہ تفصیلی بحث و تحقیق کے ساتھ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کو واضح کرنے والے امام قاضی ابو بکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، انہوں نے اس بارے میں ایک کافی وشافی کتاب "الإنصاف" لکھی ہے، اللہ رب العزت ان کو اور دیگر تمام محققین کو ان کی مساعی جمیلہ پر اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین!

اہلِ سنت اور معتزلہ کے درمیان اختلاف کی بنیاد

اب ہم ذرا اس بحث کا خلاصہ بیان کرتے ہیں: دراصل اہلِ سنت اور معتزلہ کے آپس میں اختلاف کا مدار، اللہ تعالیٰ کے لیے کلامِ نفسی (ثابت کرنے) کے عقیدہ پر ہے، اہلِ سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ازلی ہے اور خدا تعالیٰ ازل سے متکلم ہیں اور کلام، اللہ تعالیٰ کی صفت ازلی ہے، جو لفظ کے ساتھ متصف نہیں ہے، حرف وصوت سے خالی ہے اور جس طرح دیگر صفات: علم، ارادہ، سمع وبصر وغیرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں، اسی طرح یہ کلامِ نفسی بھی قائم ہے۔ جبکہ معتزلہ نے کلامِ نفسی کے وجود کا ہی انکار کر کے کلام کو صرف کلامِ لفظی میں منحصر کر دیا ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کلامِ لفظی کی نفی دونوں مذاہب کا متفقہ نکتہ ہے، اس کے برخلاف کرامیہ، حشویہ اور سالمیہ کا مؤقف ہے کہ حروف واصوات سے مرکب کلام، اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور یہ کلام حادث ہونے کے باوجود اللہ رب العزت کے ساتھ قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ایسے عقیدے سے بہت ہی بلند ہے۔

علامہ عبدالعزیز بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "شرح أصول البزدوي" میں اور علامہ بیاضی رحمۃ اللہ علیہ نے "إشارات المرام" میں جو نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے ایک طویل

مناظرے کے بعد اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل کافر ہے، اس (فتوے) کا مصداق ومراد بھی یہی شنیع مذہب تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ قرآن لفظ وصوت پر مشتمل ہے اس بنا پر مخلوق ہے اور یہی کلام اللہ رب العزت کے ساتھ قائم ہے، اس (فتوے) کا مصداق معتزلہ کا مذہب نہیں؛ کیونکہ معتزلہ نے تو اہلِ سنت والجماعت کی طرح اللہ رب العزت کو لفظِ قدیم، حرفِ قدیم اور صوتِ قدیم سے منزہ قرار دیا ہے۔ "إشارات المرام" میں علامہ بیاضی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے یہی تفصیل واضح ہوتی ہے، بہر کیف فریقین کے درمیان محلِ نزاع کی یہی تنقیح وتوضیح ہے۔

اہلِ سنت والجماعت کے عقیدے کی وضاحت

اہل سنت والجماعت کے عقیدے کی توضیح وتشریح یہ ہے کہ انسان کے کلامِ لفظی کے دو معنی ہیں:

① کلام سے مراد مصدری معنی ہو، یعنی کسی چیز کا تکلم وتلفظ کرنا۔

② حاصل بالمصدر، یعنی وہ الفاظ جن سے گفتگو عمل میں آتی ہے۔

اسی طرح کلامِ نفسی کے بھی دو معنی ہیں، جس طرح کلامِ لفظی پہلے معنی میں صوت ومخارج کے واسطے سے انسان کی زبان کا فعل ہے، اسی طرح کلامِ نفسی، انسان کے قلب وضمیر کا فعل ہے جس کا اثر انسان کے ظاہری جوارح یعنی زبان، کوے، حلق یا نرخرے کسی پر ظاہر نہیں ہوتا، یونہی جس طرح دوسرے معنی کے اعتبار سے کلامِ لفظی وہ الفاظ ہیں جن کے انسان سے صادر ہونے پر گفتگو عمل میں آتی ہے اور وہ انسان کی گفتگو کا ثمرہ ہے، اسی طرح کلامِ نفسی وہ ہے جو ذہن میں تصور وتفکر اور اس کی تصویر وتشکیل اور تخیّل کے بعد قلب وضمیر میں حاصل ہو۔ علماءِ کلام نے اسی کلامِ نفسی کو ان دونوں معنی کے ساتھ عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے، جس کی تشریح وتفصیل علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح المقاصد" و "شرح العقائد النسفية" اور "العضدية" کی شروح وحواشی میں دیکھی جاسکتی ہے، نیز علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر "روح المعاني" کے مقدمہ میں جس وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کے متعلق کلام فرمایا ہے وہ بھی (بصیرت کے لیے) کافی ہے۔

بہر کیف اللہ رب العزت کلامِ لفظی کے تو دونوں معنوں سے منزہ اور مبرّ ی ہیں اور کلامِ نفسی اپنے دونوں معنوں میں اللہ رب العزت کے لیے ثابت ہے، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق کلامِ نفسی اپنے پہلے معنی کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کی ایسی ازلی صفت ہے جو ہر باطنی آفت کے منافی ہے، یہ باطنی آفت، کلامِ لفظی بشری میں گونگے پن کی مانند ہے اور حروف اور الفاظ کی قبیل سے نہیں ہے۔ اور یہ صفتِ ازلی ذات کے اعتبار سے تو ایک ہی شئ ہے، لیکن متکلم بہ کے تعدّد کے اعتبار سے اس صفت کے متعلقات بھی متعدد ہو گئے ہیں، باقی رہا باری تعالیٰ کا کلامِ نفسی تو اپنے تو وہ غیبی کلمات اور ازلی حکمی الفاظ ہیں، جو مرتب ہیں اور وضع غیبی کے اعتبار سے یکے بعد دیگرے نہیں ہیں؛ اس لیے کہ تعاقب (یکے بعد دیگرے ہونا) زمانہ کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات تو زمانہ اور جو کچھ زمانہ میں ہے سب سے بلند و بالا ہے، اب کوئی شئ مرتب بھی ہو اور اس میں تعاقب (یکے بعد دیگرے ہونا) نہ پایا جائے (تو اس میں کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ) دنیا میں بھی اس کی کئی مثالیں موجود ہیں، مثلاً آپ انگوٹھی سے مہر لگاتے ہیں (تو یہ مہر اور ختم مرتب ہی ہیں، لیکن ان میں تعاقب نہیں، بلکہ بیک وقت ایک ہی زمانے میں ان دونوں کا وجود ہوتا ہے)۔ اسی طرح ہمارے زمانے میں طباعت کی تختیاں اور دیکھنے والے کے سامنے نظر آنے والی صورتیں، پانی میں پائے جانے والے سائے، اسی طرح اور بھی کئی مثالیں ہیں، جن میں ترتب بلا تعاقب پایا جاتا ہے، چنانچہ جب اس دنیا میں ترتب، تعاقب کو لازم نہیں تو پھر صفاتِ الٰہیہ میں کیونکر لازم ہو سکتا ہے؟!!

مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ دوسرے معنی کے اعتبار سے کلامِ نفسی کسی دقت رسی کے بغیر باری تعالیٰ کے لیے ثابت ہے، البتہ پہلے معنی کے اعتبار سے کچھ دقت باقی تھی، جو الحمد للہ اب باریک بینی سے واضح ہو گئی، لیکن بہر حال میری رائے کے مطابق یہاں پہلے معنی پر مدار نہیں، چنانچہ اب واضح ہو گیا کہ قرآن کی تعریف یوں کی جانی چاہیے:

”قرآن کریم باری تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے، مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور سینوں میں محفوظ ہے، زبان سے پڑھا اور کانوں سے سنا جاتا ہے، لیکن یہ ان میں سے کسی چیز پر میں حلول کیا ہوا نہیں ہے، اور وہ ان تمام مراتب و مراحل میں قرآن ہے، جو حقیقتِ شرعیہ ہے اور بدیہی و یقینی طور پر دین کی اساس ہے۔“

چنانچہ یہ تمام صفات اگرچہ حادث ہیں، لیکن صفتِ کلامیہ ان میں جھلکتی ہے اور ان مراتب میں ظاہر ہوتی ہے، اور باری تعالیٰ ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے، یہ تمام صفات اسی صفت کلام کے مظاہر ہیں، وہ صفت ان مظاہر میں حلول کرنے والی نہیں ہے؛ اس لیے کہ وہ صفت ذاتِ باری تعالیٰ سے نہ الگ ہوئی ہے اور نہ کبھی جدا ہو سکتی ہے۔ جیسے آئینہ میں کوئی صورت جھلکتی ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھنے والے کی صورت ہے، حالانکہ یہ صورت اس آئینہ میں حلول نہیں کرتی؛ اس لیے کہ یہ صورت کوئی مادی شئے نہیں، بلکہ محض کمیت ہے۔

کلام میں وجود کے چار مراتب

ان تمام امور کو مزید سمجھنے کے لیے وجود کے چار مراتب ذکر کیے جاتے ہیں، جو علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء نے بیان کیے ہیں، وجود کے چار مراتب ہیں (یعنی ہر چیز کے چار وجود ہوا کرتے ہیں):

① وجود خارجی ② وجود ذہنی

③ وجود لفظی ④ وجود کتابی

ان میں سے وجود خارجی ہی وجود حقیقی ہے اور تحقیقی قول کے مطابق بقیہ تینوں وجود مجازی ہیں، جس طرح کتابت، عبارت پر اور عبارت، ذہنی وجود پر دلالت کرتی ہے، اسی طرح وجود ذہنی، وجود خارجی پر دلالت کرتا ہے، ان تمام صفات کا قرآن کی تعریف میں اتحاد، مفہوم کے اعتبار سے نہیں

ہے، بلکہ محض مصداق کے اعتبار سے ہے اور یہ تمام مراتب، باری تعالیٰ کے ساتھ قائم حقیقی صفت کلامیہ کی مختلف صورتیں، مشاہد اور تعبیرات ہیں اور صفت کلامیہ بہر حال ازلی، قدیم اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے، جو کبھی الگ نہ ہوگی، اب یہاں قراءت اور مقروء، تعبیر اور معبر عنہ، تلاوت اور متلو پائے جا رہے ہیں، ان میں سے قراءت، تلاوت اور تعبیر تو ہمارے افعال اور مخلوق ہیں، جبکہ متلو (جو تلاوت کیا جا رہا ہے) معبر عنہ (جس کی تعبیر کی جا رہی ہے) اور مقروء (جو کچھ پڑھا جا رہا ہے) وہ کلام ہے، جو قدیم وازلی صفت ہے اور باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، پھر جب ہم مصحف کے متعلق مکتوب (کاغذ پر) مقروء (زبان سے) اور مسموع (کانوں سے) ہونے کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ وہ ''قرآن'' ہے، تو اسی پہلو سے کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بعینہ وہ نقوش، بعینہ وہی صفحات اور اوراق یا وہ الفاظ جو ہماری ذات کے ساتھ قائم ہیں، وہ سبھی قدیم ہیں؛ اس لیے کہ یہ نقوش تو اس کلام ازلی قدیم کی صرف تعبیرات ہی ہیں، جیسے شاعر کہتا ہے:

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَ حُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ إِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

ترجمہ: ''ہماری عبارتیں تو تیری مدح میں جدا جدا ہیں، لیکن تیرا حسن ایک ہی ہے
اور یہ تمام تعبیرات اسی جمال کی جانب مشیر ہیں۔''

میرے خیال میں اس مقام پر اس قدر بیان کافی ہوگا، اور یہ فرق در حقیقت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہی سے منقول ہے، جس کی تفصیل بعد میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''خلقِ افعالِ عباد'' کی بحث سے متعلق اپنے مستقل رسالہ میں بیان فرمائی ہے، اسی طرح امام موصوف نے اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' کی ''كتاب التوحيد والردّ على الجهميّة'' میں بھی اس بحث کی تفصیل بیان فرمائی ہے، پھر امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الإنصاف'' میں اس مسئلہ کے متعلق خوب تحقیقی اور کافی وشافی

بحث کی ہے، جس کے بعد مزید کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ والحمد للہ أولاً وآخراً!

شیخ مہائمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تبصیر الرحمٰن في تفسیر القرآن" کے مقدمے میں ذکر کیا ہے کہ:

"لفظِ قرآن کا اطلاق، لوح محفوظ میں (ثبت کلام)، سینوں میں محفوظ اور مصاحف میں لکھے گئے اور زبان سے پڑھے جانے والے کلام ہر ایک پر مشترکہ طور پر کیا جاسکتا ہے۔"

میرے نزدیک یہ بات تحقیق کے خلاف ہے، تحقیقی اعتبار سے بہتر یہی ہے کہ یوں کہا جائے کہ لفظِ قرآن ان تمام (صفات) پر حقیقتِ شرعیہ کے اعتبار سے بولا جاتا ہے، اگرچہ لغوی اعتبار سے بعض صفات پر لفظِ قرآن کا اطلاق مجازی ہے، تاہم مہائمی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کی یوں توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اشتراک سے معنوی اشتراک مراد ہے، نہ کہ لفظی اشتراک، واللہ اعلم۔

بعد ازاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی طرح صرف "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" کہنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مزید ایک جملہ بڑھا کر اس پر مصر رہے اور یوں فرمایا: "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق، ولفظي بالقرآن مخلوق." اسی طرح یہ بھی فرمایا: "وأفعالنا مخلوقة وألفاظنا من أفعالنا" یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے، جبکہ میرے ادا کیے گئے قرآن کے الفاظ مخلوق ہیں اور ہمارے افعال مخلوق ہیں اور چونکہ الفاظ ہمارے ہی افعال میں سے ہیں، اس لیے وہ بھی مخلوق ہیں۔"

اسی اختلاف کی بنا پر (یعنی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے دعوی پر مزید اضافہ کی بنا پر) امام موصوف کا اپنے شیخ ذہلی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف ہوا اور ان کے درمیان برابر چپقلش جاری رہی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس اضافہ کی وجہ یہ تھی کہ فرقہ حشویہ، کرامیہ اور سالمیہ الفاظ یعنی حروف وصوت تک کے قدیم ہونے

کے قائل تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ ان فرق باطلہ کو ان کے کلام میں اپنے دعوی پر کوئی تائیدی دلیل نہ مل جائے، چنانچہ جس طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اہل سنت کے مسلک کا دفاع اور فرقہ معتزلہ پر رد تھا، اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مدنظر اس فرقہ حشویہ پر رد تھا، جنہوں نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو ان کے درست مقصد کے خلاف پر محمول کیا اور ان کے کلام میں ایسی مبالغہ آمیزی کی جو امام موصوف کی مراد نہ تھی۔

بہر حال امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا مشن اپنے دور کی فضا کے مناسب اور مصلحت وحکمت کے مطابق اہل حق کے مسلک کا دفاع اور اہلِ بدعت پر رد تھا اور چونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ امام ذہلی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا سا مذاق رکھتے تھے، اس وجہ سے چاہتے تھے کہ جس قدر تعبیر پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اکتفا فرمایا ہے، بس اسی پر اکتفا کیا جائے، یا ممکن ہے کہ امام ذہلی رحمۃ اللہ علیہ کی ناراضگی علاقائی مصلحت کی بنا پر ہو، اس لیے کہ موصوف امام ابوعبد اللہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بنسبت اپنے شہر کے حالات سے زیادہ واقف تھے، واللہ اعلم۔

امام احمد اور امام بخاری رحمہما اللہ کا اختلاف بالکل ایسا ہی تھا، جیسے ''مسئلہ ایمان'' کے متعلق امام ابوحنیفہ اور محدثین کرام رحمہم اللہ کے درمیان اختلاف تھا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر خوارج اور معتزلہ پر تھی، جبکہ محدثین کرام کی نظر مرجئہ پر، اور حالات وکیفیات کے اختلاف کی وجہ سے نقطہائے نظر اور آرا کا اختلاف ہوتا رہتا ہے۔



قرآن کریم، باری تعالیٰ کے لامتناہی علوم کا خزانہ اور علمائے امت کی قرآن کے متعلق کاوشیں

① باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

”أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ“ (نساء:۱۶۶)

ترجمہ: ”اور بھیجا بھی اپنے علمی کمال کے ساتھ“۔

② ”فَاعْلَمُوْا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ“ (ھود:۱۴)

ترجمہ: ”تو تم (ان سے کہہ دو کہ اب تو) یقین کر لو کہ یہ قرآن مجید اللہ ہی علم (اور قدرت) سے اترا ہے۔“

③ اور اسی طرح ارشاد گرامی ہے:

”قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔“ (کہف:۱۰۹)

ترجمہ: ”آپ (ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر (کا پانی) روشنائی (کی جگہ) ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاوے (اور باتیں احاطہ میں نہ آویں)، اگرچہ اس سمندر کی مثل دوسرا سمندر (اس کی) مدد کے لیے ہم لے آویں۔“

④ ایک اور جگہ فرمایا:

”وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللهِ“ (لقمان:۲۷)

ترجمہ: ”اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں، اگر وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے، اس کے علاوہ سات سمندر اور ہو جاویں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔“

مذکورہ چار مقامات میں باری جل شانہ نے قرآنی علوم کی شان یوں فرمائی ہے کہ یہ قرآن ایسے علم الٰہی کا منبع ہے جس کا فیض کبھی بھی ختم نہ ہوگا اور اس لامتناہی علم الٰہی کی مثال باری تعالیٰ یوں بیان فرماتے ہیں کہ اس چار اطراف پھیلی زمین کے تمام درختوں سے قلم تیار کیے جائیں اور کرۂ ارض کے تمام سمندروں کو سیاہی میں بدل دیا جائے، اب اس وسعت کے بارے میں ذرا سوچیے اور تصور کیجیے کہ صرف ایک درخت سے ہی کتنے قلم بنائے جاسکتے ہیں؟! اور پھر اس بے پایاں سیاہی کو سوچیے جو سمندروں سے بنائی گئی ہو اور اس کی بوندوں کی مقدار کا اندازہ لگایئے اور غور کیجیے کہ ہر ہر بوند سے کیا کچھ لکھا جائے گا؟! صرف ایک بحرِ الکاہل کی مسافت جغرافیائی سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق ساٹھ ملین مربع میل ہے، اب دوبارہ ذرا اس پر غور کیجیے کہ یہ اتنے ڈھیر سارے قلم اور یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی بصورتِ سیاہی! لیکن باری تعالیٰ کے اس عظیم علم کے مکمل احاطہ سے قبل ہی ساری سیاہی ختم ہو جائے گی اور تمام قلم خشک ہو جائیں گے، خدا کی شان دیکھیے! قرآن کے متعلق یہ عظیم قرآنی مثال کتنی تعجب خیز اور بلیغ ہے! اور واقعی یہ صرف اسی علیم وخبیر کا کلام ہے، کسی شاعر کی سخن گوئی نہیں، جیسے قرآن میں فرمان عالی شان ہے:

”وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ.“

(یٰسین:۶۹)

ترجمہ: ”اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے لیے شایاں ہی نہیں، وہ تو محض نصیحت (کا مضمون) اور ایک آسمانی کتاب ہے، جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے۔“

جب اللہ جل شانہ کا علم ایسا بلند اور جلیل القدر ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ہی قرآن کو اپنے اسی علم سے اتارا اور (یہ بات تو مسلم ہی ہے کہ) متکلم جب بھی کلام کرتا ہے تو اپنے علم اور مرتبے کا پاس رکھتے ہوئے کرتا ہے، اس سے واضح ہوا کہ قرآن جن حقائق اور اشاراتِ ربانیہ کا مجموعہ ہے، اس کے علوم کا احاطہ اس کے اتارنے والے کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا، اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے جو اپنی کتابِ عزیز کے امتیازات اور قرآن عظیم کے علوم کا علم رکھتا ہے اور سچ ہی کہا جس نے بھی کہا:

جَمِيْعُ الْعِلْمِ فِيْ الْقُرْآنِ لٰكِنْ
تَقَاصَرَ عَنْهُ أَفْهَامُ الرِّجَالِ

ترجمہ: ''قرآن کریم میں ہر علم ہے، لیکن لوگوں کی عقل وفہم ان کے ادراک سے قاصر ہے۔''

قرآن کریم کے متعلق قرآنی تعبیرات کے بعد اب وہ تعبیرات ملاحظہ ہوں، جو کائنات انسانی میں سب سے بڑھ کر کمال علم رکھنے والے انبیاء کے سردار، رسول عربی ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حکیمانہ احادیث اور اپنے مبارک اقوال میں ارشاد فرمائیں: ''جامع ترمذی'' میں حارث اعور، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث میں نقل کرتے ہیں، جس کے الفاظ یوں ہیں:

''ولا یشبع منه العلماء، ولا یخلق علی کثرة الرد، ولاتنقضي عجائبه.''

ترجمہ: ''علماء، علوم قرآنی سے کبھی سیر نہ ہوں گے اور نہ بار بار پڑھنے سے قرآن پرانا ہوگا (یعنی کثرتِ تلاوت کے باوجود اس کی تر وتازگی اور پڑھنے کی لذت میں کمی نہیں آئے گی، ہر مرتبہ نیا کلام معلوم ہوگا) اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔''

اور ایک روایت میں ''ولا یملّ قاریه'' (یعنی اس کا پڑھنے والا کبھی نہ اکتائے گا) بھی ہے، یہ حدیث امام ابن ابی شیبہ' اسحاق' دارمی اور بزار رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے بھی نقل کی ہے، جیسا کہ علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ

نے "تخریج أحادیث الکشاف" میں ذکر فرمایا ہے، جو تفسیر کشاف کے ذیل میں "تلخیص الحافظ ابن حجر" کے مطبوعہ نسخے میں درج ہے۔(تفسیر کشاف:۱/ ۳۹۴) نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن ابی حاتم نے نقل کی ہے، جسے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الإتقان" میں ذکر کیا ہے:

"القرآن ذو شجون وظهور وبطون، لاتنقضي عجائبه، ولاتبلغ غايته."

ترجمہ: "قرآن کریم تہہ در تہہ تفصیلات کا حامل اور ظاہری معانی وباطنی حقائق پر مشتمل ہے، اس کے عجائبات ختم نہ ہوں گے اور نہ اس کے مضامین کی انتہا تک پہنچا جا سکے گا۔"

ان کلمات نبویہ (لاتنقضي عجائبه ولاتبلغ غايته) پر ذرا غور کیجیے کہ ان میں علوم قرآنی کی کتنی کشادگی اور گہرائی بیان کی گئی ہے؟! قرآن کے متعلق اس قسم کی احادیث میں حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ بہت نمایاں رہے ہیں، انہی کے بارے میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "أنا مدينة العلم، وعلي بابها" (میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ہے، جو صاحبِ فضل و دانش اور علوم قرآنی کے بحرِ بیکراں ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ دعا دی ہے:

"اللّٰهُمَّ فقّهه في الدين وعلّمه التأويل."

ترجمہ: "اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ اور قرآنی تاویلات و تشریحات کا علم سکھلا دیجیے۔"

پہلی حدیث کے لیے شاہد و مؤیّد، قادسیہ کے مفتی اعظم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث بھی ہے، جس کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستدرک میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا

کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”إن هذا القرآن مأدبة الله، فأقبلوا من مأدبته ما استطعتم، إن هذا القرآن حبل الله والنور المبين، والشفاء النافع، عصمة لمن تمسّك به، ونجاة لمن تبعه، لا يزيغ فيستعتب، ولا يعوج فيقوم، ولا تنقضي عجائبه، ولا يخلق من كثرة الرد، اتلوه؛ فإن الله يأجركم على تلاوته، كلُّ حرف عشر حسنات، أما إنّي لا أقول: ”الم“ حرف، ولكن ألف ولام وميم.“

ترجمہ: ”بلاشبہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا خوان ہے، جتنی استطاعت ہو اللہ کی اس دعوت کو قبول کرو؛ بلاشبہ یہ قرآن خدا کی رسی اور واضح نور ہے، نفع مند وشافی ہے، جو اس کو پکڑے رہے اس کے لیے حفاظت ہے اور جو اس کی اتباع کرے اس کے لیے ذریعۂ نجات ہے، اس میں کوئی کجی یا ٹیڑھ پن نہیں کہ جس کو سیدھا کیا جائے، اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور بکثرت اور بار بار پڑھنے سے پرانا نہ ہوگا اور اس کی تلاوت کیا کرو؛ کیونکہ خدا تعالی اس کی تلاوت پر تم کو اجر دیں گے، ہر حرف پر دس نیکیاں ملیں گی، میں یہ نہیں کہتا کہ ”الم“ ایک حرف ہے، بلکہ الف، لام، میم (یہ تین حروف ہوئے)۔“

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حلال وحرام سے متعلق سب سے زیادہ احادیث کے جاننے والے تھے، طبرانی میں ان سے مروی ہے، اور اس حدیث کو علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے ”تخریج أحادیث الکشاف“ میں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”صحیح بخاری“ میں نقل کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات ہوئی تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہما السلام سے فرمایا: ”تمہارے اور میرے علم نے خدا کے علم میں کمی نہیں کی، سوائے اس چڑیا کی چونچ میں بھرے پانی کے

جو اس نے سمندر سے کم کیا ہے۔‘‘ علماء کرام اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ایک مثال ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے لامتناہی علم کے سامنے متناہی یعنی سمندر (کے برابر علم) کی بھی کیا حیثیت؟!!

حضرت سہل بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ’’اگر کسی شخص کو قرآن کے ہر ہر حرف کے ہزار مفہوم ومعانی بھی معلوم ہوجائیں، تب بھی باری تعالیٰ کے قرآن کریم کی ایک آیت میں ودیعت کردہ اسرار کی انتہا کو نہیں پہنچا جاسکتا؛ اس لیے کہ یہ اللہ جل شانہ کا کلام ہے، جو اس کی صفت ہے، تو جس طرح اللہ رب العزت کی انتہا نہیں، اسی طرح اس کے کلام کے مفاہیم کی بھی کوئی انتہا نہیں اور ہر شخص اس کو اتنا ہی سمجھ سکتا ہے جس قدر اللہ اس پر اس کے اسرار ورموز عیاں کرے، اور جبکہ خدا کا کلام مخلوق بھی نہیں ہے تو اس کے لامتناہی مفہوم پر حادث اور مخلوق عقلیں کیونکر پہنچ سکتی ہیں؟!‘‘۔

(البرھان زرکشی)

اس کے بعد اب قرآنی علوم کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول اقوال میں سے شہرِ علم کے دروازے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں: ’’صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا جاسکتا ہے جو ستر اونٹ کا بوجھ ہو۔‘‘ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو بروایت محدث عارف ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ نقل فرمایا ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ’’إحیاء علوم الدین‘‘ میں ذکر کیا ہے، نیز علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس کی قابل فہم شرح بھی فرمائی ہے اور راقم کے نزدیک یہ حدیث تو بالکل بدیہی طور پر واضح ہے، اس میں چنداں تحقیق ودقت رسی کی ضرورت نہیں: اس لیے کہ سورۂ فاتحہ تو ’’امّ القرآن‘‘ ہے اور جن امور کو قرآن بیان کرتا ہے، ان سب کا اجمالی بیان سورۂ فاتحہ میں موجود ہے، جیسے کہ ایک بڑے درخت کے تمام اجزاء بیج کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ فاتحہ کی ابتدا میں ذات، صفات واسماء باری تعالیٰ اور تمام عوالم کے متعلق کلام کیا گیا، پھر ہر ہر عالَم سے باری تعالیٰ کی ربوبیت کا رشتہ اور ان میں بکھرے عجائب وغرائب کا بیان ہوا، کیا تمام عوالم کے اعداد وشمار اور ان میں موجود عجائبات کی تعداد جاننا، بلکہ ایک ہی عالَم کے متعلق تمام معلومات کا

احاطہ ممکن ہے؟! اگر دیکھا جائے تو صرف حیوانات ہی کی ہر صنف کے متعلق معلومات کے احاطے کے لیے کئی دفاتر پر مشتمل دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) درکار ہوگا۔

اس کے بعد روزِ قیامت، اس کے عجیب وغریب حالات، اس کی ہولناکیوں اور ہیبت انگیز احوال کا بیان ہے، جن کی طرف باری تعالیٰ کے فرمان ﴿مالك يوم الدين﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بعد ازاں شرعی احکامات' عبادات اور جن چیزوں کا انسان اپنی زندگی میں محتاج ہوتا ہے، ان کا بیان ہوا۔ نیز انبیاء ومقربین اور شہداء وصالحین کا تذکرہ ہوا اور گمراہ قوموں اور باطل فرقوں کے متعلق بتایا گیا۔ اگر باری تعالیٰ کسی ایک جزء ہی کے متعلق علوم وحقائق ربانیہ کسی انسان کے لیے کھول دیں، تب بھی اس کی ساری زندگی ان ابحاث کے احاطے سے پہلے تمام ہو جائے گی۔ ربوبیت باری تعالیٰ کی بعض نازک اور اہم بحثوں، نیز دورِ حاضر کے سائنس دانوں کی پیش کردہ ریسرچ کے مطابق ملکیت باری تعالیٰ کی وسعت کے متعلق میں نے دوران درس بھی کچھ وضاحت کی تھی۔ مزید تفصیلات کے لیے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الإتقان" کی پینسٹھویں نوع ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو قرآن سے مستنبط علوم کی بحث سے متعلق ہے۔

پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کے بعد سرداران امت کبار تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال دیکھیے (جو قرآن کی شان کے متعلق انہوں نے ارشاد فرمائے ہیں) اور ساتھ ہی علمائے امت کی بڑی بڑی تالیفات وتصنیفات دیکھیے، جن میں ان حضرات نے قرآنی اسرار ورموز کو واضح کیا، جن میں سے کچھ میں بھی آئندہ (صفحات میں) ذکر کروں گا (ان شاء اللہ) اور اس موضوع پر علامہ زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مجموعۂ مضامین "مقالات الکوثری" (صفحہ: ۴۰۳) میں جو مباحث ذکر کیے ہیں (وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں)۔ چونکہ اس رسالہ (يتيمة البيان) کی تالیف کے وقت میں علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ سے متعارف نہ تھا اور نہ ہی ان کے مضامین منصۂ شہود پر آئے تھے ، اس بنا پر میں ان کی باتیں اس رسالہ میں ذکر نہیں کر سکا، ان تمام ابحاث کو میں نے بوقت درس تفصیل سے بیان کر دیا تھا اور علوم قرآنی کی وسعت پر دلائل وامثال سے میں ان محاضرات میں

بحث کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ ہی ہر خیر و بھلائی کی توفیق دینے والے ہیں تو تمام تعریفیں اسی جہانوں کے پروردگار اللہ کے لیے ہیں۔ اس بارے میں مزید تفصیلات کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”إحیاء علوم الدین“ کے چوتھے باب۔ جو قرآن دانی کے بیان میں ہے۔ کا پہلا حصہ دیکھا جاسکتا ہے۔ (۱/۲۶۰۔۲۶۱) اسی طرح علامہ زبیدی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کردہ ”إحیاء“ کی شرح ”الإتحاف“ بھی اس کے لیے مفید ہوگی۔ باری تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

”لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔“ (النساء: ۸۳)

ترجمہ: ”تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو اُن میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے۔“

میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ قرآنی علوم لامتناہی ہیں، چنانچہ قرآن میں ظاہری علوم کے متعلق صرف اصول وکلیات اور باطنی علوم کے متعلق لطیف اشارات ونکات ذکر کیے گئے ہیں، جو پوشیدہ ومخفی اور گرانقدر معارف وحقائق پر دلالت کرتے ہیں۔

علوم القرآن کا مصداق

خلاصۂ بحث یہ ہوا کہ ”علوم القرآن“ وہ علوم کہلاتے ہیں جن کا تعلق قرآن کریم کے ان مقاصد سے ہو، جو قرآن کے ظاہری مطالب اور اس میں پنہاں حقائق سے وابستہ ہوں اور ان مقاصد ومضامین کا تعلق بندوں کی رہنمائی سے ہو، نیز ان کے مبدأ ومعاد کے متعلق تنبیہ ہو اور جن پر دونوں جہاں کی حقیقی سعادت کا مدار ہو، یا پھر وہ پسندیدہ علوم جو قرآن کریم کے خفیہ محاسن کی نقاب کشائی کرنے والے ہوں۔

صاحب ”مناهل العرفان“ نے علی بن ابراہیم حوفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۳۰ھ) سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک علوم القرآن سے متعلق جتنی تالیفات کی بابت انہیں معلوم ہوسکا ہے، ذکر فرمادی ہیں، انہوں نے عمدہ احاطہ کیا ہے، (مزید تفصیل کے لیے) اس کتاب کی جانب رجوع کیا جائے۔

قرآنی علوم کے متعلق علمائے امت کے قابلِ تحسین کارنامے

قرآن کریم اللہ کی وہ کتاب ہے جس کے متعلق خود باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَإِنَّهُ لَكِتَـٰبٌ عَزِيزٌ لَّا يَأْتِيهِ الْبَـٰطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ.'' (حم سجدہ:۴۱، ۴۲)

ترجمہ: ''اور یہ (قرآن) بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے، یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

اور واقعی یہ ایسی کتاب ہے جس نے انسانی عقلوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے اور بڑے بڑے حکماء، فصحاء، عارفوں اور دانشوروں کو سحر زدہ کر دیا ہے، اس کے بے مثال نظم میں موجود عجیب ترتیب اور اس کے عاجز کر دینے والے بیان کے آگے بڑے بڑے فصحاء کی جبینِ نیاز خم ہے، بلکہ اس قرآن نے تو اپنے حیران کن حسن و جمال اور نمایاں آب و تاب سے گویا عقلوں کو مسخر کر لیا اور اس کی گراں مایہ حکمتوں اور دقیق اسرار کے سامنے بڑے بڑے حکماء چہروں کے بل گر گئے کہ ان حکمتوں تک کی ان کی عقل و فہم رسائی حاصل نہ کر سکی، بلکہ ان حکمتوں کی بلندیوں تک پہنچنے سے ان کے افکار اور ان کی عقل و خرد عاجز آ گئے، بڑے بڑے اہل معرفت اس کے معارف و حقائق کے سمندروں میں غوطہ زن رہے، لیکن ان کی وسعتوں نے انہیں گہری تہہ تک پہنچنے سے قبل ہی تھکا دیا اور اس کو پانے

سے پہلے ہی ان کی امیدیں ڈھیر ہوگئیں، علمائے امت اور فقہائے ملت اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوئے اور امت کے لیے عمدہ اور قیمتی مگر چھپے ہوئے موتی اور جواہرات نکال لائے، جس کے نتیجہ میں گویا یہ قرآن، نظام عالم کے سر کا تاج اور ہر دور کی تہذیب وثقافت کے ماتھے کا حسین جھومر بن گیا۔

قرآن کریم تو وہ عظیم کتاب ہے جس کو باری تعالیٰ شانہ نے اپنے علم کے ساتھ نازل فرمایا اور اس کی توصیف یوں فرمائی:

”کِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ.“

(صٓ: ۲۹)

ترجمہ: ”یہ بابرکت کتاب ہے، جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے؛ تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

”وَإِنَّهُ لَكِتَـٰبٌ عَزِيزٌ لَّا يَأْتِيهِ الْبَـٰطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ.“ (حم سجدہ: ۴۱، ۴۲)

ترجمہ: ”اور یہ (قرآن) بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے، یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔“

ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

”اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَـٰبًا مُّتَشَـٰبِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ.“

(زمر: ۲۳)

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی

جلتی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، جس سے ان لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، بدن کانپ اٹھتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم (اور منقاد) ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔"

مزید ارشاد فرمایا:

"وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَـٰلَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ." (شعراء: ۱۹۲ تا ۱۹۵)

ترجمہ: "اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں؛ تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔"

نیز ارشاد فرمایا:

"وَإِنَّهُ فِيٓ أُمِّ الْكِتَـٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ." (زخرف: ۴)

ترجمہ: "اور وہ ہمارے پاس لوحِ محفوظ میں بڑے رتبے کی اور اور حکمت بھری کتاب ہے۔"

عربی زبان بولنے والوں میں کائنات کے سب سے فصیح وبلیغ انسان، جن کو حکمت وفراست اور واضح کلام وخطاب مرحمت کیا گیا، جو گزرے اور آئندہ تمام زمانوں میں آنے والے سب لوگوں پر علمی برتری وتفوق کے حامل، خدائے پاک کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے اور خداوند تعالیٰ کے اسرار وحکم کے متعلق مخلوق میں سب سے زیادہ گہری بصیرت سے سرفراز، رسولوں کے سردار اور خاتم الانبیاء، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآن پاک کی توصیف کچھ اس طرح بیان فرمائی کہ اس کے بعد اس کی تعریف میں کسی بڑھنے والے کے لیے کوئی انتہا نہیں چھوڑی، چنانچہ فرمانِ نبوی ہے:

"کتاب اللہ فیه نبأ ما قبلکم، وخبر ما بعدکم، وحکم ما

بينكم، هو الفصل ليس بالهزل، من تركه من جبار قصمه الله، ومن ابتغى الهدى في غيره أضله الله، هو حبل الله المتين، وهو الذكر الحكيم، وهو الصراط المستقيم، وهو الذي لاتزيغ به الأهواء، ولا تلتبس به الألسنة، ولا يشبع منه العلماء، ولا يخلق على كثرة الرد، ولا تنقضي عجائبه ، وهو الذي لم تنته الجن إذ سمعته، حتى قالوا: ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْءَانًا عَجَبًا يَهْدِيٓ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ﴾، من قال به صدق، ومن عمل به أجر، ومن حكم به عدل، ومن دعا إليه هدي إلي صراط مستقيم.''

ترجمہ: ''قرآن کریم اللہ کی وہ کتاب ہے، جس میں تم سے پچھلوں اور تم سے اگلوں کے متعلق اہم خبریں ہیں، اس میں تمہارے آپس کے معاملات کے متعلق فیصلے ہیں، یہ خدا کا واضح اور فیصلہ کن کلام ہے جس میں کچھ مذاق نہیں، جس متکبر نے اس کو چھوڑا اللہ تعالیٰ نے اس کو تباہ کیا، اور جس نے اس کے علاوہ کسی دوسری کتاب میں ہدایت تلاش کی اللہ نے اس کو گمراہ فرمایا، یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی اور ذکر حکیم ہے، یہ صراط مستقیم ہے، اسی کے مطابق عمل پیرا ہونے سے خواہشات نہ بھٹکیں گی اور زبانیں نہ الجھیں گی، علماء اس سے سیر نہ ہوں گے اور کثرت سے پڑھے جانے کے باوجود یہ پرانا نہ ہوگا اور نہ اس کتاب کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے، یہی وہ کتاب ہے کہ جس کو سن کر جنات بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

''إِنَّا سَمِعْنَا قُرْءَانًا عَجَبًا يَهْدِيٓ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ.'' (الجن:۱، ۲)

ترجمہ: ''ہم نے عجیب قرآن سنا ہے، جو راہِ راست بتلاتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔''

جس شخص نے اس کے مطابق کہا، اس نے سچ کہا اور جس نے اس پر عمل کیا، مستحقِ

اجر وثواب ٹھہرا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے، اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا، سو اس نے سیدھے راستے کی طرف رہبری و رہنمائی کی۔"

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں حارث الاعور سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو نقل کیا ہے، اور علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ "تخریج أحادیث الکشاف" میں اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، اسحاق، دارمی اور بزار رحمۃ اللہ علیہم نے حارث کے طریق سے ذکر فرمایا ہے اور امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول روایت اس کا شاہد ہے، امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی مرفوعاً ذکر فرمایا ہے، لیکن یہ تمام روایات بہر حال ضعف سے خالی نہیں۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"القرآن ذو شجون وظهور وبطون، لاتنقضي عجائبه، ولا تبلغ غايته، فمن أوغل فيه برفق نجا، ومن أوغل فيه بعنف هوى، أخبار وأمثال، وحلال وحرام، وناسخ ومنسوخ، ومحكم ومتشابه، وظهر وبطن، فظهره التلاوة، وبطنه التأويل، فجالسوا به العلماء، وجانبوا به الفقهاء."

ترجمہ: "قرآن مختلف معانی کا حامل ہے، ظاہری معانی اور باطنی حقائق پر مشتمل ہے، اس کے عجائبات ختم نہ ہوں گے اور نہ اس کی مضامین کی انتہا تک کبھی پہنچا جا سکے گا، جس شخص نے دل کی نرمی سے اس میں غور وفکر کیا اس نے نجات حاصل کی اور جس نے سختی سے غور وخوض کیا وہ گر پڑا، اس میں خبریں اور مثالیں، حلال وحرام، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ اور ظاہر وباطن ہیں، ظاہر تو اس کی تلاوت وقراءت ہے اور باطن اس کی تفسیر وتاویل ہے، پس اس کو تھام کر علماء کی صحبت اختیار کرو اور کم عقلوں کے سامنے اس کو لے جانے سے کنارہ کش رہو۔"

صاحب ''الإتقان '' (علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے۔

چنانچہ اس نایاب اور سرچشمۂ قوت نازل شدہ کتاب قرآن مجید نے اپنے حسن ورعنائی اور اپنی بلند پایہ فصاحت وبلاغت سے عرب وعجم کے خطباء اور دنیا کے قادر الکلام بلغاء کی کھوپڑیاں اڑادیں، ان کے گویاؤں کو گونگا اور ان کی فصاحت وبلاغت کو ناقص کر چھوڑا، جس کے نتیجہ میں وہ اس کی رونق وحلاوت اور اس کے شہد کے مانند شیریں اسلوب کے سامنے حیرت زدہ رہ گئے، اس کی طمازت وتپش ان میں سرایت کرگئی، جس کی وجہ سے آپ ان کو نشہ میں مدہوش پائیں گے، حالانکہ وہ مدہوش نہیں، اور قرآن کا معاملہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

وَعَيْنَانِ قَالَ اللّٰهُ كُوْنَا فَكَانَتَا
فَعُوْلَانِ بِالْأَلْبَابِ مَا يَفْعَلُ الْخَمْرُ

ترجمہ: ''دو چشمے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہو جاؤ، پس وہ چشمے (رواں) ہوگئے اور عقلوں کے ساتھ شراب کا سا معاملہ کررہے ہیں۔''

ذرا ولید بن مغیرہ کے اس قول کو بھی مدنظر رکھیے، جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سورۂ ''حم سجدہ'' کی ابتدائی آیات سنیں تو پکار اٹھا:

''واللہ، إن له لحلاوة، وإن عليه لطلاوة، وإن أسفله لمغدق، وإن أعلاه لمورق، وإنه يعلوا ولا يعلى، وإنه ليحطم ما تحته.''

''بخدا! اس قرآن میں تو ایک عجیب قسم کی حلاوت اور رونق ہے، اس کا نچلا حصہ سرسبز وشاداب اور اوپر کا حصہ خوشہ دار ہے اور بلاشبہ یہ کلام غالب ہوگا، مغلوب نہ ہوگا اور یہ اپنے نہ ماننے والوں کو ہلاک کردے گا۔''

اس کتاب کی آیات مضبوط اور حکیم وخبیر ذات کی جانب سے نازل کردہ ہیں، اس کی

حکمتوں کے آگے مشرق ومغرب کے حکماء، تہی دست ہیں اور فقہائے عراق وحجاز، خراسان وقرطبہ اس کتاب کے احکام شرعیہ اور فقہی جزئیات ومسائل کے استنباط کرتے عاجز آ گئے، فلاسفۂ زمانہ اور دانشورانِ اقوام، قرآن کریم میں بیان کردہ تہذیب انسانیت اور قوانین تربیت کا احاطہ کرتے کرتے ہکلانے اور تتلانے لگے ہیں، اللہ بھلا کرے شیخ محدث حافظ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ شیخ صلاح الدین صفدی رحمۃ اللہ علیہ کو بعض مسائل کے متعلق جواب دیتے ہوئے قرآن کے اعجاز کے بارے میں اپنے اشعار میں کیا خوب کہہ گئے ہیں:

لِأَسْرَارِ آيَاتِ الْكِتَابِ مَعَانِيْ　　تَدِقُّ فَلَا تَبْدُوْ لِكُلِّ مُعَانِيْ
وَفِيْهَا لِمُرْتَاضٍ لَبِيْبٍ عَجَائِبُ　　سَنَا بَرْقِهَا يَعْنُوْ لَهُ الْقَمَرَانِ
إِذَا بَارِقٌ مِنْهَا لِقَلْبِيْ قَدْ بَدَا　　هَمَمْتُ قَرِيْرَ الْعَيْنِ بِالطَّيَرَانِ
سُرُوْرًا وَ إِبْهَاجًا وُصُوْلًا عَلَى الْعُلٰى　　كَأَنِّيْ عَلٰى هَامِ السِّمَاكِ مَكَانِيْ
وَهَاتِيْكَ مِنْهَا قَدْ أَبَحْتُ كَمَا تَرٰى　　فَشُكْرًا لِمَنْ أَوْلٰى بَدِيْعَ بَيَانِ
وَإِنَّ حَيَاتِيْ فِيْ تَمَوُّجِ أَبْحُرٍ　　مِنَ الْعِلْمِ فِيْ قَلْبِيْ تَمُدُّ لِسَانِيْ
وَكَمْ مِنْ كَنَاسٍ فِيْ حِمَايَ مُخَدَّرٌ　　إِلٰى أَنْ أَرٰى أَهْلاً ذَكِيَّ جَنَانِ
فَيَصْطَادُ مِنِّيْ مَا يُطِيْقُ اقْتِنَاصَهُ　　وَلَيْسَ لَهُ بِالشَّارِدَاتِ يَدَانِ
مُنَايَ سَلِيْمُ الذِّهْنِ رَيْضٌ ارْتَوٰى　　بِكُلِّ عُلُوْمِ الْخَلْقِ ذُوْ لَمَعَانِ
فَذَاكَ الَّذِيْ يُرْجٰى لِإِيْضَاحِ مُشْكِلٍ　　وَيُقْصَدُ لِلتَّحْرِيْرِ عِنْدَ عَيَانِ
وَكَمْ لِيْ فِي الْآيَاتِ حُسْنُ تَدَبُّرٍ　　بِهِ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ حَبَانِيْ
بِجَاهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَدْ نِلْتُ كُلَّ مَا　　أُنْى وَسَيَأْتِيْ دَائِمًا بِأَمَانِ
فَصَلّٰى عَلَيْهِ اللّٰهُ مَا ذَرَّ شَارِقٌ　　وَسَلَّمَ مَا دَامَتْ لَهُ الْمَلَوَانِ

ترجمہ: ''① قرآن کی آیات کے معانی وحقائق اتنے دقیق ہیں کہ ہر مشقت اٹھانے والے کے سامنے ظاہر نہیں ہوتے۔

② ان آیات میں عقل مند اور مجاہدانہ مزاج طبیعت کے لیے عجائبات ہیں، ان آیات کی روشنی وانوارات کے سامنے سورج و چاند جھک جاتے ہیں۔

③ جب ان آیات کی چمک میرے دل میں نمودار ہوتی ہے تو خوشی کے مارے میرا ٹھنڈی آنکھوں فضا میں اڑنے کو جی کرتا ہے۔

④ سرور و مسرت اور اونچے مراتب تک پہنچنے کی وجہ سے گویا میں اپنے آپ کو بلندیوں پر پہنچا ہوا سمجھتا ہوں۔

⑤ قرآن کی ان روشنیوں سے فائدہ اٹھاؤ، تم جانتے ہو کہ میں نے اس بات کا اظہار کیا ہے، وہ ذات سزاوارِ شکر ہے جس نے ایسا عمدہ اور بلیغ اسلوبِ بیان پیش کیا ہے۔

⑥ میری زندگی ،قرآنی علوم کے سمندر میں موج زن ہے اور ان ہی قلبی علوم کی وجہ سے میں جرأتِ اظہار کے قابل ہوا ہوں۔

⑦ کس قدر کوڑا کرکٹ میرے باطن میں پوشیدہ ہے، یہاں تک کہ میں کسی روشن ضمیر اہل (مصلح) کو دیکھوں۔

⑧ جو میرے قلب میں جس قدر شکار کر سکتا ہو کر لے؛ کیونکہ ان نامانوس نکات تک پہنچنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہے۔

⑨ میری آرزو ایسا شخص ہے، جو سلیم الذہن اور محنت کش ہو، خلقِ خدا کے علوم سے سیراب ہو اور علم کی روشنی سے دمکتا ہو۔

⑩ ایسے شخص کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ قرآنی مشکلات کو واضح کرے گا اور بوقتِ مشاہدہ مزید توضیح کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جا سکے گا۔

⑪ قرآن اور اس کی آیات کے بارے میں میرا حسنِ تدبر، اللہ کی مہربانی اور فضل وعنایت کا نتیجہ ہے۔

⑫ جو کچھ مجھے ملا ہے رسول اللہ کی برکت سے ہی میں نے حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ میرے پاس عافیت کے ساتھ ایسے علوم آتے رہیں گے۔

⑬ جب تک کسی روشن چیز کی روشنی باقی ہے اس پیغمبر پر اللہ کی رحمت ہو اور جب تک دن رات کا سفر جاری ہے اس پیغمبر پر اللہ کی سلامتی ہو۔"

ان اشعار کی حلاوت اور شیرینی نے مجھے اس مقام میں تمام اشعار ذکر کرنے پر مجبور کیا، یہ اشعار علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے بہاء الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے "عروس الأفراح شرح تلخیص المفتاح"[1] میں ذکر فرمائے ہیں۔



(۱) ملاحظہ فرمائیے: (۱/ ۲۷۱، ۲۷۲)، المکتبۃ العصریۃ، طبع اوّل، ۱۴۳۲ھ۔ ۲۰۰۳ء)۔

چند ضخیم تفاسیر

گزشتہ سطور کا حاصل یہ ہوا کہ باری تعالیٰ کا یہ کلام فصاحت و بلاغت کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور علوم و معارف اور حقائق و اسرار میں عالی شان ہونے کی وجہ سے گویا اتنا بلند مرتبہ ہے کہ اس تک پہنچنے سے خالص عربی تیز رفتار اونٹ اور مہاری اونٹ[۱] قاصر ہے، اسی طرح نظام عالم کے متعلق مختلف احکام وقوانین، انسانیت کی تربیت، اخلاق کی تہذیب اور قلوب و ارواح کی پاکیزگی سے متعلق قوانین کے سلسلہ میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے کہ فکر و نظر کی سواریاں اس تک رسائی سے عاجز ہیں، علاوہ ازیں بے شمار انوکھی معلومات، مختلف عجائبات پر مشتمل اور متنوع خصائص اور امتیازات کا حامل ہے، یہی وجہ ہے ملت اسلامیہ کے فضلا نے اپنی مبارک زندگیاں اور پاکیزہ لمحے قرآن کریم کے مختلف اسرار و حکم کے انکشاف اور توضیح میں گزار دیئے اور الفاظ قرآنی کے محاسن سے حاصل شدہ دلائلِ عظمت کو بیان فرمایا، امتِ محمدیہ کے اکابر نے اپنی کامیاب کوششوں کو قرآن کریم کی خدمت میں صرف کیا اور اس کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو کر لعل و جواہرات نکالے اور ان بکھرے موتیوں کو لڑی میں پرو دیا۔ (چنانچہ ذیل میں اکابر سلف کی جدوجہد کے نتیجے میں وجود پذیر ہونے والی چند اہم کاوشوں کا مختصر تذکرہ کیا جا رہا ہے):

① ان مبارک ہستیوں میں سے ایک شیخ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الرحمٰن بخاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو "الزاھد العلاء" کے لقب سے معروف اور صاحب ہدایہ کے شیوخ کے طبقے میں شمار

---

(۱) مہرہ بن حید کی جانب منسوب اونٹ، جو تیز رفتاری میں مشہور تھے۔

کیے جاتے ہیں، ۵۴۶ھ میں وفات پائی، موصوف نے قرآن کریم کی ایسی تفسیر مرتب فرمائی جو ہزار سے زیادہ اجزاء پر مشتمل ہے، شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے "تاج التراجم" میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔

② شیخ ابو یوسف عبد السلام بن محمد قزوینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۸۳ھ) نے تین سو جلدوں پر مشتمل تفسیر تصنیف فرمائی جس کا نام "حدائق ذات بھجة" رکھا اور صاحب "کشف الظنون" کے ذکر کردہ ایک قول کے مطابق یہ تفسیر پانچ سو جلدوں پر مشتمل ہے۔

③ علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی "الطبقات الکبریٰ" سے صاحب "کشف الظنون" نے نقل کیا ہے کہ امام محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۱۰ھ) نے پہلے پہل تیس ہزار اوراق پر مشتمل تفسیر تصنیف فرمائی، پھر اس ضخیم تفسیر کا خلاصہ تین ہزار اوراق میں تحریر کیا، آج یہ مختصر تفسیر تیس جلدوں میں مطبوعہ حالت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اصل تفسیر، جس کا اختصار تیس جلدوں میں ہے، کم از کم تین سو جلدوں پر تو ضرور مشتمل ہوگی۔

④ امام قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۶۸ھ) نے اسی ہزار اوراق پر محیط تفسیر لکھی، جس کا انہوں نے اپنی کتاب "القبس" میں تذکرہ فرمایا ہے، صاحب "الدیباج المذهب في معرفة أعيان المذهب" نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے یہ تفسیر سلطان ابو عنان کی لائبریری میں اسّی (۸۰) جلدوں میں دیکھی ہے۔

⑤ ادھر اہل مغرب کے سب سے بڑے عالم و عارف، صاحب "الفتوحات المكية" صوفیاء کے شیخ اکبر (ابوبکر ابن عربی) طائی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۲۸ھ) کو دیکھ لیجیے، جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر میں (۶۰) ساٹھ اجزاء تحریر فرمائے اور ان میں وہ نصف قرآن یعنی سورۂ کہف تک ہی پہنچ سکے۔

⑥ صاحب ''کشف الظنون'' کا بیان ہے کہ شیخ جمال الدین ابوعبداللہ حنفی مقدسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۹۸ھ)، جو ''ابن النقیب'' کی کنیت سے مشہور ہیں، انہوں نے لگ بھگ پچاس جلدوں میں تفسیر لکھی، جس کا نام ''التحرير والتحبير لأقوال أئمة التفسير في معاني كلام السميع البصير'' رکھا۔ علامہ کفوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر اسّی (۸۰) جلدوں پر مشتمل تھی اور ان سے قبل ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ جبکہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ ''الفوائد البهية في تراجم الحنفية'' میں نقل کرتے ہیں کہ مجیرالدین حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''تاريخ القدس'' میں لکھا ہے کہ یہ تفسیر ننانوے جلدوں پر مشتمل تھی، جس میں انہوں نے پچاس کے قریب تفاسیر سے استفادہ کرکے مواد جمع فرمایا تھا۔

⑦ شیخ ابوالقاسم اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۳۵ھ) نے تیس (۳۰) جلدوں میں تفسیر تالیف فرمائی۔

⑧ امام شمس الدین ابومظفر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۵۴ھ) نے بھی تیس جلدوں پر مشتمل تفسیر لکھی۔

⑨ ابن الندیم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق شیخ مفضل بن سلمہ حنفی رحمۃ اللہ علیہ، جن کا شمار تیسری صدی ہجری کے علماء میں ہوتا ہے، انہوں نے ''ضياء القلوب في معاني القرآن'' کے نام سے لگ بھگ بیس جلدوں میں تفسیر لکھی۔

⑩ ابن ندیم رحمۃ اللہ علیہ ہی نے ذکر کیا ہے کہ امام ابوبکر محمد بن الحسن انصاری النقاش رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک تفسیر ہے، جس کا نام ''التفسير الكبير'' ہے اور یہ تفسیر بارہ ہزار اوراق پر مشتمل ہے۔

⑪ صاحب ''ظهر الاسلام'' (صفحہ: ۲۰۵) رقم طراز ہیں کہ: ''ابوبکر ادفوی رحمۃ اللہ علیہ، جو ابوجعفر نحاس رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، انہوں نے علوم القرآن کے متعلق ایک کتاب تالیف فرمائی ہے، جو ایک سو بیس (۱۲۰) جلدوں پر مشتمل ہے، ان کا انتقال ۳۸۸ھ میں ہوا، اور (صفحہ: ۲۸۰)

پر مزید تحریر کرتے ہیں: ”ایک تفسیر بھی تحریر فرمائی جو سو جلدوں پر مشتمل تھی اور لکھنے والے کی عمر اور اس کے قلم کی سیاہی کو ختم کر دینے والی ہے، ابن سبکتگین نے اس کی تالیف پر علما کو مقرر فرمایا۔“

علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقالات (۱) میں تحریر فرماتے ہیں، اس جانب پچھلے صفحات میں اشارہ کر چکا ہوں، ان کے الفاظ درج ذیل ہیں:

”وأرجو القارئ الكريم أن يسمح لي أن أذكر بعض مؤلفات علماء هذه الأمة في هذا الصدد مما يكون أنموذجًا لمساعيهم الجبارة في مضمار تدوين المؤلفات ، فها هو تفسير الإمام أبي الحسن الأشعري المسمى ”المختزن“ في سبعين مجلداً، على ما يذكره المقريزي في ”الخطط“، وتفسير القاضي عبد الجبار الهمذاني المسمى ”المحيط“ في مائة سِفر، وتفسير أبي يوسف عبدالسلام القزويني المسمى ”حدائق ذات بهجة“ أقلّ ما يقال فيه : إنه في ثلاثمائة مجلد، وكان مؤلفه وقَفَه وجعل مقرّه مسجد الإمام أبي حنيفة ببغداد، ثم صار في عداد الكتب التي ضاعت في أثناء استيلاء المغول على دار الخلافة ببغداد، إلا أني سمعت من أحد أدباء الهند(۲) أنه رأى قطعة منه في أحد فهارس الخزانات. وللحافظ ابن شاهين تفسير في ألف جزء حديثي، وللقاضي أبي بكر ابن العربي ”أنوار الفجر“ في التفسير في نحو ثمانين ألف ورقة، والمعروف أنه موجود في بلادنا، إلا أنّي لم أظفر به مع طول

(۱) مقالات الكوثري، مقاله بعنوان: مولد خاتم رسل الله عليه أزكى الصلوات، ص:۳۰۳، دار السلام قاهره، طبع دوم، ۱۴۲۸ھ-۲۰۰۷ء۔

(۲) يريد به الأستاذ اللغوي الشيخ عبد العزيز الميمني.

بحثي عنه، ولابن النقيب المقدسي -أحد مشايخ أبي حيان- تفسير يقارب مائة مجلد يوجد بعض مجلدات منه في خزانات اصطنبول، ويوجد من تلك التفاسير بعض مجلدات في بعض الخزانات فيما أعلم.وأما أضخم تفسير تام يوجد اليوم -على ما نعلم- فهو تفسير "فتح المنان" المدعوب "التفسير العلامي" المنسوب إلى العلامة قطب الدين الشيرازي، وهو في أربعين مجلداً، فالمجلد الأول منه موجود بدار الكتب المصرية، وبه تظهر خطته في التفسير، وفي مكتبتي محمد أسعد وعلي باشا -حكيم أوغلى- في اصطنبول من مجلداته ما يتم بها نسخة كاملة، وللعلامة محمد الزاهد البخاري نحو مائة مجلد في التفسير، كما في "المنهل الصافي"، ولعلماء هذه الأمة تفاسير لا تحصى سوى ما تقدم على اختلاف مسالكهم."

ترجمہ: "میں قاری سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس بات کی اجازت دے گا کہ میں علمائے امت اسلامیہ کی تفسیر قرآن کی خدمت کے سلسلے میں چند مؤلفات کا تذکرہ کروں، جو تصنیف وتالیف کے میدان میں ان کی انتہائی محنتوں اور کوششوں کا ایک نمونہ ہے، چنانچہ علامہ مقریزی رحمۃ اللہ علیہ "الخطط" میں ذکر کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے "تفسیر المختزن" ستر جلدوں میں تحریر فرمائی، قاضی عبدالجبار ہمذانی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "المحیط" کے نام سے سو اجزاء پر مشتمل ہے۔ شیخ ابو یوسف عبدالسلام قزوینی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "حدائق ذات بھجۃ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کم از کم تین سو جلدوں میں ہے، کہتے ہیں کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس تفسیر کو بغداد میں واقع امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے لیے وقف

کردیا تھا، بعدازاں دارالخلافہ بغداد میں مغلوں کے غلبے کے دوران یہ کتاب بھی ضائع ہوگئی، لیکن میں نے ہندوستان کے ایک نامور ادیب (۱) سے سنا ہے کہ انہوں نے اس تفسیر کا کچھ حصہ کسی کتب خانے کی فہرست میں دیکھا تھا۔ نیز حافظ ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہزار حدیثی اجزاء پر مشتمل ہے، اسی طرح قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "أنوار الفجر" اسی (۸۰) ہزار اوراق پر مشتمل ہے، مشہور ہے کہ یہ ہمارے بلاد میں موجود ہے، لیکن راقم طویل بحث وتفتیش کے بعد بھی اس کتاب کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا، ابن نقیب مقدسی رحمۃ اللہ علیہ۔ جو ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ کے مشائخ میں سے ہیں۔ کی بھی سو (۱۰۰) جلدوں پر مشتمل ایک تفسیر ہے، جن میں سے بعض جلدیں استنبول کے ایک کتب خانے میں موجود ہیں، اور میری معلومات کے مطابق ان تفاسیر کی کچھ کچھ جلدیں مختلف کتب خانوں سے مل سکتی ہیں۔ رہی بات آج کل کی ضخیم اور مکمل تفسیر کی تو میرے علم کے مطابق تفسیر "فتح المنان" سب سے ضخیم ہے، جو "التفسير العلامي" کے نام سے بھی مشہور ہے اور علامہ قطب الدین شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے، یہ تفسیر چالیس جلدوں میں ہے اور اس کی پہلی جلد "دار الكتب المصرية" میں موجود ہے، جس سے ان کے تفسیری منہج کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، استنبول کے کتب خانہ محمد اسعد اور کتب خانہ علی پاشا (حکیم اوغلی) میں اس کی مختلف جلدیں موجود ہیں، جن سے اس تفسیر کا ایک مکمل نسخہ دستیاب ہوسکتا ہے، اسی طرح "المنهل الصافي" میں لکھا ہے کہ علامہ محمد زاہر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک تفسیر ہے جو سو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان مذکورہ تفاسیر کے علاوہ بھی علمائے امت کی اپنے اپنے منہج واسلوب کے مطابق تفاسیر ہیں جن کا شمار ناممکن ہے۔"

---

(۱) عربی زبان وادب کے ماہر مولانا عبدالعزیز میمن مراد ہیں۔

ان سطور میں بڑی تفسیروں کے متعلق اپنی محدود وناقص معلومات سپرد قلم کردی ہیں، رہی بات ان تفاسیر کی جو دس یا اس سے کم وبیش جلدوں پر مشتمل ہیں تو ایسی تفاسیر بے شمار ہیں، جن کا احاطہ ممکن نہیں۔

بہرکیف متقدمین ومتاخرین علمائے امت نے قرآن کریم کے علوم اور اسرار ومعارف کے بیان کرنے میں جاں گسل جدوجہد کی ہے اور برتن سے وہی چھلکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے، ہر مفسر نے اسی نقطۂ نظر سے قرآن کریم میں غور وخوض کیا جس فن سے وہ دلی شغف اور قلبی محبت رکھتا تھا، چنانچہ ایک محدث کا ہدف روایات کا سرد اوران کے طریقۂ بیان کے متعلق بحث رہی، جیسے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں کیا اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الدر المنثور" میں، اسی طرح دیگر محدثین نے یہی اسلوب اختیار کیا۔ فقیہ احکام مسائل کے استنباط واستخراج کے میدان میں، جیسے علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ نحوی عالم قرآن کریم کے وجوہِ اعراب، الفاظ قرآنی کے طریقہائے ترکیب اور اسلوب قرآن کے نظم کے سمندر میں غوطہ زن ہوا، جیسے ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر "البحر المحیط" اور "النھر الماد" میں کیا۔ علم بلاغت سے شغف رکھنے والے مفسر نے قرآن کریم کے اطناب وایجاز، تطویل واختصار میں پوشیدہ اعجاز کے اظہار کا دلدادہ بنایا، اور قرآن کریم کے مقاطع ومطالع (ابتدا وانتہائے کلام) اور اس کے عجائب وغرائب میں موجود حسن ظاہر کیا، جیسے علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "کشاف" اور ابوسعود رحمۃ اللہ علیہ نے "إرشاد العقل السلیم" میں یہ طریقۂ کار اپنایا۔ متکلم مفسر نے علم کلام کو اپنی جولانگاہ جانا، جیسے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی تفسیر "مفاتیح الغیب" (تفسیر کبیر) میں یہی منہج رہا، البتہ موصوف نے اس میں متفرق اہم مباحث کے تحت بے شمار قیمتی جواہرات درج کردیئے ہیں، اسی طرح ایک منطقی مفسر کے پیشِ نظر قیاس کی ترتیب اور رسوم وحدود (تعریفات) کے متعلق بحث وتفتیش رہی، جیسے: ابن سینا نے سورۂ اخلاص کی تفسیر میں یہ اسلوب اپنایا۔ جدید فلسفی کا مطمح نظر، کائنات میں

پھیلی اللہ کی نشانیاں، کائنات کے سربستہ راز، عنصری عجائب اور طبعی غرائب کا بیان رہا، جیسے شیخ جوہری طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کو فلکی و عنصری اور طبعی عجائبات سے اتنا بھر دیا ہے کہ سرسری نگاہ ڈالنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا قرآن اسی لیے نازل ہوا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ہر ایک عالم نے اپنا تھیلا اور برتن خالی کیا اور اپنے ترکش میں بھری معلومات کو انڈیل دیا اور یہ سب کچھ خدائے بلند و برتر و حکیم کے تقدیری فیصلے کے مطابق ہے؛ تاکہ علی الاعلان تمام انسانوں پر واضح ہو جائے کہ اس کلام الٰہی کے عجائب و غرائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور جو خبر، صادق و امین، پیغمبر محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے وہ چڑھتے دن میں وسطِ فلک جلوہ افروز سورج کی مانند سب پر عیاں ہو جائے۔

بہرکیف یہ چند اہم پہلو ہیں اور امید یہی ہے کہ جن بڑی تفاسیر کا تذکرہ ہوا، وہ تمام اہم مباحث اور معلومات و فوائد کی جامع ہوں گی اور ان مفسرین کی بصیرت و بصارت کی رسائی کے مطابق اہم خصوصیات و امتیازات کی حامل ہوں گی، البتہ بغداد کے مفتی سید محقق حنفی آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر علماء پر بڑا احسان ہے؛ اس لیے کہ یہ تفسیر اہل علم کے ہاتھوں میں موجود تمام تفاسیر میں روایت و درایت، فقہ و حدیث، فصاحت و بلاغت، ترکیب و لغت اور کلام و تصوف پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے ایک جامع تفسیر ہے، جس میں الفاظ کی ترتیب اور معانی کا نظم و نسق بھی معیاری ہے، گویا پوری تفسیر قیمتی لعل و جواہرات سے مزین ہے، اللہ رب العزت اس تفسیر کو مؤلف کے لیے بروز قیامت بہترین ذخیرہ بنائے، آمین!

میرے فاضل و ذکی دوست مولانا لطف اللہ پشاوری نے ہمارے شیخ امام العصر (مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالے سے مجھے بتایا کہ انہوں نے فرمایا:

”قرآن کریم کی تالیف شدہ تفاسیر کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔“

واقعی جب کوئی کتاب، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہو تو وہ اسی شان کے لائق ہے اور جب قرآن کریم کے بارے میں علمائے امت کے علوم کا یہ حال ہے تو جلیل القدر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم کی کیا شان ہوگی؟ یہ نکتہ اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کی ہے:

"انہوں نے قرآن کریم کو یاد کرنے (سمجھنے) میں آٹھ سال کا عرصہ لگایا۔"

نیز علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے:

"میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تیس بار قرآن کریم پڑھا۔"

(یہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال تھا، پھر) ان علوم کا کیا مقام ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس ہستی کو عنایت فرمائے تھے، جن کو اولین اور آخرین کا علم عطا فرمایا ہے؟! جو روئے زمین پر اب تک جتنے لوگ آئے ہیں یا آئندہ آئیں گے، ان میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں، وہ ذات جن پر یہ کتاب مبین نازل ہوئی ہے، یہاں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ پوری امت کے قلوب ان علوم کو جمع کر لیں جو اللہ نے اس امت کے پیغمبر، خاتم النبیین وسید المرسلین کے سینۂ اطہر میں ودیعت فرمائے ہیں۔

اب ذرا آگے بڑھ کر اس کتاب کے نازل کرنے والی ذات کی جانب بڑھیے، وہ کتاب جس کی آیات کو محکم بنایا گیا اور جسے حکیم وخبیر ذات کی طرف سے خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا، اس ذات کے ایسے علوم کے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے جو اس نے اپنے پاس اپنے غیب کے خزانوں میں رکھے ہیں؟!! وہی ذات ایسی ہے جس کا ذکر بلند وبالا ہے اور اس کی دلیل بہت عظیم ہے۔ جاہل تر مخلوق کی خالق، علیم وحکیم کے ساتھ کوئی ادنیٰ نسبت بھی بعید از قیاس ہے، حضرت خضر علیہ السلام کی مثال اس بات کو واضح کر دیتی ہے، اگرچہ وہ بھی ایک مثال ہی ہے، حقیقت نہیں ہے؛ اس لیے کہ قطرہ اور سمندر دونوں ہی متناہی اور ختم ہونے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم اس سے بلند وبالا ہے کہ اس کے

طول وعرض کی کوئی حد مقرر کی جائے، اس کا علم ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَـٰتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَـٰتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔“ (کہف:۱۰۹)

ترجمہ: ”آپ (ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر (کا پانی) روشنائی (کی جگہ) ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاوے (اور باتیں احاطہ میں نہ آویں)، اگرچہ اس سمندر کی مثل دوسرا سمندر (اس کی) مدد کے لیے ہم لے آویں۔“

اور فرمایا:

”وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَـٰمٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَـٰتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔“ (لقمان:۲۷)

ترجمہ: ”اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں، اگر وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے، اس کے علاوہ سات سمندر اور ہو جاویں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں، بے شک خدا تعالیٰ زبردست، حکمت والا ہے۔“

لہٰذا جس صاحبِ علم نے بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھی، چاہے وہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں جلدوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس نے قرآن کریم میں موجود تمام علوم کا احاطہ نہیں کیا، صاحب ”الإتقان“ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرماتے ہیں:

”علوم القرآن وما يستنبط منه بحر لا ساحل له۔“

ترجمہ: ”قرآن کریم کے علوم اور اس سے مستنبط احکام ومسائل ایک ایسا سمندر ہیں جس کا کوئی کنارہ نہیں۔“

البتہ ہر شخص اپنے حصہ اور کوشش کی بقدر علم کا احاطہ کر سکتا ہے اور ہر ایک اپنی لمبی رسی میں لکڑیاں جمع کرتا ہے، جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

وَمَا كُلُّ مَنْ قَالَ الْقَرِيْضَ بِشَاعِرٍ
وَلَا كُلُّ مَنْ عَانَى الْهَوىٰ بِمُتَيَّمِ

ترجمہ: "ہر شعر کا ایک ٹکڑا کہہ دینے والا شاعر نہیں کہلاتا اور نہ ہی ہر عشق کی مشقت برداشت کرنے والا عاشق شمار ہوتا ہے"

ایک اور شاعر نے بھی کیا خوب کہا ہے:

وَمَا كُلُّ مَخْضُوْبِ الْبَنَانِ بُثَيْنَةً
وَلَا كُلُّ مَصْقُوْلِ الْحَدِيْدِ يَمَانِيْ

ترجمہ: "انگلیوں کے پورے رنگی ہوئی ہر عورت "بثینہ" نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر قلعی کیا ہوا لوہا یمنی تلوار ہوتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ عاجز و درماندہ مخلوق خالق بزرگ و برتر کے کلام کا حق ادا نہیں کر سکتی، تبھی تو انسانوں کے قدم کوتاہ رہ گئے، اور ان کی حرص پیچھے ہٹ گئی اور ان کی ہمتیں جواب دینے لگیں، اسی وجہ سے علوم قرآن میں سے بہت سے علوم تا حال اپنے مرکز و معدن میں مخفی ہیں اور یونہی پوشیدہ رہیں گے، مشیّتِ ازلی اپنے بندوں کے دلوں پر علوم قرآنی کی موسلا دھار بارش برسا دے (تو اس ذات سے بعید نہیں) معارفِ ربانی کے چڑھتے بادل، علوم قرآن سے امت کے سینوں کو خداوند کریم کی مشیت کے مطابق سیراب کرتے رہیں گے اور اگر قرآن کے (علوم و معارف کے) فیضان کا شوق بیدار ہو جائے تو شاید اللہ تعالیٰ بنجر و خشک زمین (کی مانند دلوں) کو ان علوم سے سیراب فرما دے، کبھی دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں قرآن کریم کے ایسے پوشیدہ علوم کو ظاہر فرماتے ہیں جن کی اہلِ زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور نفوسِ انسانی بشدتِ اشتیاق ان کی جانب مائل ہوتے ہیں۔

اگر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک ہر دور میں قرآن کریم کی تالیف کردہ تفاسیر کا بغور مشاہدہ ومطالعہ فرمائیں گےاوراس پہلو کی طرف ایک اجمالی نظر بھی ڈالیں گےتو میری اس ناقص رائے کی حقیقت آپ کو معلوم ہوجائے گی اور شاید بعض قلوب میں یہ رائے مقام پائے گی، اگر مجھے مقصد سے دور ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس نکتے کی مزید تحقیق وترتیب کا حق ادا کرتا، لیکن اہلِ عقل کے لیےتو اشارات ہی کافی ہیں۔

امید ہے کہ اسلامی علوم کے خزانے (اہلِ علم) یہ قیمتی جواہر دنیاوالوں کے سامنے لانے کی کوشش کریں گے،ان دنوں اس کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں، چنانچہ بہت سے اسلامی دفینے اور علمائے امت کے خزینے جن کو زمانے نے بخل کی بنا پر چھپا رکھا تھااور گمان تھا کہ حوادث زمانہ کی دست برد نے انہیں ختم کرڈالا ہوگا، (منظرِ عام پرآگئے ہیں اورانہوں نے) لوگوں کے کتب خانوں کوگراں قیمت کردیا ہے،لوگ انتہائی بے چینی کے ساتھ ایسے علمی خزانوں کے محتاج ومشتاق تھےاور یونہی اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اپنی حجت کوتمام مخلوق پر تمام فرماتے ہیں۔



تفاسیر قرآن میں سب سے اہم اور معتبر کونسی تفسیر؟!

میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ امت کی یہ تمام مبارک کوششیں اس لائق ہیں کہ دل کی گہرائیوں سے ان کی قدر کی جائے؛ اس لیے کہ انہوں نے حسب استطاعت علوم قرآن کی تشریح وتوضیح اور اس کی عظمت کی حفاظت اور دفاع میں اپنی محنتوں کو صرف کیا، اس امت کے بعد میں آنے والوں پر ان کا بڑا احسان ہے۔

تفسیرِ قرآن بذریعہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بہر حال قرآن کریم کی سب سے زیادہ اہم اور معتبر تفسیر وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور آپ کی سیرت وہدایات۔ خواہ قول وعمل سے ہو یا اشارہ ودلالت سے۔ پر غور کر کے اس کی روشنی میں لکھی ہوئی ہو؛ اس لیے کہ آپ کی پاکیزہ زندگی اور مبارک ومقدس سیرت، کتاب اللہ کی آنکھوں دیکھی بے مثال تشریح وتفسیر ہے اور قرآن کریم کے اغراض ومقاصد کو ظاہر کرنے کے لیے بہت سوچ وبچار سے کفایت کرتی ہے، یہ نکتہ حضرت صدیقہ بنت صدیق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے درج ذیل قول سے واضح ہو جاتا ہے، وہ فرماتی ہیں:

”کَانَ خُلقه القرآن۔“

ترجمہ: ”آپ کی سیرت، قرآن کریم ہے“۔

ہمارے شیخ حضرت امام العصر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

”جب انسان پوری توجہ کے ساتھ حدیث شریف میں غور وفکر کرے تو بہت سی احادیث سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ قرآن کریم گویا ایک ایسا بہتا چشمہ ہے، جس سے احادیثِ نبویہ پھوٹ رہی ہیں، یہاں تک کہ بہت سی احادیث میں قرآن کریم کی تعبیر کی جانب باریک اشارات دکھائی دیں گے اور اس کے لیے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ متوفی (۹۱۱ھ) کی تفسیر ”الدر المنثور في التفسير المأثور“ سے مفید تفسیر کوئی نہیں۔“

راقم الحروف کہتا ہے: ”الإتقان“ میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے نقل کردہ اس قول سے بھی اس نکتے کی تائید ہوتی ہے:

”امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بھی فیصلہ فرمایا ہے وہ درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم سے سمجھا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ۔“

(النساء:۱۰۵)

ترجمہ: ”بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق؛ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں، جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے۔“

ہمارے شیخ فرمایا کرتے تھے:

”قرآن کریم کی مراد اس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک حدیث کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور حدیث شریف کو قرآن کریم کی شرح نہ بنایا جائے اور اسی طرح حدیث شریف کا مفہوم و مقصد معلق رہتا ہے جب تک کہ فقہ کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور اس کے ذریعہ بات کی حقیقت کا ادراک نہ کیا جائے“۔

حافظ ولی الدین العراقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن مرزوق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، شیخ عارف عبدالرحمٰن ثعالبی جزائری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۷۵ھ) نے اپنی کتاب "الجواهر الحسان في تفسير القرآن" میں نقل کیا ہے کہ حافظ ابوعمرو ابن عبدالبر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ متوفی (۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب "التقصي" میں تحریر فرمایا ہے:

"وأولى الأمور بمن نصح نفسه، وألهم رشده: معرفة السنن التي هي البيان لمجمل القرآن، بها يوصل إلى مراد الله تعالى من عباده فيما تفيدهم من شرائع دينه الذي به الابتلاء، وعليه الجزاء في دار الخلود والبقاء التي لها يسعى الألبّاء والعقلاء والعلماء الحكماء، فمن منّ الله عليه بحفظ السّنن والقرآن فقد جعل بيده لواء الإيمان، فإن فقه وفهم واستعمل ما علم دعي في ملكوت السموات عظيما، ونال فضلا جسيما."

"اپنے نفس کی خیرخواہی چاہنے اور اسے راہِ راست پر گامزن رکھنے والے کے لیے سب سے اہم امر یہ ہے کہ اسے احادیث وسنن کی معرفت حاصل ہو، جو قرآن کریم کے اجمال کی تشریح ہیں، اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اس مراد تک رسائی ممکن ہے جو وہ اپنے بندوں سے چاہتا ہے اور ان دینی احکام میں جو لوگوں کے لیے سودمند ہیں، جن کے ذریعے (بندوں) کی آزمائش ہوتی ہے اور جن پر ابدی گھر (جنت) کے اجروثواب اور ہمیشہ رہنے کا دارومدار ہے، جس کے لیے علماء، حکماء اور دانش ورانِ قوم سبھی کوشاں ہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت کی حفاظت کا ذریعہ بنا کر احسان فرمایا تو گویا اس کے ہاتھ ایمان کا جھنڈا دیا گیا، اگر اس کو ساتھ ساتھ فہم ودانائی بھی عطا ہو اور اپنے علم پر بھی عمل کرے تو ایسے شخص کو آسمان والوں کے ہاں عظیم (بڑے ہونے) کا لقب مل جاتا ہے اور وہ بڑا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔"

تفسیرِ قرآن بذریعہ اقوال و آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم

اس کے بعد وہ تفسیر اہمیت کی حامل ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حیات مبارکہ کے انوار کی روشنی میں ہو؛ اس لیے کہ وہ امت کے ستارے اور ملت کے راہنما ہیں اور قرآن کریم کے اولین مخاطب ہیں اور امت میں سب سے پہلے یہی لوگ ہیں جنہیں بھلائیوں کے کرنے کا حکم دیا گیا اور برائیوں سے روکا گیا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم کے متشابہات اور مشکل مقامات کے متعلق پوچھا، یہی ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے مجمل اور مبہم کو کھول کھول کر بیان کیا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے مشکل الفاظ کے معانی و مطالب کی وضاحت کی، جنہوں نے سب سے پہلے (آیاتِ کریمہ کے) شان نزول کا علم حاصل کیا اور ان کے نازل ہونے کے مقاصد سے آگاہی پائی اور بیشک یہ لوگ ان صفات کے مالک ہیں، جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں:

”أولئك أصحاب محمد ﷺ، أفضل هذه الأمة، وأبرها قلوبًا، وأعمقها علمًا، وأقلها تكلفًا، اختارهم الله لصحبة نبيه ولإقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوا على أثرهم، وتمسكوا بما استطعتم من أخلاقهم وسيرتهم؛ فإنهم على الهدي المستقيم.“

ترجمہ: ”یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہیں، امت میں سب سے افضل ہیں، سب سے زیادہ پاکیزہ قلوب کے مالک ہیں، سب سے زیادہ علم رکھنے والے اور سب سے کم تکلف کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی صحبت اور دین کو قائم رکھنے کے لیے انہیں چنا ہے، آپ لوگ ان کے مرتبہ (ومقام) کو پہچانیں اور ان کے نقش قدم پر چلیں اور اپنی وسعت و طاقت کے مطابق ان کے اخلاق اور سیرت کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں؛ اس لیے کہ وہ صراطِ مستقیم پر ہیں۔“

اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہی امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''سنن'' کے ''باب لزوم السنۃ'' میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''فارض لنفسك ما رضي به القوم لأنفسهم؛ فإنّهم على علم وقفوا، وببصر نافذ قد كفوا، وهم على كشف الأمور كانوا أقوى، وبفضل ما كانوا فيه أولى، فإن كان الهدى ما أنتم عليه لقد سبقتم إليه، ولئن قلتم: إنما حدث بعدهم ما أحدثه إلا من اتبع غير سبيلهم ورغب بنفسه عنهم؛ فإنهم هم السابقون، فقد تكلّموا فيه بما يكفي، ووصفوا منه ما يشفي، فما دونهم من مقصر، وما فوقهم من محسر، وقد قصر قوم دونهم فجفوا، وطمح عنهم أقوام فغلوا، وإنهم بين ذلك لعلى هدى مستقيم.''

ترجمہ: ''تم اپنے نفس کے لیے اسی طریقے پر راضی ہوجاؤ جس پر وہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم) اپنے لیے راضی ہوئے؛ اس لیے کہ وہ علم رکھنے والے ہیں اور گہری نظر وفکر عطا کی بنا پر وہ (بدعات سے) رُکے ہیں اور وہ (پچھلوں کی بنسبت) امور (دینیہ) کی حقیقت پر مطلع ہونے میں زیادہ قوی تھے اور وہ اس مرتبہ کے لیے جو اُن کا تھا، زیادہ موزوں تھے، اور اگر (بالفرض) ہدایت کا راستہ وہی ہوتا جس پر تم ہو تو تم لوگ تو ان سے بھی پہلے ہدایت تک پہنچ گئے ہو اور اگر تم کہتے ہو کہ ان کے بعد اگر کسی نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو اس کو ایسے ہی شخص نے ایجاد کیا، جس نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ اوروں کی اتباع کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے اعراض کیا (لیکن یہ گمراہی نہیں، ہدایت ہی ہے تو یہ احتمال باطل ہے)؛ اس لیے کہ وہی لوگ (ہدایت کی جانب) بڑھنے والے ہیں، انہوں نے دینی امور میں کافی شافی کلام کیا، اب نہ تو ان سے پیچھے رہنے کی گنجائش ہے

اور نہ ان سے آگے بڑھنے کی گنجائش ہے، اور جن لوگوں نے ان سے زیادہ کمی کی کوشش کی تو انہوں نے ظلم کیا اور جن لوگوں نے ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو انہوں نے زیادتی کی اور وہ اس بیچ (اعتدال) میں صراطِ مستقیم پر ہیں۔''

قرآن کریم کی تفسیر وتشریح کے علمی میدان میں سب سے سبقت پانے والے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تھے اور ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام گرامی تو خاص طور پر سرفہرست ہے، پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، جنہیں ''ترجمان القرآن'' اور ''حبر الامۃ'' جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے جو (بقول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) علم سے بھرے ہوئے برتن کی طرح تھے اور ان کے لیے اہلِ قادسیہ کو ترجیح دی گئی تھی۔ (۱)

چنانچہ صاحب ''الجواهر الحسان'' علامہ ثعالبی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں صدر المفسرین اور (تائید ایزدی سے سب سے زیادہ) مؤید حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا درجہ تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تو اسی تفسیر کے میدان کے لیے یکسوئی اختیار کی اور اس تفسیری کام کو اپنی بساط کے مطابق مکمل فرمایا، کئی تابعین نے ان کی پیروی کی اور ان سے استفادہ کیا، جن میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات کے نام سرفہرست ہیں، اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفسیری روایات، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول روایات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''جو تفسیری نکات وفوائد مجھے حاصل ہوئے ہیں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا افادہ ہے۔'' ادھر حضرت

---

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کی مدح میں فرمایا تھا: ''كنيف ملئ علمًا، آثرت به أهل القادسية''.
(طبقات ابن سعد: ۲/ ۱۵، طبع لیڈن)

علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تعریف فرماتے اور ان سے استفادہ کی ترغیب دیا کرتے تھے، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: "حضرت عبد اللہ بن عباس کیا ہی بہترین ترجمان القرآن ہیں۔" اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں دعا فرمائی:

"اللّٰهُمَّ فقهه في الدين وعلمه التأويل."

ترجمہ: "اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ بوجھ عطا فرمایئے اور ان کو قرآنی تاویلات کا علم نصیب فرمایئے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قدر و منزلت جاننے کے لیے ان کے حق میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا ہی کافی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد علم تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے، اور وہ تمام روایات جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں وہ "عمدہ و اولیٰ" اور (تابعین سے منقول روایات سے) مقدم شمار ہوں گی۔"

دورِ تابعین اور بعد کے ادوار میں نمایاں مفسرین

تابعین کرام میں حضرت حسن ابن ابی الحسن، مجاہد، سعید بن جبیر اور علقمہ رحمۃ اللہ علیہم، تفسیر قرآن سے متعلق نمایاں شخصیات شمار کی جاتی ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہر آیت کے مفہوم کی واقفیت حاصل کی تھی۔ ان کے بعد حضرت عکرمہ اور ضحاک بن مزاحم رحمۃ اللہ علیہما کا رتبہ ہے، اگرچہ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے استفادہ نہیں فرمایا، بلکہ سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے علم تفسیر حاصلکیا تھا۔

سدی اور ابو صالح کے بارے میں عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے طعن فرمایا ہے، کیونکہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں حضرات کو کوتاہ نظر و فکر کا حامل گردانتے تھے۔

مذکورہ بالا علماء کے علاوہ قرآن کریم کی تفسیری روایات کو محفوظ کرنے میں ہر زمانے کے منصف مزاج اور اعتدال پسند علماء کی جماعت شامل رہی اور علم تفسیر پر ہر دور میں علماء نے خامہ فرسائی کی، جیسے عبدالرزاق، مفضل، علی بن ابی طلحہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہم، بعد ازاں محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بکھرے تفسیری مواد اور عام دسترس سے دور روایات کو یکجا جمع کیا، اور ان کی اسانید کے متعلق تشفی بخش خدمت سرانجام دی۔

متأخرین علماء میں علم تفسیر سے نمایاں شغف رکھنے والوں میں سے ابو اسحاق الزجاج اور ابو علی الفارسی رحمہما اللہ توضیعف ہیں، جبکہ ابوبکر النقاش اور ابو جعفر النحاس رحمہما اللہ کے کلام پر علما نے کافی استدراک فرمایا ہے، مکی بن ابی طالب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان دونوں کی راہ پر گامزن ہیں اور ابو العباس المهدوی رحمۃ اللہ علیہ تالیفی پہلو سے مضبوط ہیں، بہر حال یہ تمام حضرات مجتہدین تھے اور اپنے درجات کے اعتبار سے ماجور بھی، رحمهم الله تعالى ونضّر وجوههم۔"

اس موضوع کے متعلق مزید تفصیل کے لیے ابن ندیم کی "الفهرست" دیکھی جاسکتی ہے اور خاص طور پر صفحہ: ۵۰ سے ۵۹ (مطبوعہ مصر) تک (انتہائی گرانقدر معلومات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں)۔ اسی طرح صاحب "كشف الظنون" نے جو علم تفسیر کے متعلق ذکر فرمایا ہے اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی "الإتقان" کی "نوع ثمانين" (باب نمبر: ۸۰) بھی (اسی موضوع کے متعلق تفصیلات جاننے والوں کے لیے فائدہ مند ہوں گی)۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم امت کے وہ چیدہ اشخاص تھے، جو اپنی کامل سمجھ بوجھ، صحیح علم اور عمل صالح میں ممتاز درجہ کے حامل تھے، وہ علم میں راسخ اور درست فہم میں سب سے سبقت لے جانے والے تھے، اور وہی اپنے اعمال کی طرف پوری توجہ دینے والے اور یکسو تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: "سبق المفرّدون۔" "یعنی یکسو رہنے والے لوگ سبقت لے گئے۔"

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الاِتقان" کی اٹھترویں نوع میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے:

"امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ عقیدہ رکھنا بھی واجب ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے قرآن کریم کے الفاظ بیان فرمائے ،اسی طرح ان کو قرآن کریم کے معانی سے بھی روشناس کروایا، چنانچہ فرمان باری تعالیٰ: "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" الفاظ ومعانی دونوں کو شامل ہے۔

حضرت ابوعبد الرحمن سلمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ جیسے قرآن کریم پڑھنے والے حضرات نے ہمیں بتایا کہ وہ حضرات جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تھے تو جب تک ان دس آیات کے متعلق کامل علم وعمل نہ سیکھ لیتے ،ان آیات سے آگے نہ بڑھتے تھے۔اور کہتے تھے کہ اسی وجہ سے ہم نے قرآن کریم اور علم وعمل سب ساتھ سیکھا؛ بنابریں وہ ایک مدت تک ایک سورت یاد کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص سورۂ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نظروں میں بڑا عالی مرتبہ شمار ہوتا تھا۔"

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے:

"عارف ومحدث ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: "اگر میں چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کو بوجھل کرسکتا ہوں۔" (یعنی اس سورت کی تفسیر میں اس قدر علمی فوائد ونکات بیان کرسکتا ہوں کہ ان کو اگر لکھا جائے تو یہ اوراق ستر اونٹوں کے بوجھ کے بقدر ہوجائیں گے)،لیکن پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عوام کی سمجھ بوجھ کے قریب قریب باتیں بیان فرمائیں۔"

راقم الحروف کہتا ہے کہ باری تعالیٰ کا سورۂ جمعہ میں مذکور فرمان:

”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَـٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ۔“ (الجمعہ:۲)

ترجمہ: ”وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں اُن ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو (اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن کو (عقائد باطلہ واخلاقِ ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور اُن کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔“

اور سورۂ آل عمران میں درج یہ فرمان:

”لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَـٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ۔“ (آل عمران:۱۶۴)

ترجمہ: ”حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا، جبکہ اُن میں اُن ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ اُن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ سناتے ہیں اور اُن لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور اُن کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔“

اور سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کے ذیل میں یہ فرمان:

”رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَـٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔“ (البقرہ:۱۲۹)

ترجمہ: ”اے ہمارے پرورگار! اور اس جماعت کے اندر ان ہی میں کے ایک

ایسے پیغمبر بھی مقرر کیجیے؛ جو اُن لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور
اُن کو (آسمانی) کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور اُن کو پاک کر دیں،
بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت، کامل الانتظام۔‘‘

یہ فرامین مقدسہ، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات کے کلام پر واضح ترین دلائل وشواہد ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم الفاظ ومعانی کے جاننے والے کیونکر نہ ہوتے، جبکہ باری تعالیٰ نے اس قرآن کو اتارا ہی اس لیے ہے کہ اس کی آیات میں تدبر کیا جائے؟! چنانچہ فرمان باری ہے:

’’كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا آيَاتِهِ. ‘‘ (ص:۲۹)

ترجمہ: ’’یہ بابرکت کتاب ہے، جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے؛
تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔‘‘

مزید براں باری تعالیٰ غور وتدبر نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ أَقْفَالُهَا. ‘‘ (محمد:۲۴)

ترجمہ: ’’تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں؟!‘‘

ان فرامین کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو امت میں سب سے زیادہ اس قرآن میں غور وتدبر کرنے والے اور اس میں موجودہ احکامات پر سب سے زیادہ عامل تھے؛ اس لیے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ وطیرہ نہ ہوتا تو پھر ان کے بعد ایسا کون ہوسکتا تھا؟! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان عظمت ایسی ہی تھی جیسے ایک شاعر نے کہا تھا:

لَهُمْ شَمْسُ النَّهَارِ إِذَا اسْتَقَلَّتْ ... وَنُوْرٌ مَا يَغِيْبُهُ الْعَمَاءُ
هُمْ حَلُّوْا مِنَ الشَّرَفِ الْمُعَلّٰى ... وَمِنْ حَسَبِ الْعَشِيْرَةِ حَيْثُ شَاءُوْا
مِنَ الْبِيْضِ الْوُجُوْهِ نُجُوْمُ هُدًى ... لَوْ أَنَّكَ تَسْتَضِيْئُ بِهِمْ أَضَاءُوا
فَلَوْ أَنَّ السَّمَاءَ دَنَتْ لِمَجْدٍ ... وَمَكْرُمَةٍ دَنَتْ لَهُمُ السَّمَاءُ

ترجمہ: ’’① ان کے واسطے تو دن میں چڑھتے سورج کے مانند روشنی ہوا کرتی ہے اور
ان کے واسطے ایسا نور ہے جس کو بادل غائب نہیں کرسکتا۔

② وہ شرافت و کرامت اور خاندانی حسب نسب (کی بلندی) میں وہ رتبہ پا گئے جو انہوں نے چاہا۔

③ روشن چہروں والے اور ہدایت کے ستارے، اگر تو ان سے روشنی کا طلبگار ہو تو وہ تجھ کو روشنی دے دیں۔

④ چنانچہ اگر آسمان کسی کی بزرگی و برتری کی بنا پر قریب ہوتا تو وہ انہی حضرات کے سامنے جھک پڑتا۔"

راقم الحروف نے ان اشعار پر بے ساختہ یہ اضافہ کیا ہے:

بِحَارُ مَعَارِفٍ وَعُيُوْنُ عِلْمٍ بَيَانُهُمْ مِنَ الْجَهْلِ شِفَاءُ

ترجمہ: "وہ حضرات فوائد و معارف کے سمندر اور علوم کے سرچشمے تھے اور ان کا بیان کرنا جہالت کے مرض کے لیے شفا ہے۔"

یہ کافی وسیع موضوع ہے جس کے احاطے کا یہ موقع نہیں اور جو حضرات اس موضوع کے متعلق مزید تفصیلات کے خواہاں ہوں تو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی "الإتقان" اور علوم القرآن کے موضوع پر لکھی گئی دیگر کتب کی مراجعت فرما سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے جو کچھ ذکر کیا یا بیان کرنے کی کوشش کی، اس میں بیشتر مباحث راقم کے کمزور تدبر و تأمل اور ناقص غور و فکر کا نتیجہ ہیں، پھر میں نے یہی کچھ اکابر علمائے امت۔ جو اللہ کے ہاں اپنی دینی خدمات کی وجہ سے یقیناً بڑے ثواب و انعام کے مستحق ہیں۔ کے کلام میں دیکھا، محاورہ ہے: "قد يتوارد الخاطر على الخاطر كما يقع الحافر على الحافر" (کبھی کبھار کسی کے دل کے خیالات دوسرے کے دل میں آنے والے خیالات سے ایسے ملتے جلتے ہیں جیسے گھوڑے کے ایک کھر پر دوسرا کھر ہو)۔ چنانچہ بہت سے مقامات میں میری تعبیر و تصویر اکابر اہلِ علم کی تعبیر و تصویر کے بالکل موافق ہے، البتہ کسی قدر طرز انشاء، طریق تحریر اور بعض مقامات میں تقدیم و تاخیر کا فرق ہے، فللّٰه الحمد حمدًا كثيرًا!

اور یہ اتفاقِ آرا محض ان کی روحانیت کی برکات اور ان کے متعلق میرے حسن ظن کا نتیجہ ہے؛ اس لیے کہ بہر حال ان علمی میدانوں میں ہی سبقت کرنے والے اور کرامات کے حامل ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے ان کے علوم ومعارف سے بہرہ ور فرمائے اور اپنے فضل سے انھی کے زمرے میں میرا حشر وحساب فرمائے۔ آمین!

تفسیرِ قرآن میں محض لغت اور تاریخ پر اعتماد

اس بحث کے متعلق میں نے قدرے تفصیل سے اس لیے کام لیا کہ آج کل قرآن کریم کی تفسیر کی کوشش کرنے والے بہت سے ہم عصر اہل علم حضرات کو دیکھتا ہوں کہ خود کو احادیث وآثار سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور محض لغت وتاریخ پر اعتماد کرتے اور سنت اور اجماع امت سے صرف نظر کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ جہاں حدیث وآثار ان کی خواہش کے موافق ہوں تو ان کے قائل ہوتے ہیں اور رائے کے خلاف ہوں تو ان کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ پھر جو چاہتے ہیں کہتے ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، یہی الحاد وزندیقیت کا پہلا دروازہ ہے۔ ابوالکلام احمد (آزاد) دہلوی کی ”ترجمان القرآن“ ہی کو ملاحظہ کر لیجیے کہ کس طرح بودی اور کمزور بنیاد کی حامل تاریخ اور اپنی ناقص آرا کو فہم قرآن اور قرآن کریم کے جلیل القدر نظم کے حل کے لیے مدار ٹھہرایا ہے، ان کی تفسیر کے متعلق ان شاء اللہ اگلے صفحات میں کلام آئے گا، ان کی مانند دیگر ہم عصر حضرات نے بھی یہ طرز عمل اپنا رکھا ہے، اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں اور وہی حق کی طرف رہبری فرمانے والے ہیں۔



مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرائی

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر، مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرائی کا بیان، جو متفرق و منتشر انداز میں سپردِ قلم کیا ہے، انہیں کامل طور پر یکجا بیان کر دیا جائے۔ علماء کرام نے ان شرائط کے متعلق طویل بحثیں فرمائی ہیں، جو ان کی ہم پر مہربانی اور احسان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ توفیق خداوندی کا سہارا لے کر ان کے ذکر کردہ قیمتی اقوال اور تابناک عبارات میں سے ایسے منتخب نکات بیان کروں، جو ان تمام منقول اقوال کے ہار کا ہیرا اور پروئے ہوئے موتیوں میں سے قیمتی موتی ہو۔ امید ہے کہ یہ نکات آنکھوں کے لیے بصیرت اور قلوب کے لیے شفا کا سامان مہیا کریں گے اور حقیقی توفیق دہندہ اور مددگار تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس بات میں علماء کرام کی دو آرا ہیں کہ آیا ہر شخص کے لیے قرآن کریم میں غور و فکر جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت تو کہتی ہے کہ کسی شخص کے لیے قرآن کریم کی کسی آیت و جزء کی تفسیر کرنا جائز نہیں، چاہے وہ بڑا ادیب اور ادلۂ شرعیہ، علم فقہ، علم نحو، علم اخبار و آثار کی معرفت میں خوب رسوخ و کمال رکھتا ہو، البتہ وہ تفسیر بیان کر سکتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہو۔ اور دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کرنا ہر اس شخص کے لیے جائز ہے جو ان پندرہ علوم میں کامل رسوخ رکھتا ہو، جن کی ایک مفسر کو ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ پندرہ علوم درج ذیل ہیں:

① علم لغت ② علم نحو ③ علم صرف

④علم اشتقاق ⑤علم معانی ⑥علم بیان

⑦علم بدیع ⑧علم قراءت ⑨علم اصول فقہ

⑩علم قصص ⑪علم اسبابِ نزول ⑫علم اصول دین (علم کلام)

⑬علم ناسخ ومنسوخ ⑭علم فقہ ⑮ان احادیث کا علم جو مجمل ومبہم کی توضیح کرتی ہیں۔

⑯اوران سب سے بڑھ کر وہبی علم، جو اللہ رب العزت علماء عاملین کو الہام والقاء کے ذریعے مرحمت فرماتے ہیں، جس کی جانب درج ذیل حدیث نبوی میں اشارہ بھی وارد ہوا ہے:

"من عمل بما علم یورثه الله علم ما لم یعلم."

ترجمہ: "جو شخص اپنے علم پر عمل کرے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا علم اسے مرحمت فرماویں گے جن کو وہ نہیں جانتا۔"

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی تفسیر کے لیے ان علوم کے احتیاج کی وجوہات بھی بیان فرمائی ہیں، لیکن یہ وجوہات چونکہ ہر سطحی فکر (اور عربی زبان سے قدرے واقفیت) رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے، اس لیے ان وجوہات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا ہے:

"مندرجہ بالا پندرہ علوم، مفسر کے لیے تفسیر میں ہتھیار کی مانند ہیں اور ان کو حاصل کیے بغیر کوئی شخص مفسر بن ہی نہیں سکتا، چنانچہ جو شخص ان علوم پر کامل دسترس حاصل کیے بغیر تفسیر کرے گا تو وہ تفسیر بالرائی کا مرتکب ہوگا، جس کی (احادیث مبارکہ میں) ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کے برعکس ان علوم میں رسوخ رکھنے والا تفسیر بالرائی کا مرتکب نہ ٹھہرے گا، جو حدیث میں ممنوع قرار دی گئی ہے۔"

راقم الحروف عرض گزار ہے کہ ان دونوں اقوال میں تطبیق اور پہلے قول کو دوسرے قول کے کی جانب لوٹانا چنداں مشکل نہیں؛ کیونکہ جو تفسیر صحیح سند سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو اور اسی طرح کی کوئی اور حدیث اس کے معارض نہ ہو تو تمام اہلِ علم کے نزدیک وہی تفسیر متعین ہوگی اور اگر کوئی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح سند سے ثابت نہ ہو اور وہ مقام تفسیر وتوضیح کا محتاج ہو اور وہ متشابہات میں سے بھی نہ ہو۔ جن پر اجمالی ایمان تو ضروری ہوا کرتا ہے، لیکن ان کی حقیقت اور تفصیل اللہ جل شانہ کے سپرد کردی جاتی ہے۔ اور نہ ہی ایسا مشکل ومبہم ہو کہ اگرچہ متشابہات میں سے نہ ہو، لیکن متشابہات کی مانند ہو کہ غور وفکر سے بھی اس کے معنی واضح نہ ہو سکتے ہوں، بلکہ ہر صاحبِ علم اس کے صحیح معنی ومفہوم تک رسائی حاصل کرسکتا ہو اور اہل زبان اس کے درست مصداق کو سمجھتے ہوں، تو اس مقام کے متعلق کلام کرنا ہر ایسے عالم کے لیے جائز ہوگا جو مذکورہ بالا پندرہ علوم میں کامل رسوخ اور مہارت تامہ رکھتا ہو اور کیونکر جائز نہ ہو جبکہ اللہ رب العزت کی یہ مقدس کتاب لوگوں کے لیے نصیحت اور سینوں میں چھپے شفا کا پیام ہے تو پھر وہ کیونکر آسمان وزمین کے مابین یوں معلق رہ سکتی ہے (کہ اس کا معنی کسی کو سمجھ نہ آئے؟!) حالانکہ خود باری تعالیٰ کا فرمانِ عالی شان ہے:

’’لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ۔‘‘ (نساء:۸۳)

ترجمہ: ’’تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے، جو ان میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے۔‘‘

اگر اس مقام پر قول اول کا سطحی معنی مراد لیا جائے تو استنباط واستخراج سے کچھ علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا اور یوں قرآن کا بیشتر حصہ غیر مفہوم ٹھہرے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ان دونوں اقوال کی ایک ہی منزل طے کردی جائے، اس طرح معاملہ آسان اور لچک دار ہو جائے گا، تب یہ معاملہ آسان ہوگا اور باہمی اختلاف بھی ختم ہو جائے گا۔

مذکورہ جمع وتطبیق کے حوالے سے علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل عبارت ۔واللہ اعلم۔ میری تائید کرتی دکھائی دیتی ہے، (موصوف رقم طراز ہیں):

”قرآن کریم دو حصوں پر مشتمل ہے: ایک حصہ تو وہ ہے جس کی تفسیر منقول ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کی تفسیر کے متعلق روایات وارد نہیں۔

پھر پہلے حصے کی تفسیر یا تو خود آنحضرت ﷺ سے یا صحابہ کرام یا کبار تابعین سے منقول ہوگی۔

پہلی صورت (یعنی اگر حضور ﷺ سے منقول تفسیر ہو تو اس) میں سند کی صحت سے بحث کی جائے گی۔

دوسری صورت (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول تفسیر) میں دیکھا جائے گا کہ اگر وہ تفسیر لغوی اعتبار سے کی گئی ہے تو چونکہ وہ اہل زبان تھے، اس لیے اس تفسیر پر اعتماد کیا جائے گا، یا وہ تفسیر اسباب وقرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مشاہدہ کے پیش نظر ہوگی، تب بھی اس تفسیر (کی قبولیت) میں شک نہ ہوگا۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تفسیری اقوال میں بظاہر تعارض واقع ہو رہا ہو تو اگر جمع وتطبیق ممکن ہو تو جمع وتطبیق کی صورت نکالی جائے گی اور اگر جمع وتطبیق ممکن نہ ہو تو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر مقدم ہوگی؛ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو (صحتِ تاویل کی) خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا تھا:

”اللّٰهم علّمه التأويل.“

ترجمہ: ”اے اللہ! ان کو تاویلِ (تفسیر) قرآنی کا علم مرحمت فرما۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ علم فرائض ومیراث کے مسائل میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کو مقدم فرمایا کرتے تھے؛ اس لیے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

”أفرضكم زيد.“

”تم میں میراث کے مسائل کو سب سے زیادہ جاننے والے زید ہیں۔“

جو تفاسیر تابعین سے منقول ہیں تو ان پر اعتماد انہی صورتوں میں ہوگا جن صورتوں

میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفاسیر پر اعتماد ہوتا تھا، ورنہ (یعنی اگر ان میں تعارض واقع ہو جائے تو) اجتہاد سے کام لیا جائے گا۔

جن مقامات کے متعلق کوئی روایت وارد نہیں ہوئی وہ بہت ہی کم ہیں، ان مقامات کے درست معانی ومفاہیم تک رسائی کے لیے سب سے پہلے لغتِ عرب میں مفردات اور ان کے مدلولات ومصداقات پر غور وخوض کیا جاوے گا اور اس سیاق وسباق میں استعمال کی جانچ پڑتال بھی کی جائے گی، امام راغب نے اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے۔"

علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمائی ہے، اسی طرح راقم کی تائید کے سلسلے میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الإتقان'' میں "المدخل" سے منقول درج ذیل عبارت بھی قابل غور ہے:

''جو تفسیر، شارع علیہ السلام سے منقول ہو، اس کے متعلق غور وفکر کی بالکل ضرورت نہیں اور جس تفسیر کا بیان صاحب شرع سے منقول نہیں ہے، اس میں اہل علم غور وخوض کریں گے؛ تاکہ علماء کرام غیر منقول تفاسیر کو منقول تفاسیر کی روشنی میں استدلال واستنباط اور اجتہاد کو بروئے کار لا کر واضح فرما سکیں۔''

تفسیر بالرائی سے کیا مراد ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من تكلم في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ."

ترجمہ: "جس نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کلام کیا تو باوجود صحیح تفسیر کرنے کے اس نے غلطی کی۔"

یہ الفاظ سنن نسائی، ابوداؤد اور ترمذی کے ہیں، جبکہ ایک روایت میں "من قال" اور ایک

دوسری روایت میں ”من فسر القرآن “ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث میں ممنوعہ تفسیر بالرائی کی تشریح وتوضیح میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں کہ اس تفسیر بالرائی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد مبارک کیا ہے؟

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار۔ “

ترجمہ: ”جس نے قرآن کی تفسیر میں بغیر علم کے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔“

اس حدیث کے متعلق بھی علماء کرام کا اختلاف ہے کہ اس میں تفسیر بلا علم سے کیا مراد ہے؟ اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔ پہلی حدیث کی صحت کے متعلق علماء کرام نے بحث فرمائی ہے اور (بعض قرائن سے) اس کی صحت ثابت ہونے کے بعد امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”اس رائے سے مراد – واللہ أعلم – وہ رائے ہے جو بغیر کسی دلیل کے قائم کی جائے، البتہ جو رائے دلیل سے مؤید ہو، تو اس کا اظہار جائز ہے۔“

اور حدیث میں مذکور اس ٹکڑے ”فأصاب فقد أخطأ“ (اگر بلا علم درست تفسیر بھی بیان کرلے، تب بھی اس نے غلطی کی) کا مطلب علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”المدخل“ سے یوں نقل فرمایا ہے:

”(اگرچہ اس نے تفسیر میں درست تو کہا، لیکن) اس صحیح رائے زنی کے لیے جو طریقہ اس نے اختیار کیا، اس میں اس سے خطا ہوئی؛ اس لیے کہ صحیح تو یوں تھا کہ سب سے پہلے اس کے الفاظ کی تفسیر کے لیے اہل زبان کی طرف رجوع کرتا، اس کے ناسخ ومنسوخ اور سبب نزول کے متعلق کھوج کرید کرتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے قرآن کریم کی وحی کا مشاہدہ کیا ہے اور ہم تک وہ سنن واحادیث پہنچائی ہیں جو کلام اللہ کی تفسیر وتشریح ہیں، جس قرآنی مقام کی وضاحت مطلوب ہو، اس کے متعلق ان کے اقوال واخبار میں غور وفکر کرتا۔ یا پھر اس رائے سے مراد اس شخص

کی رائے ہے جو علم (تفسیر) کے اصول و فروع جانے بغیر محض اپنی اٹکل سے رائے زنی کرے۔ چنانچہ درست بات سے اگرچہ اس کی موافقت بھی ہو جائے، لیکن وہ اس درست اور صواب رائے سے ناواقف ہے؛ اس لیے (محض اٹکل سے رائے زنی) قابل تعریف نہ ہوگی۔''

اور دوسری حدیث کے متعلق علامہ انباری رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ دو معانی میں سے ایک یہ ہے:

''من قال في القرآن قولاً يعلم أن الحق غيره فليتبوأ مقعده من النار.''

یعنی ''جس شخص نے قرآن کی تفسیر و توضیح میں حق کے خلاف رائے زنی کی، باوجودیکہ وہ جانتا ہو کہ حق اس کے علاوہ ہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔''

ابن نقیب حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''تفسیر بالرأی والی حدیث کے درجے کے متعلق علماء کرام سے پانچ اقوال منقول ہیں:

① جو علوم، تفسیر قرآن کے لیے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو حاصل کیے بغیر تفسیر قرآن بیان کرنا (یہ جائز نہیں؛ کیونکہ یہ علوم، تفسیر کے لیے شرائط ہیں اور ان کے حصول اور ان میں رسوخ کے بغیر تفسیر قرآن جائز نہیں ہے)۔

② متشابہات کی تفسیر، جن کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

③ مذہب فاسد کے مطابق تفسیر کرنا، بایں طور کہ مذہب کو اصل اور تفسیر کو تابع بنا دیا جائے کہ جس طرح ممکن ہو تفسیر کو مذہب فاسد کے موافق کر دیا جائے، اگرچہ وہ تفسیر ضعیف ہو۔

④ بغیر کسی دلیل کے قطعی طور پر کسی تفسیر کو اللہ تعالیٰ کی مراد ٹھہرا دینا۔

⑤ اپنی خواہش وہوس کے پیشِ نظر تفسیر بیان کرنا۔"

یہ تمام اقوال میں نے (علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی) "الإتقان" سے منتخب کیے ہیں۔

راقم الحروف کہتا ہے: (اس حوالے سے) میرے نزدیک قول فیصل وہ ہے جو امام خازن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور شنید ہے کہ ہمارے شیخ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس قول کو پسند فرمایا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں اپنی رائے سے تفسیر کرنے کے متعلق جو ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے، یہ ممانعت اس شخص کے حق میں ہے جو اپنے دل کی مراد اور اپنی من چاہی تاویل وتفسیر بیان کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص یا تو علم رکھتا ہوگا یا نہیں؟ اگر علم رکھتا ہے تو یہ اس شخص کی طرح ہوگا جو قرآن کی بعض آیات کو اپنی کسی بدعت کی درستگی کے لیے دلیل بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آیت کی مراد کچھ اور ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی بدعت کی تصحیح کے لیے آیت کے ذریعے اپنی دلیل کو قوی قرار دے کر مخالف فریق کو التباس میں مبتلا کر دے۔ جیسے فرقۂ باطنیہ، خوارج اور دیگر بدعتی فرقوں نے اپنے فاسد مقاصد کی تکمیل کے لیے یہ وطیرہ اختیار کیا؛ تاکہ لوگوں کو دھوکہ وفریب میں مبتلا کریں۔ اور اگر قرآن میں یہ رائے زنی بغیر علم کے محض جہالت سے ہو، بایں طور کہ آیت کئی احتمال رکھتی ہو اور وہ شخص (قرائن سے صرف نظر کرتے ہوئے) ان احتمالات کے علاوہ کسی اور انداز میں آیت کی تفسیر وتشریح کرے، یہ دونوں ہی طرز، غلط اور قابل مذمت ہیں۔ اور دونوں اس ممانعت اور وعید میں داخل ہیں جو (قرآن کریم میں رائے زنی کرنے کے بارے میں) وارد ہوئی ہے۔

البتہ تاویل یہ ہے کہ استنباط واجتہاد سے آیت کو اس کے موافق ایسے معنی کی طرف پھیر دیا جائے کہ آیت کا سیاق وسباق اس معنیٰ کا احتمال بھی رکھتا ہو اور وہ معنی قرآن وسنت کے مخالف بھی نہ ہو۔ علماء کرام نے اس تاویل میں رخصت دی ہے؛ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی

تفسیر بیان فرمائی اور تفسیر کے سلسلے میں ان کے درمیان اختلاف بھی واقع ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیان کردہ تمام تفسیری اقوال، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنے ہوئے نہ تھے، بلکہ وہ اپنے فہمِ قرآنی کے بقدر تفسیر بھی فرمایا کرتے تھے (اور یہی وہ تاویل ہے، جس کے متعلق) حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے باقاعدہ یوں دعا فرمائی:

"اللّٰهم فقّهه في الدين وعلّمه التأويل."

ترجمہ: "(اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور (قرآن کی تفسیر و) تاویل کا علم عطا فرما)۔"

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ تفسیری روایات انہی سے منقول ہیں۔

(مقدمہ تفسیر خازن)

ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے "صحیح بخاری" کی "امالی" (فیض الباری: ۴/ ۱۵۰) میں فرمایا ہے:

"اگر کسی شخص کی (اپنی رائے کے مطابق بیان کردہ) تفسیر سے کوئی متفق ومجمع علیہ مسئلہ تبدیل نہ ہوتا ہو، اسی طرح سلف صالحین کے متفقہ عقائد میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی ہو تو ایسی تفسیر اس ممنوع تفسیر بالرائے میں شمار نہ ہوگی۔ البتہ اگر کسی متفقہ متواترہ مسئلہ میں تبدیلی آجائے یا مقررہ عقیدے میں کوئی تبدیلی واقع ہو، تب یہ تفسیر 'ممنوعہ تفسیر بالرائے' میں شمار کی جائے گی، نیز ایسی رائے زنی کرنے والا جہنم کا مستحق ہوگا۔ یہ بات کہ تفسیر 'تفسیر بالرائے' کے زمرے میں داخل نہ ہو، اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ مفسرین کرام کے طرز وطریق سے خوب واقفیت حاصل نہ کرلی جائے، تب مفسرین نے اپنی بلند پایہ ذہانت اور صحیح فکر کی روشنی میں جو تفسیر بیان فرمائی، اس کے متعلق کسی قسم کا قلق وتردد نہ ہوگا اور جو شخص

بھی کتب تفاسیر کا مطالعہ کرے گا، وہ ان کو مفسرین کی آراء سے بھرا ہوا پائے گا، بھلا علماء کرام کو سیاق وسباق میں تأمل وتدبر کرکے، الفاظ ونصوص کے حقائق میں غور وفکر کے ساتھ سلف صالحین کے عقائد کی رعایت رکھتے ہوئے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے سے کس نے روکا ہے؟! جبکہ قرآن کریم سے اہل علم کا یہی حصہ ہے اور یہ علماء کرام ہی ہیں جو قرآنی عجائبات میں غور وتدبر کرتے ہیں، اس کے دقیق مفاہیم سے پردے اٹھا سکتے ہیں اور اس کے پوشیدہ حقائق خزینوں کو آشکارا کرسکتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ تفسیر بالرأی تو اہل علم کا خاصہ اور علمائے مجتہدین کا حصہ ہے۔ البتہ جو شخص معاون اسباب تفسیر کی رہنمائی کے بغیر تفسیر قرآن کرے، نہ تو وہ سلف وخلف کے عقائد کا علم رکھتا ہو اور نہ اسے عربی زبان کا ذوق حاصل ہو، بلکہ بے وقوف اور ناخلف لوگوں میں سے ہو اور اس کو قرآن کی تفسیر بیان کرنے پر اس کی رسوائی اور قلت علم، بلکہ جہالت نے برانگیختہ کیا ہو تو ایسے شخص پر افسوس صد افسوس! اور ایسا آدمی تو دوزخ کا مستحق ٹھہرے گا۔"

علامہ ثعلبی جزائری رحمۃ اللہ علیہ نے "الجواهر الحسان" (۱/ ۱۲) میں پہلی حدیث کی تشریح میں عمدہ بحث فرمائی ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

"ومعنى هذا: أن يسأل الرجل عن معنى في كتاب الله، فيتسوّر عليه برأيه دون نظر فيما قال العلماء، أو اقتضته قوانين العلوم، كالنحو، والأصول، وليس يدخل في هذا الحديث أن يفسر اللغويّون لغته، والنحاة نحوه، والفقهاء معانيه، ويقول كلّ واحد باجتهاده المبنيّ على قوانين علم ونظر؛ فإن هذا القائل على هذه الصفة ليس قائلا بمجرّد رأيه، وكان جلّة من السلف، كسعيد بن المسيّب وعامر الشّعبيّ وغيرهما يعظّمون تفسير القرآن،

ويتوقّفون عنه تورّعًا واحتياطًا لأنفسهم، مع إدراكهم وتقدّمهم، وكان جلّة من السلف كثير عددهم يفسّرونه، وهم أبقوا على المسلمين في ذلك، رضي الله عنهم أجمعين۔ "

ترجمہ: "کسی شخص سے قرآنی آیت کی تفسیر کے متعلق پوچھا جائے تو وہ بے دھڑک اپنی رائے پیش کردے، نہ علماء کرام کے کلام میں غور وخوض کرے، نہ علوم کے قوانین کے تقاضوں سے واقفیت رکھتا ہو، مثلاً: نحو اور اصول سے نابلد ہو، اہلِ لغت نے اپنی لغت، نحویوں نے اپنی نحو کی روشنی میں اور فقہاء نے فقیہانہ طرز پر قرآن کی تفسیر کے متعلق جو کلام فرمایا ہے، بایں طور کہ ہر جماعت، علم وفہم کے قوانینِ مقررہ کے پیش نظر اپنے اجتہادات سے تفسیر قرآن میں کلام کرے تو وہ اس حدیث میں داخل نہیں؛ اس لیے کہ ان اوصاف کا حامل محض رائے زنی نہیں کرتا۔ کبار اسلاف جیسے: سعید بن مسیب، عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات گرامی تفسیر قرآن کو قابل عظمت سمجھتے تھے اور تقویٰ واحتیاط برتتے ہوئے تفسیر قرآن سے توقف فرمایا کرتے تھے، باوجود اس کے کہ ان کا ادراک بھی بلند پایہ تھا اور فہم وفراست میں بھی وہ اپنے بعد والوں سے سبقت رکھتے تھے اور سلف ہی کی ایک کثیر تعداد قرآن کریم کی تفسیر کیا کرتی تھی اور اس حوالے سے انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک ذخیرہ چھوڑا ہے۔ رضي الله عنهم أجمعين۔"

مذکورہ بالا تمام اقوالِ اسلاف، صاحب بصیرت شخص کے لیے کافی ہیں، واللہ الموفق۔



تفسیرِ قرآن میں صوفیاء کے اقوال

فرقۂ باطنیہ اور صوفیاء کی تفسیری تاویلات میں فرق

مذکورہ مباحث کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل زیغ وضلال فرقہ باطنیہ کے بارے میں ایک ضروری انتباہ درج کر دیا جائے، جو بعض صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال سے سہارا لے کر دین سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں، جیسے تیر پھینکنے کے بعد کمان سے علیحدہ ہو جایا کرتا ہے اور آیات قرآنیہ میں علم و دلیل کے بغیر تحریف کرتے ہیں، نیز دلائل و براہین کے بغیر مقررہ مسائل کو اپنی جگہوں سے تبدیل کر دیتے ہیں۔

چنانچہ خوب جان لینا چاہیے کہ علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''العقائد النسفیة'' میں لکھا ہے:

''نصوص کو ان کے ظاہر ہی کے موافق رکھا جائے اور ظاہری معانی سے صرف نظر کرتے ہوئے فرقۂ باطنیہ کے بیان کردہ باطنی معانی کی طرف عدول، الحاد اور زندقہ ہے۔''

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

''ملاحدہ کو ''باطنیہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے دعوے دار ہیں کہ نصوص اپنے ظاہری معانی کے مطابق نہیں، بلکہ ان کے ایسے باطنی و پوشیدہ معانی ہیں جنہیں معلم خاص کے علاوہ کوئی شخص نہیں جانتا، (اس دعویٰ سے) درحقیقت ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کی بالکلیہ نفی کر کے اسے معدوم ٹھہرا دیا جائے۔''

مزید لکھتے ہیں:

''وأما ما يذهب إليه بعض المحققين من أن النصوص على ظواهرها، ومع ذلك فيها إشارات خفية إلى دقائق تنكشف على أرباب السلوك يمكن التطبيق بينها وبين الظواهر المرادة، فهو من كمال الإيمان ومحض العرفان.''

''بعض محققین کا یہ کہنا کہ نصوص اگرچہ اپنے ظاہری معانی ہی بتلاتی ہیں، لیکن ان ظاہری نصوص میں کچھ ایسے چھپے ہوئے باطنی اشارات ہوتے ہیں جو ایسے باریک اور لطیف امور کا پتہ دیتے ہیں جو اہل سلوک و متصوفین پر واضح ہوتے ہیں، نیز ان دقیق اشارات اور ظاہری مرادی معانی میں باہم تطبیق بھی ممکن ہوتی ہے، یہ پہلو ایمان کے کمال اور محض معرفت و بصیرت کا نتیجہ ہے۔''

علامہ تاج الدین بن عطاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''لطائف المنن'' میں رقم طراز ہیں:

''جان لیجیے کہ ان صوفیائے کرام سے اللہ اور رسول کے کلام کی تفسیر کے بارے میں جو انوکھے معانی منقول ہیں، یہ ظاہری معنی نص کے ظاہر کو پھیرنا نہیں کہلائے گا، بلکہ ظاہر آیت سے تو وہ معنی سمجھا جائے گا جس کے لیے آیت ذکر کی گئی ہے اور جس معنی پر اہل زبان کا عرف جس مفہوم اور مطلب پر دلالت کرتا ہے، جبکہ آیات قرآنی اور احادیث شریفہ کے باطنی اور مخفی معانی کی طرف اس شخص کی رہبری و رہنمائی ہوتی ہے جس کے دل کو خدائے پاک نے انشراح کی دولت سے نوازا ہو۔ حدیث شریف میں بھی اس مضمون کا باقاعدہ ذکر وارد ہوا ہے: ''لكل آية ظهر وبطن'' یعنی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ چنانچہ ناقد اور معترض کا یہ کہنا کہ: ''باطنی اشارات کا بیان تحریفِ قرآن وحدیث کے مترادف ہے۔'' آپ کو ان

حضرات صوفیاء کے اقوال سے مستفید و مستفیض ہونے سے ہرگز نہ روکے، یہ تحریف ہرگز نہیں ہے، تحریف تو اس وقت ہوتی جب یہ حضرات یوں دعویٰ فرماتے کہ: "اس آیت کے یہی معنی ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی معنیٰ نہیں۔" اور صوفیائے کرام تو یہ دعویٰ ہی نہیں کرتے، بلکہ ظاہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے موضوع معانی کو مصداق جانتے ہوئے ان باتوں کا ادراک فرما لیتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ ان کو سمجھاتے اور سکھاتے ہیں۔"

یہ عبارت صاحب "الإتقان" علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔

راقم الحروف عرض گزار ہے کہ اس مضمون کے متعلق مروی کئی احادیث بیان کردہ مفہوم کی تائید کرتی ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان: "لا تنقضي عجائبه، ولا تبلغ غايته" (اس قرآن کے عجائبات ختم نہ ہوں گے اور اس کی انتہا تک نہیں پہنچا جا سکتا) اسی طرح یہ ارشاد کہ: "فيه نبأ ماقبلكم وخبر ما بعدكم" (اس میں تم سے پہلے اور بعد کے لوگوں کی خبریں ہیں) اور یہ فرمان گرامی: "إن القرآن ذو شجون وفنون وظهور وبطون" (بلاشبہ قرآن کریم تہہ در تہہ تفصیلات کا حامل اور ظاہری معانی و باطنی حقائق پر مشتمل ہے) اور دیگر کئی مرفوع و موقوف روایات اس مضمون کی تائید کرتی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان: "أو فهمٍ أعطيه رجلٌ مسلم" (یا وہ فہم جو کسی مسلمان کو دیا گیا ہو)۔ جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "كتاب العلم" میں نقل فرمایا ہے۔ اس حوالے سے واضح ترین دلیل ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ماقبل میں گزر چکا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کے ارشادات بھی میں نے ماقبل میں ذکر کر دیئے ہیں (ان کو دوبارہ دیکھ لیا جائے)۔

اگر قرآنی علوم و مقاصد صرف اس کے ظاہری الفاظ کے مفاہیم میں منحصر ہوتے، اہل حقائق کے دقائق و لطائف نہ ہوتے اور نہ ہی وہ مخفی اشارات و معارف ہوتے جن پر قرآنی مفہوم دلالت کرتا

ہے اور قرآن کریم کی بلاغت ان کا پتہ دیتی ہے، (اگر یہ نکات قرآن کریم میں نہ پائے جاتے) تو کسی عالم کو دوسرے عالم پر، کسی پیش رو کو بعد میں آنے والے پر اور بعض متأخرین کو بعض متقدمین پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہوتی، تب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا بھلا کیا مقصد ہوتا؟!: "وأعمقهم علمًا" (یعنی وہ صحابہ رضی اللہ عنہم علم کے اعتبار سے زیادہ گہرے تھے)۔

(مذکورہ تفصیل سے یہ) معاملہ واضح ہوگیا اور ان دونوں قسم کی تاویلات میں فرق منکشف ہوگیا اور اہل حقائق ان لطائف وتاویلات قرآنی کو بیان کرتے رہے ہیں، جو آیات کے ضمن میں پوشیدہ ہیں، اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ منقول نہیں کہ انہوں نے (قرآن کریم کے) ظاہری معانی پر عمل اور اعتقاد چھوڑ دیا ہو، پھر صبح روشن کی مانند یہ معاملہ ان معترضین سے کیونکر مخفی رہا؟!

حالانکہ صوفیائے کرام تو علم الٰہی میں رسوخ رکھتے ہیں اور اعمال میں سچے اور مخلص ہوتے ہیں، ان کے برخلاف ملحد فرقۂ باطنیہ، شریعت اسلامیہ کے منکر، آیاتِ قرآنیہ کے ظاہری معانی کو پھیرنے والے، علم میں کج رو اور گمراہ اور عمل میں جھوٹے ہیں، ان اولیاء وصوفیاء کرام کی کیا بلند و بالا شان اور ان باطنیوں کا درجہ کیسا گرا ہوا؟! ان میں سے ہر ایک کو واضح علامات سے آپ پہچان لیں گے۔ اللہ رب العزت نے اس باطنی گروہ جیسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

"فَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَـٰبَهَ مِنْهُ ٱبْتِغَآءَ ٱلْفِتْنَةِ وَٱبْتِغَآءَ تَأْوِيلِهِۦ." (آل عمران: ۷)

ترجمہ: "سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ اس کے اسی حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے، (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کا (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے۔"

''أَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهِ أَهْدٰى أَم مَّن يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔'' (الملک:۲۲)

ترجمہ: ''(پس اس کافر کے متعلق سوچو کہ) جو شخص منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو، وہ منزل مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا یا وہ شخص جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو؟!۔''

وَلَيْسَ يَصِحُّ فِي الْأَفْهَامِ شَيْءٌ إِذَا احْتَاجَ النَّهَارُ إِلٰى دَلِيْلِ

ترجمہ: ''جب دن کے وجود پر بھی دلیل کی ضرورت ہو تو ایسی عقل و فہم کے نزدیک تو کوئی بھی بات درست نہیں قرار پائے گی۔''

اس بحث کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے (علامہ مرتضی زبیدی رحمۃ اللہ علیہ کی) ''الإتحاف شرح الإحياء'' (جزء رابع) کی مراجعت کرلی جائے، اللہ تعالیٰ ہی حق کی طرف رہبری کرنے والے ہیں۔

وصلى الله تعالى على سيدنا ومولانا خير خلقه محمد وآله وصحبه وتبعه أجمعين!



چند گراں قدر مفید تفاسیر

مقدمہ ٔ ہذا کے اس موضوع کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبین علم وحق کی (علمی) بیداری اور بصیرت افروزی کے لیے چند معتمد تفاسیر کے نام درج کر دیئے جائیں، جن کا مطالعہ کافی حد تک دیگر تفاسیر سے مستغنی کر دیتا ہے، لیکن بہر حال یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر تفسیر کی ایک امتیازی خصوصیت ہوتی ہے، جس میں کوئی دوسری تفسیر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور بہت کم ہی کوئی تفسیر کسی دوسری تفسیر کے خلا کو پُر کرتی ہے؛ اس لیے کہ ہلکی بارش، کشادہ وادی میں کیونکر نفع مند ہوسکتی ہے؟! نیز گڑھے کا پانی لبالب ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا کہاں مقابلہ کر سکتا ہے؟! اور پھوار کو موسلا دھار بارش سے کیا نسبت؟! بنا بریں ہر تفسیر ایسی امتیازی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے، جو دوسری کسی تفسیر میں نہیں پائی جاتیں، ایک ہی علم کی کوئی کتاب دوسری کتاب سے مستغنی نہیں کرتی، اگر چہ پچھلے دور کا کوئی عالم، اگلے زمانے کی صاحبِ علم کے تفسیری مباحث کو ہی کیوں نہ نقل کرے، بلکہ کوئی ایک ہی کتاب کی تلخیص واختصار کرے، تب بھی اصل کتاب کی مراجعت کے سوا چارہ کار نہ ہوگا، اس بات کے لیے ہمارا قطعی تجربہ کافی ہے، جب کہ ذوق سلیم بھی یہی کہتا ہے اور اس پر دلائل بھی واضح ہیں، اِلا ماشاء اللہ (یعنی بعض کتابیں ایسی ضرور ہیں کہ جن میں فاضل مؤلفین نے ایسے اعلیٰ کمالات دکھلائے کہ اختصار و بسط اور اجمال وتفصیل میں چنداں فرق نظر نہیں آتا)۔

(البتہ ان تفاسیر میں تفاصیل ومباحث کا اختلاف عین ممکن ہے؛) کیونکہ اختلافِ آراء اور طبائع وافکار کا باہمی اختلاف وتناقض روزِ روشن سے زیادہ واضح ہے اور ہر شخص کی ضروریات دوسرے

شخص سے مختلف ہوا کرتی ہیں، ضروریات کی جہتیں بہت کم ہی یکساں ہوتی ہیں، اسی طرح آرا ومزاج میں کلی طور پر اتفاق بھی بہت کم ہی ہوا کرتا ہے، کتنی چیزیں ایسی ہیں کہ ایک شخص ان کا محتاج ہوتا ہے اور دوسرا اس سے مستغنی، بہت سے کلمات والفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک مصنف انہیں توجہ دیتا ہے، اور دوسرا ان کو لائق التفات ہی نہیں جانتا، لہٰذا جو شخص قرآنی علوم کی رغبت رکھتا ہو اور اس میں بصیرت کاملہ اور مہارت کا خواہاں ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس موضوع پر تمام دستیاب مواد اور تالیف کردہ تفاسیر کا مطالعہ کرے؛ اس لیے کہ بہر حال علم تفسیر عمدہ ترین موضوع ہے، خاص طور پر وہ فوائد جو اسلاف محققین اور راسخ علمائے متقدمین نے تحریر فرمائے ہیں، اگر چہ وہ ایک یا دو سورتوں بلکہ ایک یا دو آیت ہی کے متعلق کیوں نہ ہوں اور اس کے لیے ان کی تفاسیر کے علاوہ دیگر علوم وفنون میں ان کی تحریر کردہ تصنیفات تلاش کرے اور گم شدہ قابل قدر قیمتی شئ کی مانند ممکنہ مقامات میں ان کی کھوج کرید کرے؛ کیوں کہ قرآن کریم کی کتنی ہی مشکل مباحث ایسی ہوتی ہیں کہ ایک محقق، کتب تفسیر کے علاوہ دیگر کتب میں ان کا حل پالیتا ہے اور جس جگہ امید بھی نہ ہو، وہاں ان مشکلات کو سمجھ لیتا ہے اور اس طرح کے بکھرے ہوئے لعل وجواہر، محققین اسلاف کی کئی کتب میں پائے جاتے ہیں، جن میں درج ذیل نام سرفہرست ہیں:

① امام حجۃ الاسلام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، (متوفی ۵۰۵ھ)

② حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، (متوفی ۷۵۱ھ)، حافظ موصوف ان اہل علم میں بہت سی حدیں عبور کرنے والے شہسوار ہیں، شاید ہی ان کی کوئی کتاب کسی آیت کی تفسیر سے خالی ہو۔

③ حافظ ابن تیمیہ الحرانی رحمۃ اللہ علیہ، (متوفی ۷۲۷ھ)، یہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ اور دریائے علوم ہیں۔

④ شیخ ابوالقاسم سید شریف مرتضی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کتاب "الأمالي" (۳ حصے) (متوفی ۴۳۶ھ)۔

⑤ محقق وزیر یمانی رحمۃ اللہ علیہ "إیثار الحق علی الخلق"، "العواصم والقواصم" اور "الروض الباسم" جیسی کتاب کے مصنف موصوف، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر ہیں۔

⑥ شیخ بہاء الدین سبکی بن تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ، موصوف، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر بزرگ ہیں، ان کی کتاب "عروس الأفراح" (بھی مختلف آیات کی تفسیری مباحث پر مشتمل) ہے۔

⑦ امیر یحییٰ بن حمزہ یمنی رحمۃ اللہ علیہ نے "الطراز" میں کئی فوائد تحریر فرمائے ہیں اور یہ نویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی دیگر کئی اکابرین امت وعلمائے ملت ہیں، جن کے علوم کے گرد امت کی چکی گھومتی ہے (گویا وہ اس امت کی چکی کے قطب اور پاٹ ہیں، انہوں نے تفسیری فوائد بکھرے انداز میں اپنی کئی کتب میں تحریر فرمائے ہیں)۔

کچھ عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اگر خدائے پاک کی توفیق شامل حال ہوئی تو یہ بکھرے موتی مذکورہ اکابر علما کی کتب سے جمع کر کے ان کو ایک لڑی میں پرو دوں، اس کا اظہار میں نے اس لیے کر دیا؛ تا کہ باتوفیق لوگ اس اہم خدمت کے متعلق غور وفکر فرماویں، واللہ الموفق۔ (۱)

چار متداول تفاسیر

چونکہ یہ موہوم زندگی بہت محدود ہے اور ضروریات وخواہشات طویل ہیں، ہمتیں سست اور عزائم پست ہیں، خیالات وافکار کو خواہشات نے مختلف وادیوں میں بہا دیا ہے اور کوششیں خاک ہو رہی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اپنے عزیز طلباء کو ان مطبوعہ تفاسیر میں سے۔ جو اہل علم حضرات کے

---

(۱) مولانا اویس نگرامی نے (اپنے گرامی نامے) میں مجھے لکھا ہے کہ آپ کی یہ تحریر پڑھ کر آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس حوالے سے حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں بکھرا ہوا مواد یکجا کر لیا ہے اور پھر ان فوت شدہ مواد کا شیخ حامد فقی مصری کی کتب سے اضافہ کیا اور یہ کتاب "التفسیر القیّم من کلام ابن القیّم" کے نام سے قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔

ہاں مشہور اور رائج ہیں۔ چند ایسی تفاسیر کی جانب متوجہ کروں کہ اگر کوئی انہی پر قناعت کرنا چاہے تو وہ کافی ہو جائیں اور صرف انہی نہروں اور دریاؤں سے پی لے تو سیراب ہو جائے اور ان شاء اللہ یہ تفاسیر خوب سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں دیگر تفاسیر سے مستغنی کر دیں گی اور میرے نزدیک ایسی تفاسیر چار ہیں:

①تفسیر ابن کثیر

یہ حافظ عماد الدین ابن کثیر شافعی دمشقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تحریر کردہ تفسیر ہے، جو علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اجل تلامذہ میں سے ہیں، موصوف کی یہ تفسیر "تفسیر ابن جریر" سے مستفاد (اور گویا اس کا خلاصہ واختصار) ہے، محدثین کی تفاسیر میں روایت ودرایت کے اعتبار سے کوئی اس تفسیر کے مقابل نہیں، ہمارے حضرت شیخ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے مستغنی کرنے والی ہے تو وہ "تفسیر ابن کثیر" ہے، جو "تفسیر ابن جریر" سے مستغنی کر دیتی ہے۔"

②مفاتیح الغیب

"التفسیر الکبیر" کے نام سے معروف ہے، یہ امام کبیر محقق فخر الدین ابن خطیب رازی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر ہے، ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

"میں نے مشکلاتِ قرآن میں سے کوئی مشکل ایسی نہ پائی جس کا حل امام موصوف نے اس تفسیر میں بیان نہ فرمادیا ہو۔"

نیز یوں بھی فرمایا کرتے تھے:

"امام موصوف، حل مشکلات کے دریا میں غوطہ زنی کرتے ہیں، اگرچہ بعض مشکلات کا وہ قابل اطمینان اور دل لگتا حل پیش کرنے میں کامیاب نہیں بھی ہوتے۔"

نیز شیخ رحمۃ اللہ علیہ یوں بھی کہا کرتے تھے:

اس تفسیر کے متعلق جو کہا گیا ہے: "فيه كُلُّ شيء إلا التفسير" (اس میں تفسیر کے علاوہ ہر چیز ہے) صاحب "الإتقان" علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی کا یہ جملہ نقل فرمایا ہے، یہ اس تفسیر کی جلالت قدر اور بلندیِ منزلت کو گھٹانے کے واسطے کہا گیا ہے، شاید یہ ایسے شخص کا قول ہے جس کو لطائف و معارف قرآنی سے دلچسپی نہیں اور صرف تفسیری روایات کا ذکر اس پر غالب ہے۔"

③ روح المعاني

یہ تفسیر، تیرھویں صدی ہجری کی نابغۂ روزگار شخصیت، مفتیِ بغداد اور اپنے وقت کے بڑے عالم سید محمود آلوسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کردہ ہے، اس کی گرانمایہ خصوصیات اور بلند پایہ محاسن، دل و دماغ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ میرے نزدیک مواد کی کثرت، واضح تعبیرات اور تحریر کی عمدگی میں مذکورہ تفسیر (شروحِ حدیث میں) علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی "فتح الباری" کی مانند ہے، لیکن "فتح الباری" کلامِ مخلوق کی تشریح و تفصیل ہے، اس لیے اس نے صحیح بخاری کی شرح کی گراں ذمہ داری سے امت مرحومہ کو آزاد کر دیا اور گویا صحیح بخاری کا حق ادا کر دیا، جب کہ خدائے کریم کا مبارک کلام اس بات سے بہت بالا و برتر ہے کہ کوئی بشر کامل طور پر اس کا حق ادا کر سکے، اگرچہ اپنی پوری ہمت و عنایت بھی اس میں صرف کر دے۔

④ إرشاد العقل السليم إلى مزايا القرآن الكريم

یہ مفتیِ سلطنت عثمانیہ، خطیب المفسرین، قاضی القضاۃ، علامہ ابو السعود حنفی محمد بن محمد العمادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۵۱ھ) کی بلند پایہ تفسیر ہے، جو نظم قرآنی کے اغراض و مقاصد کو بہترین پیرائے اور عجیب طرز تصویر سے نہایت خوش اسلوبی سے آشکارا کرتی ہے، نیز بہت سی خصوصیات میں علامہ زمخشری کی "الكشاف" سے مستغنی کرنے والی ہے۔

یہ چار کتبِ تفسیر ہوئیں، جن میں دو شافعی مسلک کے علماء کی، جب کہ دو حنفی علماء کی تحریر

کردہ ہیں اور جس مفسر کو فرصت نہ ہو تو امید ہے کہ وہ ان چاروں تفاسیر سے استفادہ کرنے کے بعد دیگر تفاسیر سے مستغنی ہو جائے گا۔

علامہ جوہری طنطاوی اور علامہ رشید رضا کی تفاسیر

اگر کوئی شخص جدید علوم وفنون کے متعلق معلومات کا شائق ہو اور قدرت کے تخلیقی کارناموں، تکوینی عجائبات اور قدرت خداوندی کے پیغامات کو جاننے کا خواہشمند ہو تو ان مذکورہ تفاسیر کے ساتھ علامہ جوہری طنطاوی کی "جواھر القرآن الکریم" کو بھی زیر مطالعہ رکھے، لیکن نقدِ حدیث کے متعلق ان کی رائے پر اعتماد مناسب نہیں ہے؛ اس لیے کہ بسا اوقات وہ محض اپنی رائے پر اعتماد رکھتے ہوئے شرائطِ نقد کو ملحوظ رکھے بغیر تنقید کرتے ہیں، یہ نکتہ ہم نے اپنے شیخ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے۔

اور اگر عصری اسلوب میں قرآنی اغراض ومقاصد کی راہنمائی کی خواہش ہو تو علامہ رشید رضا مرحوم کی تفسیر "المنار" کو بھی مذکورہ تفاسیر کے ساتھ ملا لے، مگر (اس کتاب کے حوالے سے یہ پہلو پیش نظر رہے کہ موصوف کے تمام خیالات وآرا پر اعتماد مناسب نہیں ہے اور جن مقامات پر مؤلف کے شیخ (محمد عبدہ) یا خود ان کے قلم نے مسلک اہلِ حق سے روگردانی اختیار کی ہے، ان مقامات میں انتخاب اور تنبیہات کی ضرورت ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ان دونوں تفاسیر "الجواھر" اور "المنار" کا گدلا مواد (قابل اعتراض مقامات) ان کے خالص اور صاف ستھرے حصے سے استفادے میں مانع نہیں ہونا چاہیے اور ان سے استفادہ کرنے والے کو اس وقت حماسہ ابوتمام کا یہ شعر پیش نظر رکھنا چاہیے:

وَلَا یَغُرَّنَّكَ صَفْوٌ أَنْتَ شَارِبُهُ   فَرُبَّمَا كَانَ بِالتَّكْدِيْرِ مُمْتَزِجًا

ترجمہ: "تمہیں صاف پانی کا پینا دھوکہ میں مبتلا نہ کر دے؛ بسا اوقات یہ صاف پانی بھی گدلے پانی میں ملا ہوا ہوتا ہے۔"

اسی طرح حماسہ کا یہ شعر بھی قابلِ توجہ ہے:

قَدِّرْ لِرِجْلِكَ قَبْلَ الْخَطْوِ مَوْضِعَهَا فَمَنْ عَلَا زَلَقاً عَنْ غِرَّةٍ زَلَجَا

ترجمہ: ”اپنے پیر پڑنے کی جگہ کو قدم رکھنے سے قبل خوب اچھی طرح جانچ لو؛ اس لیے کہ غفلت میں پھسلن پر پاؤں پڑ گیا تو لڑھک جائے گا۔“

چند مختصر اور مفید تفاسیر

جو طالب علم مذکورہ تفاسیر سے بھی مختصر تفسیر چاہتا ہو تو وہ شیخ محقق نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ”غرائب الفرقان“ اور تفسیر ابوالسعود (جس کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا) کو دیکھے، اول الذکر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کا بہترین خلاصہ اور مزید فوائد کی حامل ہے۔ عدیم الفرصت شخص کے لیے مقاصدِ قرآنی کو سمجھنے کی غرض سے یہ دونوں تفاسیر کافی ہیں یا پھر ”تفسیر ابن کثیر“ اور ”الکشاف“ کی مراجعت کرے اور جو شخص صرف ایک ہی تفسیر پر قناعت کرنا چاہے تو اگرچہ وہ کسی شمار میں بھی نہ آئے گی اور گویا بہتی ہوئی نہر میں سے نہایت قلیل پانی کی مانند ہوگی (لیکن بہر کیف) اگر مفصل تفسیر کی چاہت ہو تو ”روح المعاني“ کا مطالعہ کرے؛ کیونکہ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ روایات کا خلاصہ و نچوڑ بیان کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ درایتی و بلاغی مباحث بھی ذکر فرماتے ہیں اور اگر ایک مختصر و ملخّص تفسیر مطلوب ہو تو شیخِ عارف عبد الرحمن ثعلبی جزائری رحمۃ اللہ علیہ کی ”الجواهر الحسان“ کا مطالعہ کرے، یہ تفسیر مختصر بھی ہے اور انتہائی مفید بھی، اس میں علامہ موصوف نے نہایت خوش اسلوبی سے امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کی تلخیص فرمائی ہے اور مختلف علوم سے متعلق تقریباً سو سے زائد کتابوں سے حاصل کردہ فوائد کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کل آٹھ تفاسیر ہوئیں، اگر کوئی چاہے تو اس سے زائد (تفاسیر) کا بھی مطالعہ کرلے؛ اس لیے کہ (علم تفسیر کا) موضوع تو پورا ہی خیر سے بھرپور ہے۔

ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ و فوائدِ عثمانی

اگر کسی کو ہندوستان کی زبان اردو میں نظم قرآنی کی سمجھ حاصل کرنی ہو اور اردو بھی دلنشین اسلوب اور فصیح ترین تعبیرات سے مزین مطلوب ہو تو وہ ہمارے حضرت شیخ المشائخ مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۳۹ھ)، (جو شیخ الہند کے نام سے مشہور ہیں) کے ترجمہ کا مطالعہ کرے، جس پر ہمارے حضرت شیخ، عصر حاضر کے محقق مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے تحریر کردہ تفسیری فوائد ہیں؛ اس لیے کہ ان دونوں حضرات نے نظم قرآنی کے مقاصد واغراض کو نہایت عمدہ پیرائے میں سمجھایا ہے کہ گویا سارے فوائد قیمتی لعل و جواہر اور قابل قدر و رفعت گراں مایہ موتی ہیں اور کبھی کبھار مذکورہ ضخیم جلدوں اور اس بھرپور تفسیری مواد سے بھی جو مشکل گرہیں نہیں کھلتیں، ان فوائد کی مختصر عبارات اور لطیف اشارات میں واضح طور پر مل جاتی ہیں، اللہ کریم ان حضرات کو ان کی محنتوں کا صلہ عطا فرمائے، آمین! ان تفسیری فوائد سے فضلائے زمانہ بھی کسی صورت مستغنی نہیں، چہ جائیکہ طلباء کرام اپنی طالب علمی کے دور میں، مطبوع عربی تفاسیر میں سے کوئی تفسیر بھی ان فوائد کے قائم مقام یا بدل کا کردار ادا نہیں کرسکتی، میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ یہ تفسیری فوائد سلف کی (تمام) تفاسیر سے مستغنی کرتے ہیں، بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح دیگر تفاسیر سے یہ فوائد مستغنی نہیں کرسکتے، اسی طرح دیگر تفاسیر بھی ان سے مستغنی نہیں کرسکتیں۔



چند مطبوعہ تفاسیر کی خصوصیات وامتیازات

مفید تفاسیر کے موضوع سے متعلق۔جن کا یہاں تذکرہ جاری ہے۔میں نے ایک محاضرہ پیش کیا تھا،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے نزدیک مطبوعہ کتب تفسیر کی پانچ اقسام ہیں:

① علماء وائمہ عربیت کی تفاسیر

جیسے:"الكشاف"اور"تفسير أبي السعود"،اسی طرح"الكشاف" سے اختصار کردہ"تفسیرالبیضاوي"اور"تفسیر المدارك"،امام ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر"البحر المحیط" اور"النهر المادّ من البحر المحيط"اور"الدر اللقيط من البحر المحيط۔"

تفسیر"الکشاف" کی خصوصیات کے متعلق میں نے اپنے محاضرے میں کافی بحث کی اور اس کے فوائد بھی بتلائے ہیں،ساتھ ساتھ مسلک اعتزال کے حوالے سے علامہ زمخشری کا تعصب، اہل سنت پر طعنہ زنی،ان پر جبر وحشو کے اتہام،ان کے متعلق سخت کلام،یہاں تک کہ دشنام طرازی وسب وشتم اور اپنے زہد اور پرہیزگاری کے باوجود بعض علمی جوابات میں زبان درازی کے متعلق بھی میں نے خوب وضاحت کی ہے،اللہ کی قدرت بھی بڑی عجیب ہے جو (گوناگوں) مزاجوں کو تقسیم کرنے والا اور طبائع کا خالق ہے،اور میں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ان کے بعد آنے والا کوئی بھی مفسّر،جس نے علامہ زمخشری ہی کے کلام کو مختصر وملخص کیا ہو،یا الفاظ کا تغیر اور بعض تعبیرات کا اضافہ ہی کیا ہو،ان کا قائم مقام نہیں بن سکا۔

تفسیر"الکشاف" کے بعد عمدہ ترین تفاسیر میں سرفہرست علامہ ابوسعود رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر

”إرشاد العقل السليم إلى مزايا القرآن الكريم“ ہے؛اس لیے کہ موصوف نے اس میں بعض پہلوؤں سے کچھ ایسے فوائد ومسائل بیان فرمائے ہیں جو”کشاف“ سے اضافی ہیں۔ بہر حال علمائے لغت اپنی تفاسیر میں علامہ زمخشری کے مرہون منت ہیں، اور ان کی تفاسیر کا تانا بانا اسی سے بُنا گیا ہے۔

مذکورہ تفاسیر کے علاوہ شیخ عبدالرحمن جزائری ثعالبی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر”الجواهر الحسان“ کے متعلق بھی میں نے اپنا تعریفی تاثر پیش کیا ہے، انہوں نے اس کتاب میں امام ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا خلاصہ ونچوڑ پیش کیا ہے اور مزید براں لگ بھگ سو کتب سے اس میں اضافات کیے ہیں، بہرکیف مذکورہ تفاسیر علماء لغت کی بہترین تفاسیر شمار کی جاتی ہیں اور علمی حلقوں میں رائج اور مطبوع ہیں۔

② محدثین کرام کی تفاسیر

① تفسیر ابن جریر

② تفسیر ابن کثیر

③ ”الدر المنثور في التفسير بالمأثور“

یہ تین تفاسیر محدثین کرام کی بقیہ تفاسیر سے مستغنی کر دینے والی ہیں۔

③ علمائے متکلمین کی تفاسیر

متکلمین کی تفاسیر میں سرفہرست تفسیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی ”مفاتيح الغيب“ اور اس کا خلاصہ ”غرائب الفرقان“ جو علامہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کی کاوش ہے، شمار کی جاتی ہیں اور اس موضوع پر قدیم ترین تفسیر امام اہلِ سنت علامہ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کی ”التاويلات“ ہے، جس کی شرح علامہ ابوبکر سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمائی ہے، اس کا عمدہ کتابت کے ساتھ بہترین نسخہ ”مکتبہ

الحرم المكي‘‘ میں دستیاب ہے، یہ انتہائی بلند پایہ تفسیر ہے اور علم کلام کی مفصل مباحث پر مشتمل ہے۔

④ فقہی تفاسیر

وہ تفاسیر جن میں فقہی احکام اور مذاہب فقہیہ کے مباحث کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، ان میں سرفہرست علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی ’’الجامع لأحكام القرآن‘‘ جس میں فقہی مباحث کے ساتھ ساتھ ادبی ولغوی بحثوں کا اہتمام بھی کم نہیں ہے۔ اسی طرح علامہ ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر بھی (فقہی رنگ سے مزین) ہے، جس میں علامہ موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل فقہیہ کو بیان فرما کر ان کے دلائل کے متعلق خوب شرح وبسط فرمائی ہے اور (اپنی دوسری کتاب) ’’الفصول في الأصول‘‘ گویا اس تفسیر کے لیے مقدمہ کے طور پر تصنیف فرمائی ہے، اس کا بہترین نسخہ قاہرہ کے سرکاری کتب خانے میں موجود ہے، اسی نسخہ کی ہم نے بھی نقل لی تھی، اسی طرح ہندوستان میں حیدرآباد دکن کے ’’إحياء المعارف النعمانية‘‘ کا منقولہ نسخہ بھی بہت عمدہ ہے۔ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ تو علم اصول، علم کلام، علم فقہ، علم حدیث میں وسیع المطالعہ محقق تھے۔

فقہی تفاسیر کی اس فہرست میں قاضی ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (’’پانی پت‘‘، دہلی کے اطراف میں واقع ہے) کی تفاسیر بھی قابل ذکر ہیں، قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کا نام اپنے مرشد، عارف باللہ حضرت (مرزا) مظہر جانِ جاناں نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر ’’التفسير المظهري‘‘ رکھا، فقہی مذاہب کی تحقیق کے متعلق یہ تفسیر عمدہ ترین تفاسیر میں شمار کی جاتی ہے اور دس مجلدات میں طبع کی گئی ہے۔

علامہ احمد جونپوری ہندی رحمۃ اللہ علیہ (معروف بہ ’’ملا جیون‘‘) کی ’’التفسيرات الأحمدية‘‘ بھی احکام کی مشہور آیات کی ہی تفسیر ہے۔

⑤ صوفیاء کرام کی تفاسیر

تفاسیر کی پانچویں قسم صوفیاء کرام کی تفاسیر ہیں، جیسے شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیریں، انہی کے مانند مہائمی ہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "تبصیر الرحمن" بھی ہے، جس میں نہایت نفیس مباحث ہیں، عراق کے مفتی، علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر "روح المعاني" میں مذکورہ پانچوں اقسام کو جمع کرنے کا ارادہ فرمایا، چنانچہ یہ سب سے جامع ترین تفسیر ہے، جو مذکورہ خصوصیات وامتیازات کی جامع ہے، نیز عبارت کی عمدگی اور ضبط میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی "فتح الباري" کی مانند ہے، لیکن اس تفسیر پر بھی ادبی اور کلامی رنگ غالب ہے اور چونکہ علامہ موصوف، متاخرین میں سے ہیں، اس بنا پر عصر حاضر کے مسائل ومشکلات کے ایسے مباحث بھی چھیڑے ہیں، جو اس کتاب کے علاوہ آپ کو نہیں ملیں گے اور بعض مقامات میں رازی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش کردہ اعتراضات کے جوابات پر بھی کچھ نقد ونظر فرمایا ہے، لیکن ان کے جوابات نہیں دیئے۔



قرآن کریم سے متعلق علمائے ہند، بالخصوص علمائے دیوبند کے نمایاں کارنامے اور اہل باطل واہل حق کی تفاسیر کی نشاندہی

اس مقام پر پہنچنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمائے ہند، خاص طور پر علمائے دیوبند کی قرآن وحدیث کے متعلق خدمات، شریعت اسلامیہ کے دفاع، برطانوی سامراج سے خلاصی اور آزادی وطن کی خاطر، علمی وعملی جد وجہد، حمیت اسلامی اور دینی غیرت کی تخم ریزی، ہندوستان کے عوام وخواص کے قلوب میں اسلامی عروج وترقی اور حریتِ وطن کی روح پھونکنا اور انہیں پردیسی دھوکہ باز خائن حکومت کے شکنجے سے بچانے کے سلسلے میں ان علماء کی خدمات کو آشکارا کروں، یہ تمام خدمات ان علمائے کرام کے بڑے احسانات ہیں، جو روز روشن سے زیادہ نمایاں ہیں، مرورِ زمانہ کے باوجود مؤرخین انہیں ہرگز فراموش نہ کرسکیں گے۔

ان جلیل القدر خدمات کے اظہار کا باعث یہ ہے کہ بلادِ عرب میں فروکش ہمارے بھائی ان حقائق سے ناواقف ہیں اور بعض اہلِ قلم وصحافی حضرات انصاف ودیانت داری کے ساتھ پڑوس کا حق ادا کرنے کے بجائے ارادتاً ان خدمات کے اخفا اور فریب دہی واتہام طرازی کا ظلم ڈھاتے ہیں۔ ہائے افسوس! کہاں گیا انصاف؟!! اور کدھر گئی دیانت؟!! انصاف ودیانت کو تو عنقائے مغرب لے اڑا، اور یوں بھی دور افتادہ بیابانوں تک لوگوں کی رسائی کم ہی ہوا کرتی ہے۔ البتہ ان تمام خدمات کی تفصیلات اس مقام پر ممکن نہیں، لہٰذا ہم چند خدمات کے تذکرہ پر اکتفا کریں گے، یہ گویا بجلی اور چمک ہیں، جو موسلا دھار بارش سے بھرے بادلوں کی طرف رہبری ورہنمائی کریں گی:

① علمائے ہند کے ان کارہائے نمایاں میں سے فارسی زبان میں تحریر کردہ تفسیر "البحر المواج" ہے، جو آٹھویں صدی ہجری کے اہلِ علم میں سے علامہ شمس الدین دولت آبادی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، موصوف قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

② شیخ علی بن احمد المہائمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۳۵ھ) کی چار جلدوں پر مشتمل عربی تفسیر "تبصیر الرحمن"، مہائم، بمبئی کے قریب ساحل سمندر پر واقع ایک شہر ہے، یہ تفسیر مصر میں طبع کی گئی ہے اور نہایت عمدہ اور نفیس تفسیر ہے، جس میں آیات اور سورتوں کے درمیان ربط اور نظم قرآنی کے موضوع کی جانب خاص توجہ دی گئی ہے اور دیگر کئی فوائد بھی اس تفسیر میں موجود ہیں۔

③ شیخ محدث و محقق قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی "التفسير المظهري" بھی عربی تفسیر ہے، قاضی صاحب، "حجة الله البالغة" کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں، یہ بھی نہایت عمدہ تفسیر ہے، خاص طور پر احکام ومسائل اور مختلف فقہی مذاہب کی تحقیق کے متعلق نفیس مباحث پر مشتمل ہے، یہ تفسیر حال ہی میں دس ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

④ ابو الفضل اور فیضی کی تفسیر "سواطع الإلهام"، جو نویں صدی ہجری کے ہندوستانی بادشاہ جلال الدین اکبر کی سلطنت اکبریہ کے علماء میں سے ہیں، انہوں نے قرآن کریم کی یہ تفسیر غیر منقوط حروف سے لکھی ہے اور اس کے متعلق خوب تکلف سے کام لیا ہے، جس کی بنا پر یہ تفسیر فی نفسہ بے فائدہ ہوگئی، لیکن اس قدر جدوجہد سے تحریر کردہ یہ تفسیر بہرحال قابل تعریف ہے، جو مؤلفین کی عربی زبان میں حذاقت ومہارت کی گواہی دیتی ہے، اس فن (یعنی غیر منقوط حروف کے استعمال) کو اخیر تفسیر تک برقرار رکھا ہے۔

⑤ نواب صدیق حسن خان قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کی کئی جلدوں پر مشتمل تفسیر "فتح البیان" بھی (اس فہرست کا حصہ) ہے۔

ان تفاسیر کے علاوہ بھی عربی اور فارسی زبان میں دیگر کئی تفاسیر ہندی علماء کے شاہکار کارنامے ہیں، جن کی تفصیلات بیان کرنا مشکل ہے۔

ہندوستان میں قرآنِ کریم کے سب سے پہلے فارسی مترجم

علاوہ ازیں ہندوستان میں قرآن کریم کا فارسی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ کرنے والے [(۱)] اور امت میں قرآن کریم کے ترجمہ کا رواج ڈالنے والے عالم، عارف و محقق، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) تھے، جو "حجة الله البالغة"، "البدور البازغة"، "الخير الكثير"، "التفهيمات الإلهية"، "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء"، "المسوّى" اور "المصفّي" -جو مؤطا مالک کی دو مفید شرحیں ہیں۔ کے علاوہ دیگر کئی قیمتی اور قابلِ قدر تصانیف کے مؤلف ہیں، ترجمہ قرآن کے متعلق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت مہارت اور دقیقہ رسی سے کام لیا ہے اور ان اسرار و معارف اور لطیف اشارات کی رعایت فرمائی ہے جو ہر کس و ناکس کو سمجھ میں نہیں آسکتے، جب تک وہ اس میدان کا شہسوار نہ ہو، اور اس ترجمہ پر مزید تفسیری فوائد ونکات مختصر طور پر تحریر فرمائے ہیں اور انہیں اسرائیلیات سے خالی رکھا ہے، اس ترجمہ کا نام انہوں نے "فتح الرحمٰن" تجویز فرمایا ہے، یہ ترجمہ تحریر فرما کر گویا انہوں نے امت مسلمہ میں وحدت کی بنیاد رکھی ہے، اللہ کریم ان کو خوب رحم و کرم سے نوازے، انہوں نے ہمیں قرآن کریم کے عربی زبان کے علاوہ ترجمہ کے عدمِ جواز کی بحث سے مستغنی فرمادیا، یہ مسئلہ کافی عرصہ تک علماء مصر کے درمیان زیر بحث رہا ہے۔

غیر عربی زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ جائز ہے

ظاہری بات ہے کہ کسی اور زبان کے ترجمے میں قرآن کریم کی معجز فصاحت کے وجود کا دعویٰ ہی کیسے کیا جاسکتا ہے کہ ترجمہ کی عدمِ فصاحت و اعجاز کا قرآن کریم کے اعجاز پر اثر پڑے؟!

بلاشبہ قرآن کریم کے معانی کا فہم، علومِ عربیہ -عربی گرامر وغیرہ- کے حصول اور دیگر متعلقہ لازمی علوم کے ذریعہ لائقِ تحسین اور اولیٰ ہے، لیکن جو شخص ان علوم کو حاصل نہ کر پائے تو کیا اس

(۱) ان سے قبل شیخ حسین کاشفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کے ضمن میں قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور شیخ کاشفی سے بھی پہلے شیخ سعدی شیرازی کی جانب ایک فارسی ترجمہ قرآن منسوب ہے۔

کی قرآن کریم کی واقفیت سے محرومی بہتر ہے یا اپنی مادری زبان میں قرآن کا سمجھ لینا بہتر ہے؟! عقلی اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ دوسری شق زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تمام لوگوں کے واسطے نازل فرمایا ہے، خواہ انسان ہوں یا جنات اور عرب ہوں یا عجم۔

پھر یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن کریم جن دینی اصول واحکام کی رہنمائی کرتا ہے، ان کا جاننا اور سمجھنا ہر مکلف پر واجب ہے، جب کہ عربی علوم (گرامر وغیرہ) کا حصول اس درجے کا واجب نہیں ہے، اگر فہم قرآنی کے حصول کا معاملہ ان علوم پر موقوف کردیا جائے۔ جب کہ قرآن کے بعض حصے کا فہم فرض ہے۔ تو یہ علوم بھی ہر مکلف پر واجب ہوجائیں گے؛ اس لیے کہ یہ اصول اپنی جگہ مسلم ہے کہ امر واجب تک پہنچانے والا عمل بھی واجب ہوا کرتا ہے۔

یہ بات تسلیم ہے کہ ترجمہ سے قرآن فہمی حاصل کرنا عزیمت نہیں ہے، لیکن جہاں عزیمت کے کلی طور پر فوت ہونے کا اندیشہ ہو، وہاں رخصت پر عمل کرلینا ہی عزیمت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو قرآنی اعجاز کی معرفت کے حصول کا اور قرآن کے ایجاز واطناب (کے باریک ولطیف نکات) پہچاننے کا مکلف نہیں ٹھہرایا؛ اس لیے کہ یہ ہر شخص کی قدرت سے بالاتر ہے، کیونکہ کچھ لوگوں کے لیے یہ درجہ حاصل کرنا ہوجاتا ہے تو کچھ محروم رہتے ہیں، جبکہ قرآن پاک تمام لوگوں کے واسطے اللہ کریم کا پیام اور جہاں والوں کے لیے ہدایت نامہ ہے، اگر مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کرکے ان کی نشر واشاعت کی جائے تو تمام انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ۔“ (قمر:۱۷)

ترجمہ: ”اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کردیا ہے“۔

اگر عجمی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کرنا جائز ہی نہ ہو تو یہ آسانی اور تیسیر کیونکر حاصل ہوسکے گی؟! حالانکہ قرآن کریم کی یہ خاصیت ہے کہ ہر شخص اس قرآن سے مستفید و مستفیض ہوسکتا

ہے، عالم اپنے علم کے ذریعے اور عامی جب اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس کے معنی ومفہوم کو حاصل کرتا اور اغراض ومقاصد سے آگاہ ہوتا ہے تو اپنے فہم کے مطابق اس قرآن سے بہرہ ور ہوسکتا ہے، مذکورہ نکات پر غور وفکر کیجیے (تو زیر بحث مسئلے کے مختلف پہلو واضح ہوسکتے ہیں)۔

جہاں تک قرآن کریم کی تفسیر کا معاملہ ہے تو کبار علماء میں سے بھی چند ایک افراد ہی اس بھاری ذمہ داری کے متحمل ہوسکتے ہیں، چہ جائیکہ عام جہلاء وعوام کو اس کا اختیار دے دیا جائے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ہندو پاک کے علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ فی زمانہ قرآن کریم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ جائز ہے، جب کہ مصری علماء اور مشائخِ ازہر شریف نے صرف اسی مسئلہ کے متعلق کئی مستقل تالیفات تحریر فرمائی ہیں، اب تک اس مسئلہ کے متعلق شش وپنج میں مبتلا ہیں اور یہاں اس حوالے سے تمام تر تفصیلات کے بیان کا موقع نہیں، واللہ الموفق!

ہندوستان میں سب سے پہلے اردو مترجم

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اسی خانوادۂ ولی اللّٰہی کے فرد، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے عارف باللہ شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۲۳۰ھ) اپنے والد بزرگوار کی راہ پر گامزن ہوئے اور ہندی اردو زبان میں قرآن کریم کا نہایت بہترین اور عمدہ ترجمہ فرمایا، آج قرآن کے ترجمہ اور فہم میں ہندوستانی باشندوں کا مدار اسی ترجمے پر ہے۔

موصوف نے اس ترجمہ کو تنقیح وتہذیب، اسلوب کی عمدگی اور معنوی لطافت ودقت میں ایسے بلند وبالا مرتبہ پر پہنچایا کہ وہ سہلِ ممتنع کی مانند قرار پایا، پھر اس ترجمہ کو مفید تفسیری فوائد تحریر فرما کر مزید نفع بخش بنادیا، جنہوں نے قرآن کریم کے اغراض ومقاصد کے عمدہ موتیوں پر پڑے پردوں کو ہٹادیا، ان کے بعض لطائف وفوائد کی نظیر، کتب تفاسیر کے دستیاب ذخیرے میں ملنا مشکل ہے، جبکہ اس کے تمام فوائد کے کیا کہنے!!

اگر انسانی کلام کا معجز ہونا ممکن ہوتا تو (کہا جا سکتا ہے کہ) حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ترجمہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے حد اعجاز کے قریب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے صفتِ اعجاز کے ساتھ صرف اپنے کلام کو خاص فرما دیا ہے، بہرحال یہ خصوصیت ایسی ہے کہ دیگر تراجم اس کے مقابل ومساوی نہیں ہو سکتے۔

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا اردو ترجمہ

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے بیٹے۔ جو شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے تھے۔ شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۲۳۳ھ) نے بھی قرآن کریم کا اردو ترجمہ فرمایا، جس میں کلماتِ قرآن کی ترتیب کے مطابق لغوی ترجمہ کی رعایت فرمائی ہے اور عوام کے لیے یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ سے زیادہ مفید ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے بیٹے، علم کے دریائے موجزن، عارف باللہ، شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۲۳۹ھ) نے اپنے بعض شاگردوں کو قرآن کریم کے آخری دو پاروں کی تفسیر لکھوائی، پھر پہلے پارے کی تفسیر لکھوائی اور دوسرے پارے کی تفسیر آیت "وأن تصوموا خيراً لكم" (بقرہ: ۱۸۴) ("اور تمہارا روزہ رکھنا (اس حال میں) زیادہ بہتر ہے") تک مکمل فرما سکے اور اس تفسیر کا نام "الفتح العزیز" رکھا، اس میں ایسے بیش بہا علوم اور گرانمایہ فوائد ہیں، جو ان کے وسیع تبحر علمی، ان کے حیران کن استحضار، باکمال حافظے اور علمی وفنی مضبوطی اور عمدہ تعبیرات کے متعلق قاری کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ طُرفہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فوائد، کتب تفاسیر کی مراجعت کے بغیر محض حافظہ کی مدد سے تحریر کروائے ہیں، خدائے کریم کی قدرت بھی بڑی عجیب ہے، جس کو چاہے جیسے کمالات سے نواز دے! ہمارے شیخ امام العصر (مولانا

محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے:

”کاش! یہ تفسیر اسی انداز میں مکمل ہوجاتی تو انسانی استطاعت کے اعتبار سے جو قرآن پاک کی تفسیری ذمہ داری ہم انسانوں پر عائد ہے، وہ پوری ہوجاتی۔“

ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

بعد ازاں تقریباً نوے یا سو سال بعد نہایت مضبوط ومعتمد عالم، حضرت شاہ اشرف علی تھانوی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا، جو حضرت قطب، عارف باللہ، مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۰۰ھ، اپنے زمانہ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس) کے شاگرد رشید تھے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ محقق، شیخ الہند (مولانا محمود حسن) دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تلمذ حاصل تھا، جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، اس ترجمہ کے ساتھ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو میں کئی جلدوں میں تفسیر بھی تحریر فرمائی ہے، جسمیں خوب جدوجہد کے ساتھ مفسرین کی کتب کا مطالعہ فرمایا، مفید امور کو اختصار کے ساتھ تحریر فرمایا، مشکل مقامات کو نہایت عمدگی کے ساتھ حل فرمایا ہے اور طلبہ کرام کے لیے عربی میں فوائد تحریر فرما کر اس کا نفع مزید بڑھا دیا اور اس تفسیر کا نام ”بیان القرآن“ تجویز فرمایا۔

ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

ان کے بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا اور اس ترجمہ کے ساتھ مفید تفسیری فوائد بھی رقم فرمائے۔

ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وتفسیری فوائد علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

بعد ازاں جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آزادی وطن کی تحریک کے سلسلے میں جزیرۂ مالٹا میں اسیر ہوئے تو تمام تر مشغولیات سے فارغ ہو کر قرآن کریم کے مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف ہوئے، اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے معاصر اسلوب کے مطابق رائج اردو محاورے میں ترجمہ وتفسیر قرآن کی دینی ضرورت محسوس فرمائی، چنانچہ پہلے پہل ترجمہ شروع فرمایا اور اسیری ہی کے زمانہ میں مکمل فرما کر

ترجمہ کا حق ادا کر دیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ کی بنیاد حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ پر رکھی، جو اس وسیع میدان کے سب سے پہلے شہسوار تھے؛ اس لیے کہ اس ترجمہ کے متعلق حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ علم وکمال کے اعتبار سے اس سے ماہرانہ فوقیت تقریباً محال ہے، لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی خوب باریک بینی اور فکری دقیقہ رسی کے حامل تھے اور ان کا سینہ اور دل، نور ایمان سے ایسا معمور و منور تھا کہ اس دور میں کسی کے لیے ان کی منزلت تک پہنچنا تو کجا ان کی گرد پا تک پہنچنا بھی دشوار تھا، چنانچہ انہوں نے بعض تعبیرات کو نہایت ہی نفاست اور خوش اسلوبی سے تبدیل کیا اور تمام ان خصوصیات کی رعایت ملحوظ رکھی جو شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے نفیس ترجمے میں تھی، چنانچہ ترجمہ میں (عربی گرامر کے اعتبار سے) صفت، بدل اور عطف بیان کے درمیان فرق کی رعایت کی اور جو مقام سب کا احتمال رکھتا ہو تو وہاں اسی اصطلاح کی رعایت فرمائی، جو اس مقام میں زیادہ لطیف ہو، یہ ترجمہ بہت سے دل کش ودلچسپ محاسن ودقائق پر مشتمل ہے، اس ترجمہ میں جتنا غور وتدبر کیا جائے، اس کے محاسن نمایاں ہوتے رہتے ہیں:

غَرَّاءُ مِبْسَامٌ كَأَنَّ حَدِيْثَهَا دُرٌّ تَحَدَّرَ نَظْمُهَا مَنْثُوْرُ

ترجمہ: "محبوبہ کا تبسم بہت خوشنما ہے، گویا اس کی باتیں ایسے موتی ہیں جن کا نظم بھی نثر (کی مانند بکھرا ہوا) ہے۔"

اور ابونواس کہتا ہے:

يَزِيْدُكَ وَجْهُهُ حُسْنًا إِذَا مَا زِدتَّهُ نَظَرًا

ترجمہ: "اے مخاطب! جتنا زیادہ تو محبوب کے چہرے کو دیکھے گا، اتنے محاسن اس کے تجھ پر نمایاں ہوں گے۔"

اسی طرح ایک اور عرب شاعر۔جو شعرائے عرب کا علم بردار شمار کیا جاتا ہے۔کا شعر ہے:

وَرُحْنَا يَكَادُ الطَّرْفُ يَقْصُرُ دُوْنَهُ مَتٰى مَا تَرَقَّ الْعَيْنُ فِيْهِ تَسْهَلُ

ترجمہ: "ہم اتنا چلے کہ نگاہیں اس کی انتہاء کو نہ پہنچ سکیں، جب بھی نگاہیں اس میں اوپر کو اُٹھتی ہیں تو نیچے کی طرف لوٹ آتی ہیں۔"

بعدزاں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمہ پر تفسیری فوائد تحریر کرتے ہوئے سورۂ نساء کے اخیر تک پہنچ گئے اوراس میں نظمِ قرآنی کے فہم کے لیے ایک عام شخص کو جتنی تشریحات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمام ترضروریات ان فوائد کے ذیل میں منفرد اسلوب سے روشن تعبیرات کے ساتھ قرآن کریم کے اغراض ومقاصد کو واضح فرماتے ہوئے درج کردی تھیں۔

جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اسیری اور قید وبند سے نجات ملی اور سرزمین ہند پہنچے تو ان پر مختلف امراض کا شدید حملہ ہوا، بہرحال اجل مقدر نے ان کو مہلت نہ دی اور قضا کا وقت قریب ہوا، فضا تنگ ہوگئی اور حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، رفیق اعلیٰ کو پہنچے۔

اس دوران حوادث نے سورۂ آل عمران کے فوائد ضائع کردیئے اور یہ تفسیر یوں ہی نامکمل رہی اور کوئی ایسی عبقری شخصیت سامنے نہ آئی جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ان فوائد تفسیریہ کو ان کی منشا کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچادے، نوبت بہ ایں جارسد کہ یہ ازلی سعادت ان کے شاگرد رشید اور خصوصی رفیق، محقق العصر، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔ صاحب ''فتح الملهم''۔ کے حق میں ظاہر ہوئی، چنانچہ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تین سال کی مدت میں تمام قرآن کریم کے فوائد اپنے استاذ کے اصول کی رعایت کرتے ہوئے مکمل فرمائے اور ایسے عمدہ کلمات وتعبیرات سے فوائد کو مزین فرمایا جو سب کے سب گویا لعل وجواہر ہیں، ان تفسیری فوائد میں اہلِ زمانہ کی ضرورت کے مطابق اس دور کے ملاحدہ کے مردود اقوال کے بطلان کو واضح فرمایا، جیسے محمد علی قادیانی لاہوری، جس نے اردو اور انگریزی میں ''بیان القرآن'' کے نام سے تفسیر لکھی اور اس کی مانند دیگر اہل بدعت۔ ان فوائد کا کچھ تذکرہ گزشتہ صفحات میں بھی آچکا ہے۔

بہرکیف مذکورہ تراجم اہل حق علماء کے ہیں اور مستند تراجم ہیں، جن سے اللہ نے امت کو بہت نفع پہنچایا، اور ہندوستان کے تمام علاقوں میں ان تراجم پر (قرآن فہمی کا) مدار ٹھہرا اور مختلف

علاقوں میں ان کی خوب نشر واشاعت ہوئی، شعبۂ درس وتدریس سے متعلق اہلِ علم وطلباء ان سے خوب نفع اٹھاتے رہے ہیں، خاص طور پر آخر الذکر ترجمۂ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تفسیری فوائد خوب مقبول ہوئے، اسی اثنا میں اور اس تفسیر کے بعد بھی قرآن کریم کے تراجم کا تانتا بندھا رہا اور ان پر تفسیری فوائد تحریر کیے گئے، جن میں بعض صحیح اور اہل حق کے تھے۔

چند قابل گرفت اردو تراجم

ان میں عالم باعمل، عارف باللہ، مولانا حسین علی پنجابی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن بھی قابل ذکر ہے، مولانا موصوف، قطب زمان، مولانا محدث، ابو مسعود رشید احمد گنگوہی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۲۳ھ) کے شاگرد تھے، بعد ازاں ان کے تحریر کردہ فوائد وامالی میں، میں نے قابل مؤاخذہ ونقد مقامات پائے، جن میں ان کا قلم سیدھی راہ سے پھسلن کا شکار ہوا ہے، لیکن نامعلوم یہ ضبط کرنے والے کی کارستانی ہے یا خود صاحب تعلیق کی رائے ہے، اس پر نظر ثانی کی جائے، چنانچہ میری نگاہ میں بعض مقامات، تفسیری کوتاہی پر تنبیہ کے محتاج معلوم ہوتے ہیں، ان میں سے چند مقامات یہ ہیں:

① ذبح بقرہ والی آیت (بقرہ: ۶۷) ② فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ. (بقرہ: ۲۳)

③ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا. (بقرہ: ۱۰۴) ④ تحویل قبلہ کے متعلق آیت (بقرہ: ۱۴۴)

⑤ آیت فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ. (بقرہ: ۲۵۶) ⑥ آیت الکرسی (بقرہ: ۲۵۵) وغیرہ

میں نے کچھ عرصہ قبل سنا ہے کہ عصرِ حاضر کے کسی عالم نے ان کی تفسیر وترجمہ کے رد میں باقاعدہ ایک کتاب تالیف فرمائی ہے۔ وَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى!

ہمارے محترم مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیری فوائد قلم بند فرمائے ہیں (لیکن یہ تفسیری فوائد وترجمہ علمائے حق کے ہاں معتمد ہیں)۔

(ہندوستان کے بعض) مفسرین نے درست ونادرست کی آمیزش پر مشتمل تراجم وتفاسیر

لکھی ہیں، جن میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور مرزا حیرت دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کا ترجمہ شامل ہے۔ انہی ہندی مفسرین میں سے بعض نے قرآن کی مراد میں تحریف بھی کی ہے اور معنوی اعتبار سے قرآن کو مسخ کردیا ہے، قرآن کو اپنی خواہشات کے قالب میں ڈھال کر اپنے واسطے جہنم کا ٹھکانہ تیار کیا ہے، جیسے: محمد علی قادیانی جس کی جانب گزشتہ سطور میں ہم نے اشارہ کیا ہے، اس نے اپنی تفسیر میں سرسید احمد خان دہلوی -بانی علیگڑھ یونیورسٹی- کی تفسیر پر اعتماد کیا، اسی طرح حکیم احمد حسن امروہی مرزائی قادیانی، جس کی تفسیر کا نام میری یادداشت کے مطابق غالباً ”غاية البيان“ ہے، موصوف نے اس کتاب کو باطل اقوال سے بھر دیا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

سرسید احمد خان اور ان کی تفسیر

سرسید احمد خان کی تفسیر کا تذکرہ چھڑا ہی ہے تو ان کی شخصیت اور ان کی تحریر کردہ تفسیر کے متعلق وضاحت نہ کرنا، مذہبی مداہنت اور عملی نفاق ہوگا؛ اس لیے کہ وہ بہت سے خواہش پرست اور روشن خیال لوگوں کے رہبر ورہنما ہیں، جن کے لیے ان کی کج روی کی بنا پر ملت حنیفہ کی سیدھی اور ستھری راہ تاریک کردی گئی ہے، سرسید احمد خان یا تو زندیق اور ملحد شخص تھے یا پھر جاہل وگمراہ، جو حق تک پہنچنے کے خواستگار تھے، لیکن سیدھی راہ ان سے خطا ہوگئی، انہوں نے شرعی معاملات اور شعائرِ دین کے متعلق اپنی گمراہ اور ناکارہ عقل کو کسوٹی ٹھہرایا، جس کی بنا پر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، ان کا طرز وطریقہ یہ تھا کہ اہل یورپ، ملتِ اسلامیہ پر جو بیکار اعتراضات کیا کرتے تھے، موصوف ان کو تسلیم وقبول کرلیتے تھے، پھر قرآن وسنت میں تاویلات کرنے لگتے تھے، یوں انہوں نے اسلام کو کفر کے قریب کرکے دونوں کو ایک ہی دین قرار دے ڈالا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف یہ تمام تر تاویلات اس لیے کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ ان اہلِ کفر کے دربار میں تقرب اور شرف باریابی حاصل کرلیں، جن کے ہاتھ میں ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور تھی۔

چنانچہ انھوں نے فرشتوں کا انکار کرتے ہوئے کہا:

''ملائکہ، خیر کے فطری ملکہ کا نام ہے، جو انسانی فطرت وجبلت میں ودیعت ہے، یہ وجودِ انسانی سے خارج کوئی مستقل عالم نہیں، بلکہ یہ ان صفات میں سے ہے جو انسان کے اندر ہی موجود ہیں۔''

اسی طرح شیاطین کا انکار کرتے ہوئے لکھا:

''شیطان ان شر کی قوتوں سے عبارت ہے جو فطرت انسانی کا حصہ ہیں۔''

اسی طرح حشر اور معاد جسمانی کا انکار کیا، بلکہ ملحد فلاسفہ کی طرح صرف معاد روحانی کو ثابت کیا، نیز آسمانوں اور ارواح کے وجود کا بھی انکار کیا۔

موصوف، نبوتِ شرعیہ۔ جو خدائی عطیہ ونوازش ہے۔ کے بھی منکر تھے، جو نبوت حضرت خاتم النبیین ﷺ پر جا کر تمام ہوئی، ان کا خیال تھا کہ نبوت، کسبی ہوتی ہے، انھوں نے نبوت کی صفات وعلامات تبدیل کر ڈالیں، نبی اور امت کو کسی بھی عام مصلح کو برابر قرار دیا، اسی طرح ان معجزات کا بھی انکار کیا جو انبیاء کرام کے ہاتھوں سے خدائے کریم وقدیر کی قدرت سے ظاہر ہوئے، ان کا کہنا ہے:

''خوارق، خداوند کریم کے دست قدرت سے بالاتر ہیں۔''

گویا موصوف نے تکلیف وتشریع ہی کو باطل قرار دیا، بلکہ تمام قطعی ضروریات دین اور صریح وصحیح قطعی نصوص کی بھی تاویلات کیں، جن کی قطعیت، دلالت وثبوت کے اعتبار سے مسلم ومتفق ہے، حتّٰی کہ میرٹھ کے ایک خطاب میں کہنے لگے:

''دنیوی معاملات تو خود اسلام نے ہمارے سپرد کر رکھے ہیں کہ جس طرح چاہیں اور جیسے چاہیں ان کے متعلق تصرف کریں؛ اس لیے کہ نبی پاک ﷺ نے فرما دیا ہے: ''أنتم أعلم بأمور دنياكم مني'' (تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو)، جہاں تک دینی معاملہ کا تعلق ہے تو اس میں خوب وسعت وکشائش

رکھی گئی ہے، فرمایا گیا: "من قال: لا إله إلا الله دخل الجنة، وإن زنى وإن سرق". (جس شخص نے کہا: خدائے برحق کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ گویا جنت میں داخل ہوگیا، اگر چہ بدکاری یا چوری کا مرتکب ہو)۔"

موصوف کے نزدیک ساری شریعت اسلامی کا یہی خلاصہ اور نچوڑ ہے، چنانچہ وہ قرامطہ باطنیہ، اسماعیلیہ، مزدکیہ، اخشونیہ جیسے ملحد زنادقہ کے گروہ میں شامل ہو گئے، جنھوں نے قطعی ضروریات دین میں دوراز کار تاویلات کی ہیں، بلکہ موصوف ان کے روحانی شاگرد معلوم ہوتے ہیں کہ انہی کے افکار کو اخذ کر کے یہ گمان کر بیٹھے کہ گویا وہ خود ان نظریات کے موجد ہیں، شیطان نے انہیں ان کی فکر کو مزین کر دکھلایا تو انہوں نے نصوصِ قرآنی اور احادیثِ نبوی میں ایسی بودی اور بیکار تاویلات کیں، جن سے طبائع سلیمہ کراہت محسوس کرتی اور جنہیں سماعت صحیحہ مسترد کر دیتی ہے، اس طرح کی تاویلات تو ایک عقلمند شخص کے کلام کی بھی نہیں کی جاسکتیں، چہ جائیکہ خدائے پاک کے بلیغ و فصیح اور معجز کلام میں ایسی دوراز کار تاویلات کو راہ دی جائے، یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔جنہیں جامع کلمات کی گویائی سے سرفراز فرمایا گیا۔ کے کلام کی ایسی بھونڈی تاویلات لائی جائیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے موصوف کی بصیرت کو اندھا کر ڈالا تھا جس کی بنا پر وہ اتنی تمیز بھی نہ کر سکے کہ آیا (قرآن وسنت میں) ان تاویلات کی عربیت کے پہلو سے گنجائش بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اعدائے دین نے ان کی آنکھوں پر کھلی جہالت کے پردے ڈال دیئے تھے اور جس کو خدا، نور سے نہ نوازے، واقعۃً وہ نورِ فراست سے سرفراز ہو ہی نہیں سکتا ہے، یوں موصوف (بزعمِ خود) دین کی خدمت سرانجام دے رہے تھے اور اہلِ کفر واہلِ اسلام کو متحد فرما رہے تھے۔

اس طرح کی تاویلات سے موصوف نے قرآن پاک میں تحریف کی، دین اسلام کی تعلیمات کو مسخ کیا اور شریعت مطہرہ کے ستھرے خدوخال کو بدصورت و بدنما کر دیا، انہی من گھڑت

اصولوں کی بنیاد پر موصوف نے "تفسیر القرآن" کے نام سے اردو میں تفسیر لکھی، درحقیقت یہ کتاب "تفسیر القرآن" کے بجائے "تحریف القرآن" کہلائے جانے کی مستحق ہے، بلکہ موصوف اپنی تحریفات میں یہودی علماء سے بھی ایسی سبقت لے گئے کہ وہ بھی ان سے کئی منزلیں پیچھے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نظمِ قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرما رکھا ہے، اس لیے موصوف اس نظم قرآنی میں تحریف وتغیر نہیں کر پائے، وگرنہ ان کی شخصیت سے یہ تغیر وتحریف بھی کچھ بعید نہ تھی، اور شاید ان کے لیے یہ قدم اٹھانے میں بھی رکاوٹ نہ ہوتی، یوں موصوف نے اہل یورپ کی تحریک کی خاطر متاعِ دین فروخت کر دیا، بلکہ اپنی تفسیر و دیگر تالیفات اور خطبات میں خوب الحاد بکھیر دیا ہے۔

افکارِ سرسید اور مولانا عبد الحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اپنے دین کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور اپنے بندوں میں اس کی سنت رہی ہے کہ کوئی بھی دور، دینی معاملات کے محافظ اہل حق سے خالی نہیں رہا۔ مشہور ضرب المثل ہے: "لكلّ فرعون موسى، ولكلّ خرق راقع" یعنی "ہر فرعون کے لیے موسیٰ ہوتا ہے اور ہر پھٹن کے واسطے پیوند کار بھی ہوتا ہے"، چنانچہ موصوف کے کفر والحاد کا قلع قمع کرنے اور ان کی باطنی خباثت ونجاست سے دین کو پاک صاف کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا ابو محمد عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب فرمایا، جو دہلی کے باسی، دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ اور "حقانی" کے لقب سے معروف تھے، چنانچہ مولانا موصوف نے زبان وقلم سے ان کی خوب تردید کی، اور جلتا انگارہ اس ملحد کے پہلو اور پسلیوں کے درمیان رکھ دیا اور ان کے باطل خیالات وافکار کو تہہ وبالا کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ گمراہ فرقوں کی سرکوبی کے لیے ایسے قابلِ قدر افرادِ امت کو چنتے ہیں، جو زمانے کے سرد وگرم چشیدہ، آزمودہ کار وتربیت یافتہ ہوں، جو ایسے ملحدین وزنادقہ کی خفیہ اسکیموں اور وسوسوں کو خوب پرکھ لیتے ہیں اور ان کے خسائس ورذائل کا ادراک رکھتے ہیں، چنانچہ یہ رجالِ کار ان کے خُبث وخباثتوں کو نمایاں کر لیتے ہیں۔

بہرکیف محترم مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح المنان“ کے نام سے سرسید کی تفسیر کے رد میں ایک تفسیر تحریر فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے امت کو اس تفسیر سے خوب نفع پہنچایا۔ فاضل مؤلف کی ایک مفصل کتاب بھی ہے، جو گویا ان کی تفسیر کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں فاضل مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے سرسید کے الحاد کی بنیاد کو آشکارائے عالم کیا اور اس کے فاسد و باطل اصولوں کی خوب تنقید و تردید کی ہے۔ اس کتاب کا نام ”البیان في علوم القرآن“ ہے، اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، جس کو مشرقی و مغربی ممالک میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔

سرسید کے کردار کے متعلق یہ چند نمونے ہیں، اے ہوشمند و باخبر مخاطب! (ان کی روشنی میں) انصاف سے کام لیجیے! آپ سے حلفیہ التماس ہے؛ کیونکہ انصاف بہترین صفت ہے، کیا دینی امور یا حمیتِ وطنی اور حریتِ وطن میں سے کوئی ایسی چیز ہے جس کو تباہ و برباد کرنے کی اس شخص نے کوشش نہ کی ہو؟! کاش ان کا یہ کفر والحاد ان کی ذات سے آگے نہ بڑھتا! اگرچہ موصوف نے اپنے تئیں کوشش کی تھی کہ سب لوگوں کو اپنے دین کے تابع بنالیں اور لوگ ان کی ہفوات پر ایمان لے آئیں۔

بعض کتابوں میں موصوف نے حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرّہ (جیسی بلند پایہ شخصیت) کا استہزا کیا ہے، اندازہ لگایئے کہ اس بیوقوف ملحد کی بیوقوفی کہاں تک جا پہنچی؟! اور اس کا یہ اندھاپن اسے کن راہوں پر گامزن کر گیا؟! وہ اپنی باطل تاویلات و تحریفات کو اسرار و دقائق شمار کرنے لگا، نوبت بایں رسد کہ اپنی تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق یہاں تک کہہ گیا:

”اونٹ چرانے والے، چرواہوں کو یہ حقائق سمجھ نہیں آسکتے تھے، اس لیے ان کی خاطر ان کی فہم و دانست کے مطابق مثالیں بیان فرمائی گئیں۔“

افسوس صد افسوس! (اس شخص کی شر انگیزی کتنی بڑھی ہوئی تھی، اس کے افکار تو عربی کی مشہورِ زمانہ ضرب المثل کا مصداق ہیں): ”تفاقم الشر و بلغ السکین العظم۔“

”یعنی شر، حدود پھلانگنے لگا اور چھری سرایت کرتے کرتے ہڈی تک جا پہنچی۔“

سرسید اور مولانا شبلی

مجھے تو ہندوستان کے مشہور مؤرخ اور"سیرۃ النبی"اور"الفاروق"وغیرہ جیسی گرانمایہ کتابوں کے مصنف ،مولانا شبلی نعمانی پر تعجب ہے کہ موصوف ،سرسید کے متعلق کس قدر عقیدت رکھتے تھے!! مجھے تو اس پر ناقابل برداشت حد تک افسوس ہوا کہ موصوف اپنے خطوط میں سرسید کو یوں مخاطب ہوئے:

"سیدي ومولائي"اور جب سرسید کا انتقال ہوا تو اپنے ایک دوست کو موصوف شبلی نعمانی نے لکھا:

> "ملتِ اسلامیہ کے ستون اس حادثہ سے ہل گئے ،میری مراد سید احمد خان کا رب ذوالجلال کی رحمت کی طرف انتقال ہے ،یہ حادثہ بروز اتوار ۲۷ / مارچ کو پیش آیا ،ہماری جمعیت بکھر گئی اور میں کچھ دیر تو بالکل ناکارہ وبے حواس ہو رہا۔
>
> والسلام ،شبلی نعمانیؒ ،علی گڑھ ،۲۹ / مارچ ۱۸۹۸ء"

(مکاتیب شبلی: ۲/ ۲۲۷ ،دار المصنفین اعظم گڑھ ،۲۰۱۲ء)

یہ اس خط کے عربی الفاظ ہیں (جن کی اصل اردو تحریر اوپر پیش کی گئی ہے) میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آیا چند مشترکہ مصالح کے پیش نظر یہ دینی مداہنت تھی یا پھر ان دونوں شخصیات کی ارواح کی آپسی مناسبت اور فہم ودانائی میں دونوں کے مقاصد کا اشتراک تھا؟! یہ ہے ان کے علم کی انتہا!

ان تمام باتوں کی اعلانیہ طور پر وضاحت اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ کافر سے چشم پوشی بھی برتنا دین نہیں ہے ،جیسے ایک مسلمان کو کافر گرداننا ،دین نہیں ہے۔اس مسئلہ کے حوالے سے لوگ دو بالکل مخالف سمتوں میں ہیں: بعض نے نادانی میں افراط سے کام لیا ہے اور بعض نے تفریط کی راہ اپنائی ہے۔ ہمارے حضرت امام العصر (مولانا محمد انور کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) نے"إكفار الملحدين"میں اس کی وضاحت فرمائی ہے ،بلکہ درحقیقت کافر سے چشم پوشی ،تکفیر مسلم سے زیادہ اسلام کے لیے ضرر رساں ہے ،لیکن یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیلات کا متحمل نہیں ،لہٰذا ہم ان تفصیلات سے اعراض کرتے ہیں۔

اب آپ مذکورہ مکتوب پر دوبارہ نگاہ ڈالیے ،اگر سرسید احمد خان جیسا شخص ،ملت اسلامیہ

کے ستونوں میں سے شمار کیا جائے گا تو اس ملت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟! جبکہ آپ دیکھ چکے کہ اس شخص نے ملت اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے کسی بھی رکن کو اپنی ناکام ونامراد کوششیں صرف کر کے اپنے تئیں انہیں متزلزل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

لیکن تعجب اس پر ہے کہ ایک شخص، قرآن اور دین اسلام کی تحریف کرتا ہے، دین کو ایک عقلی شاخسانہ گردانتا ہے، برطانوی سامراج کے جال کو مضبوط کرنے کے لیے ان کی امداد واعانت میں کوشاں ہے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خائن ہے، ملعون حکومت کے غلبے کی تائید کر کے وطن اور باشندگانِ وطن کے ساتھ خیانت وبددیانتی کا مرتکب ہے، پھر بھی وہ ملت اسلامی کا ستون کہلائے؟! اگر ملت اسی کا نام ہے تو ایسی گمراہ وباطل ملت سے میں اللہ تعالیٰ کے حضور براءت کا اعلان کرتا ہوں۔

نیز ان لوگوں کے حال پر بھی افسوس صد افسوس! جن کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہے، یہ ان لوگوں کے ظاہری وباطنی عیوب ہیں اور یہ ان کا ظاہر وباطن ہے، انہی فاضل مؤرخ (مولانا شبلی) نے اپنی کتب ورسائل کو ایسے امور سے بھر دیا ہے، جن کو خدا ورسول پر ایمان رکھنے اور قلب میں ایمانی ٹھنڈک محسوس کرنے والا اور شرح صدر کی دولت سے مالا مال شخص قبول نہیں کرسکتا۔ موصوف اپنے بہت سے نظریات میں مذکورہ شخص سے متفق نظر آتے ہیں، مؤرخ موصوف کے عذر کو قبول کرتے ہوئے آخری حد یہ ہے کہ ہم ان کو غالی معتزلی شمار کریں، ورنہ ان کا معاملہ بھی نازک اور ان کے افکار نہایت خطرناک ہیں۔

دراصل فی زمانہ امت میں شرانگیزی اور فتنہ وفساد کا سیل رواں جاری ہے، دینی مداہنت اور عملی نفاق کا دور دورہ ہے، البتہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حضور قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہو جائے یا جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں (وہی شخص کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوگا)۔

جب اس شخص کا یہ حال ہے تو اس کے پیروؤں اور (روحانی) اولاد کا کیا حال ہوگا؟! بلاشبہ توفیقِ خیر تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے، اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

ان مؤرخ موصوف (مولانا شبلی نعمانی) کے پیروکاروں پر بھی حیرت ہے کہ موصوف نے جہاں اسلام کے اجماعی عقیدہ کی مخالفت کی اور صریح احادیث کے خلاف افکار اختیار کیے ہیں، وہاں یہ لوگ ان علمی غلطیوں پر کیوں پردے ڈالتے ہیں؟!

درحقیقت انسانی ارواح جب عالم ارواح میں لشکروں کی صورت میں جمع تھیں، تب وہاں جو روحیں آپس میں مناسبت رکھتی تھیں، وہ دنیا میں بھی آکر آپس میں متعارف رہیں اور جن ارواح میں وہاں مناسبت نہ تھی، وہ دنیا میں بھی باہم اجنبی رہیں، ان سب لوگوں کی قرآن وحدیث اور تاریخ کے متعلق کئی ہفوات ہیں، جو قابلِ تنبیہ ہیں، لیکن یہ مقام ان کے تذکرے کا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ، تمام امت محمدیہ کو راہ راست پر چلائے، ہمیں بھی الحاد و زندقہ سے محفوظ فرمائے اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ واقعی اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں درست دین اسلام اور شریعت محمدیہ کی اتباع کرتے ہوئے دنیا سے اٹھائے اور حق وراہِ راست کی ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه أجمعين!



مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی اور ان کی تفسیر "ترجمان القرآن"

اَلْخَیْرُ أَبْقٰی وَإِنْ طَالَ الزَّمَانُ بِه وَالشَّرُّ أَخْبَثُ مَا أَوْعَیْتَ مِنْ زَادِ

ترجمہ: "بھلائی اور اچھائی باقی رہتی ہے اگرچہ اس کو طویل زمانہ گزر جائے، اور برائی وخباثت سے بھرپور ہی رہتی ہے، چاہے تو کتنا ہی عرصہ اس کو توشہ میں محفوظ رکھے۔"

"ترجمان القرآن" اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہے، جس پر مولانا ابوالکلام احمد دہلوی نے مختصر اور مبسوط فوائد تحریر کیے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب اور اس میں موجود سنت واجماع امت کے مخالف مباحث سے متعلق وضاحت کردوں، اس وضاحت پر مجھے بعض معاصرین کے اس تعریفی مضمون نے برانگیختہ کیا، جو قاہرہ کے رسالہ "الفتح" (شمارہ نمبر: ۵۶۲) میں شائع ہوا ہے، ان کے کلمات بجا طور پر اس محاورہ کے مصداق ہیں: "یَدَاكَ أَوْكَتَا وَفُوْكَ نَفَخْ." یعنی "اپنے ہاتھ سے مشکیزہ کو بند کر رہے ہو اور منہ کی پھونک سے ہوا بھر رہے ہو"۔ میری دانست میں انہوں نے ایسی (بلند وبانگ) تعریف کی ہے جو اس تفسیر کے لائق نہیں ہے، نیز اس تفسیر کے عیوب وہفوات سے یا تو چشم پوشی کی ہے یا پھر ان کا علم ہی نہیں۔ لیکن ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم علمائے مصر کو دھوکے میں رکھیں اور انہیں ایک ہندوستانی باشندے کی جھوٹی تعریف پر ابھاریں؛ اس لیے کہ ہمارے لیے اللہ اور رسول کی خاطر درست بات کرنا، کسی ہندوستانی کی جھوٹی تعریف کی بنسبت زیادہ اہم ہے، ہمارے لیے مناسب نہیں کہ ہم مخلوق کی رضامندی کے بدلے خالق کی ناراضگی کا سودا کر بیٹھیں، خدا

ورسول کی خوشنودی کا حصول ایسے شخص کی رضا مندی سے کہیں زیادہ اہم ہے، جسے کوئی پرواہ نہیں کہ اس کی زبان وقلم اسے کسی وادی میں ہلاک کرڈالیں گے۔

موصوف کے بعض ہفوات کی جانب محض رضائے خداوندی کے حصول اور ہندوستانی طلباء وعلماء اور عام عوام تک حق بات پہنچانے کے لیے اس سے قبل میں اپنے رسالہ "نفحة العنبر" میں بھی کچھ اشارات تحریر کرچکا ہوں۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ اس تنقید وتبصرہ پر بعض لوگ تحقیر وطعنہ زنی کرتے ہوئے میری قلمی ولسانی مزاحمت کریں گے اور مجھے تعصب، جمود اور کم فہمی کے طعنے دیں گے لیکن یہ سنت جاریہ تو قرآن کریم کے بارے میں بھی ہے (کہ حق گوئی کے مقابلہ میں ایک جماعت ضرور مخالفت کرتی ہے) ایک عرب شاعر اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوا ہے:

أَعَيَّرْتَنَا أَلْبَانَهَا وَلُحُوْمَهَا ... وَذَالِكَ عَارٌ يَا ابْنَ رِيْطَةَ ظَاهِرُ

ترجمہ: "کیا تو ہمیں اپنی اونٹنیوں کے دودھ اور گوشت پر (بخل کرنے کی بنا پر) عار دلائے گا اور ملامت کرے گا؟ اے ابن ریطہ! یہ مخالفت از خود بے حیثیت و بے قدر ہے (کیونکہ تجھ کو کیا معلوم ہم انہیں کن مصارف میں خرچ کرتے ہیں؟! جن سے تو بے خبر ہے)۔"

ایک دوسرے شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وَعَيَّرَهَا الْوَاشُوْنَ أَنِّيْ أُحِبُّهَا ... وَتِلْكَ شَكَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا

ترجمہ: "میرے رقیب چغل خوروں نے محبوبہ کو میرے اس سے محبت کرنے پر عار دلائی (کہ یہ نکما شخص تجھ سے محبت کا دعوے دار ہے)، حالانکہ یہ شکوہ وشکایت از خود ہی تجھ سے اے محبوبہ! اپنی عار کو دور کر رہا ہے (کیونکہ مجھ جیسا قابلِ قدر عاشق تجھ سے محبت کرے تو یہ تیرے لیے باعث صد افتخار ہے نہ کہ عار کا سبب)۔"

(بہر کیف اب میں موصوف کے افکار پر اپنا نقد وتبصرہ سپردِ قلم کر رہا ہوں) اور توفیق تو عطیۂ خداوندی ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی جانب رجوع۔

مذکورہ مضمون نگار رقم طراز ہے:

”ہندی زبان میں تالیف کردہ تفاسیر میں امام ابوالکلام کی تفسیر بھی قابل ذکر ہے، امام حجۃ الخلف، سیدرشید رضا مرحوم ومغفور کی تفسیر کے سوا کوئی تفسیر اس کے ٹکر کی نہیں۔“

مجھے نہیں معلوم کہ ان جملوں میں موصوف نے اس مفسر کے نظریات وافکار سے مناسبت کی بنا پر دل کی گہرائی سے تعریف کی ہے یا پھر عصری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مداہنت سے کام لیا ہے، بہر حال کچھ بھی ہو، میں اس بارے میں کسی مصلحت کی رعایت کیے بغیر کہتا ہوں:

ابوالکلام آزاد دہلوی طبعی طور پر ایک جذباتی شخص تھے، جو وسیع معلومات اور اردو تقریر وتحریر کا ملکہ رکھتے تھے، شاید وہ اپنے اس طرزِ انشاء وحسنِ خطابت میں اپنے دور کے منفرد انسان تھے، بلکہ انہوں نے ایک جداگانہ اسلوب ایجاد کیا، ان کی بیس سال قبل کی زندگی، حالیہ زندگی سے قوم کے لیے زیادہ نفع بخش اور فائدہ مند تھی، برطانوی سامراج اور اسلام مخالف حکومت کے پنجے سے وطن کو آزادی دلانے میں ان کا اہم کردار رہا اور اس جدو جہد اور تحریک میں حکومت کے خوف اور اس کے حملے کے خطرہ نے ان کو متاثر نہیں کیا اور ان کی اسی جدو جہد کی وجہ سے بہت سے علمائے حق نے ان کے متعلق سکوت اختیار فرمایا۔

حصول وطن کے لیے موصوف کی ان قابل قدر مساعی کی بنا پر میرے دل میں بھی ان کی خاصی قدر ومنزلت ہے، اس لیے کہ ابتدا میں انہوں نے ہی کم ہمت افراد کو ابھارا، اور آزادی کی خاطر جدوجہد کے حوالے سے خوابیدہ عوام وخواص کو اپنے اخباروں ”الہلال“ اور ”البلاغ“ جاری کر کے خوابِ غفلت سے بیدار کیا، اسی طرح سیاسی جلسوں میں اپنی دل کش تقریروں سے غفلت کوشوں کو جگایا۔ لیکن (ان تمام خصوصیات کے باوجود) موصوف کی طبیعت میں اپنی آرا وافکار کے متعلق خود پسندانہ کیفیت محسوس ہوتی تھی، جس کی بنا پر وہ کئی علمائے حقہ، بلکہ اکابر ملت پر۔ اگر ان کی آرا، موصوف کے نظریات کے مخالف ہوتیں۔ خوب تنقید کرتے تھے، اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ ان میں کسی قدر

حرص وطمع، اپنے خواہشات آمیز افکار ونظریات (پر گھمنڈ) اور خود رائی کی کیفیت پائی جاتی ہے اور بعض مقامات پر درست مسلک ومذہب اور ستھرے عقائد وعلوم سے خروج نظر آتا ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق ابتدا میں وہ صحیح العقیدہ شخص تھے، (اس دور کے) مختلف رسائل واخبارات میں شائع شدہ مقالات ومضامین بھی ان کے صحیح العقیدہ ہونے کے گواہ ہیں، لیکن فروعی مسائل میں وہ کسی امام کے مقلد نہ تھے، جیسے قاضی شوکانی، نواب صدیق حسن خان اور دیگر اہل حدیث (حضرات ائمہ کرام کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے)، لیکن موصوف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ علمائے احناف، خصوصاً امام الائمہ وفقیہِ امت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر انہوں نے اپنی کتاب "تذکرہ" میں خوب گرانی کا اظہار کیا ہے، چنانچہ موصوف اکابر امت کے حق میں بے ادبی کے مرتکب ہوئے اور کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان کے متفقہ امام قرار پائیں اور اہلِ ہند اُن کی (امامت وقیادت پر) اتفاق کرلیں، لیکن ہندوستان میں بہت سے صحیح علم ودانش اور تقویٰ ودیانت کے حامل علمائے امت تھے اور جیسا کہ راقم نے عرض کیا کہ: موصوف دینی امور میں توسع کے قائل، بے لگام اور اپنی آرا میں آزاد خیال تھے، جب کہ علم وعمل میں اکابرِ ہند سے کوسوں دور تھے۔

چنانچہ علمائے دیوبند نے اس موقع پر بھی جرأت واستقلال کے ساتھ حق کو بے باکی سے بیان کرتے ہوئے واشگاف اعلان کردیا کہ موصوف، امامت کے ہرگز حق دار نہیں ہیں؛ اس لیے کہ علمائے دیوبند نے اپنی فراستِ صحیحہ سے قبل از وقت ہی ان مفاسد کو پرکھ لیا تھا، جو ان کی امامت کو تسلیم کرلینے میں آئندہ پیش آسکتے تھے، جن کی بعد ازاں روک تھام نہایت مشکل تھی، چنانچہ (ان علماء کی کاوشوں کی بنا پر) موصوف اپنے مقاصد اور آرزؤوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔

بہر کیف انہی افکار ونظریات کے متعلق موصوف جد وجہد کررہے تھے، دریں اثنا انہوں نے اعلان کیا کہ وہ تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس کی بنا پر اس تفسیر کی جانب توجہات مبذول ہوئیں اور لوگ اس تفسیر کا اسی شدت سے انتظار کرنے لگے، جیسے ایک پیاسا شخص ٹھنڈے میٹھے اور شفاف

پانی کا منتظر رہتا ہے، چنانچہ یکے بعد دیگرے تفسیر کے متعلق دو حصے شائع ہوئے، پھر مختصر یا مفصل فوائد پر مشتمل ''ترجمہ قرآن'' شائع ہوا، جس کا نام موصوف نے ''ترجمان القرآن'' تجویز کیا۔

اس کتاب میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں تفصیلی کلام کیا، چنانچہ میں نے بھی اس کو خوب اشتیاق کے ساتھ لے کر پڑھنا شروع کیا اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر مکمل پڑھی اور پھر مختلف آیات کی تفسیر دیکھی، تب میرے دل میں لگی اشتیاق کی لَو بجھ گئی اور میں بصد افسوس سوچنے لگا کہ اگر یہ تفسیر طبع نہ ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا؛ اس لیے کہ اس کے مطالعے سے قبل ان کی قدر ومنزلت میرے قلب میں جاگزیں تھی لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے میں نے بھانپ لیا کہ خواہشات کی کارفرمائی ان کو مختلف وادیوں میں لے گئی ہے اور اوہام پرستی نے موصوف کو کہیں کا نہیں چھوڑا، مجھے محسوس ہوا کہ خود رائی وخود پسندی نے پہلے موصوف کو تقلید سے بے بہرہ کیا اور اخیراً صراط مستقیم سے پھسلا کر شاہراہِ باطل پر گامزن کر دیا:

وَكُلٌّ يَدَّعِي حُبًّا بِلَيْلٰى وَلَيْلٰى لَاتُقِرُّ لَهُمْ بِذَاكَا

ترجمہ: ''ہر شخص لیلیٰ کی محبت کا دعوے دار ہے، لیکن لیلیٰ ان کی محبت کا اقرار نہیں کرتی ہے۔''



مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر کے چند قابلِ نقد مقامات

سورۂ فاتحہ کی آیت: "إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (فاتحہ:٦) کی تفسیر میں موصوف اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"دنیا میں رائج مختلف مذاہب وادیان، چاہے نصرانیت ہو، یہودیت ہو، یا صابئیت، اگر کوئی شخص اسی ہیئت پر اس دین کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے جو ہیئت اس دین کے لانے والے نبی لے کر آئے ہیں تو روز قیامت اس کی نجات کے لیے اتنا کافی ہوگا؛ اس لیے کہ ان تمام ادیان کی اصل واساس ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعمال صالحہ ہیں، ہر دین کے شارع نبی توحید لے کر مبعوث ہوئے اور اعمالِ صالحہ کی راہنمائی کی، متبعینِ مذہب میں شرک اور برے اعمال کی آمیزش بعد کی گروہ بندی اور فکری انتشار سے پیدا ہوئی۔"

اپنے اس نظریہ کو موصوف اپنی تفسیر میں بار بار مختلف عنوانات واسالیب کے ساتھ لائے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"قرآن بھی اسی نظریہ وموقف کا پرزور اعلان کرتا ہے۔"

موصوف کا گمان ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں آئی ہے وہی (تعلیماتِ) قرآن کا جوہر ومقصود ہے۔ اپنے اس موقف کی تائید کے لیے قرآن پاک کی درج ذیل آیت بطور استدلال پیش کرتے ہیں:

''إِنَّ الَّذِينَ ءَامَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَرَىٰ وَالصَّبِئِينَ مَنْ ءَامَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَلِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔'' (بقرہ:۶۲)

ترجمہ: ''یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صابئین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر اور روزِ قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے، ایسوں کے لیے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

اعمالِ صالحہ ان کے نزدیک احکامِ تکلیفیہ میں سے ہی نہیں اور موصوف کے نزدیک ان اعمال صالحہ پر (نجات کا) مدار ہی نہیں ہے۔ ایک مقام پر یوں رقم طراز ہیں:

''یہ عبادات اور شرعی اعمال تو محض ظاہر داری اور رسمیں ہیں اور گویا صورتیں اور اجسام ہیں، نہ ان اعمال کو حقیقتِ دین سے کوئی تعلق ہے، نہ دین کی روح سے کچھ رشتہ، اگر کوئی شخص ان اعمال مشروعہ اور احکامِ عبادت کا اعتقادی طور پر منکر ہو تو بھی وہ ضرور مسلمان ہی شمار ہوگا۔''

آیت: ''إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامِ'' (آل عمران:۱۹) اور آیت: ''وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ'' (آل عمران:۸۵) کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اسلام' عمومی دینی وحدت کا نام ہے اور کسی خاص شریعت کے ساتھ خاص نہیں؛ اس لیے کہ یہ تمام ملل وادیان اسی عام وحدت کے داعی اور مکمل سچائی کی طرف بلاتے ہیں، اس دعوت میں تمام ادیان برابر ہیں۔''

یعنی موصوف کے نزدیک ملتِ اسلامیہ، مخصوص اعتقادات وعبادات کا مجموعہ نہیں ہے، موصوف تحریر کرتے ہیں:

”رسوم وشرعی احکام میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اور عبادت کے ظاہری طرز وطریق میں جو فرق عیاں نظر آتا ہے، اس سے تو چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا، چنانچہ یہ اختلاف کوئی اوپری چیز نہیں اور نہ کسی ملامت کا مستحق ہے، لہٰذا اپنے تنگ سینوں کو اس اختلاف کے لیے کشادہ رکھو اور جو تنگی وممانعت تم لوگوں نے گھڑ رکھی ہے، اس کو چھوڑ دو۔“

اگر ایک شخص موسوی شریعت کا اتباع کرے، اس کے مطابق حلال کو حلال اور حرام کو حرام ٹھہرائے، جبکہ اسلام آچکا ہے اور سابقہ شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں، تب بھی موصوف کے وضع کردہ اصول کے مطابق وہ شخص بھی نجات دہندہ مسلمان شمار ہوگا۔

انھی افکار کی مانند دیگر کئی ایسے نظریات ہیں، جنہیں موصوف نے اپنے منفرد طرزِ تحریر وانشا کے ذریعے خوب مزین کر کے پیش کیا ہے اور عربی محاورہ کے مطابق: ”وَغَرَّ النَّاسَ بِخَضْرَاءِ دِمْنَتَهِ“ (اپنے کوڑے کو سبز دکھلا کر لوگوں کو دھوکہ دیا ہے)۔ چنانچہ موصوف نے بے باکی سے اپنے نظریات کو بیان تو کیا، لیکن ان کے پس منظر میں اس کا پیمانۂ علم خالی ہے، نیز ان افکار کے متعلق شور تو بہت سنائی دیتا ہے، لیکن ان کی حقیقت اڑتے غبار کی مانند ہے۔

مذکورہ بالا نکات، موصوف کی تحریر کردہ صریح عبارات کا خلاصہ ہیں، جن کی سوائے اس کے کوئی کسی طرح تاویل نہیں کی جاسکتی کہ صریح عبارات کی نامناسب تاویلات کی جائیں، حالانکہ موصوف نے ان نظریات کو ایسی صریح عبارات میں بیان کیا ہے کہ یہ افکار روزِ روشن کی مانند اور واضح نظر آنے والے شگاف کی طرح ہوچکے ہیں اور بقول کسے: ”وَلَمْ يَتْرُكْ لِشَفْرَةٍ مَحَزًّا“ (چھری رکھنے کے واسطے کوئی جگہ ہی خالی نہیں چھوڑی) یوں ہی یہاں تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا فصیح

وبلیغ شخص جو اپنی اغراض ومقاصد کو فصیح وبلیغ انداز میں بلا کم وکاست ایسی عبارات میں بیان کردینے پر قادر ہو، جن میں کسی قسم کی لکنت باقی نہ رہے، نہ خفا کا شائبہ اور عجمی کمزوری کا خدشہ ہو تو کیا ممکن ہے کہ ایسے شخص کا قلم اپنی غرض کو درست بیان کردینے سے قاصر رہے؟! اور وہ کیونکر ایسی تعبیرات استعمال کرے گا جن سے ان کے متبادر معنیٰ خود اس نے مراد نہ لیے ہوں؟! اور سیاق وسباق اور کلام کی کیفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو معنی قاری کے ذہن میں آتا ہے، اس معنی ومراد سے یہ شخص قاری کی فکر کی تبدیلی کا خواہش مند ہو؟! اور اگر ان تاویلات کو راہ دی جائے تو کیا یہ تاویلات معترض کو شافی وکافی جواب مہیا کرسکیں گی؟! اور مزید قیل وقال سے مستغنی کردیں گی؟! موصوف مزید رقم طراز ہیں:

”اسلام تمام اہلِ ادیان کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اپنے حقیقی دین کو ان باطل اعمال اور خواہشات کی اتباع میں وضع کردہ ان احکام سے پاک کردیں اور اپنے اپنے دین کی بنیادی تعلیمات کو مضبوطی سے تھامیں، اسلام ان سے یہ تقاضا کرتا ہی نہیں کہ وہ اپنے ادیان ومذاہب کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرلیں۔“

انھی تلبیسات وتدلیسات کی مانند دیگر کئی قابلِ گرفت نظریات موصوف نے اختیار کیے ہیں، جو ہلاکت کے گڑھے میں اور دینی تباہی وبربادی کی انتہا تک پہنچانے والے ہیں:

أَلَا تَسْئَلَانِ الْمَرْأَ: مَاذَا يُحَاوِلُ؟! أَنَحْبٌ فَيُقْضٰى أَمْ ضَلَالٌ وَبَاطِلُ

وَكُلُّ امْرِئٍ يَوْمًا سَيَعْلَمُ حَالَهُ إِذَا كَشَفَتْ عِنْدَ الْإِلٰهِ الْخَصَائِلُ

ترجمہ: ”خبردار اے دو مخاطبو! کیا اس شخص سے تم نے پوچھ لیا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟! اگر چیخ وپکار چاہتا ہے تو کرلے یا پھر محض گمراہی اور باطل کا دعوے دار ہے؟! ایک نہ ایک دن ہر شخص اپنے حال سے باخبر ہوجائے گا، جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں خصائل وطبائع ظاہر ہوجائیں گے۔“

رسالہ ”معارف“ (اعظم گڑھ) کی مجلسِ ادارت نے موصوف کی اس تفسیر پر نقد وتبصرہ کے

حوالے سے ایک مفصل مقالہ شائع کیا تھا اور انہوں نے ”ترجمان القرآن“ میں کیے گئے موصوف کے بعض آیات کے ترجموں کا بیس سال قبل (موصوف ہی کے) رسالہ ”الہلال“ میں کیے گئے انہی آیات کے ترجموں کے ساتھ موازنہ کیا اور دونوں ترجموں میں واضح فرق واختلاف نمایاں کیا ہے۔

میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایسے اختراعی نظریات وافکار، جن کی صحت کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے اور ایسی قابل گرفت آراء ہوں، جن پر دلائل قائم نہیں کیے جاسکتے، ایسے امور پر مشتمل کا مقام کیسے بلند ہوسکتا ہے؟!

حیرت ہے کہ رسالہ ”الفتح“ کے مذکورہ مضمون نگار، جنہوں نے موصوف کی تفسیر کی اس قدر تعریف فرمائی اور خوب مبالغہ آرائی برتی ہے، وہ رسالہ ”معارف“ کے رفقاء ومعاونین میں سے ہیں اور ان کو ضرور رسالہ ”المعارف“ کے اس مقالے کے متعلق بھی خوب معلوم ہوگا، اس کے باوجود بھی اتنی مبالغہ آمیزی کیونکر کر گئے؟! معاملہ بڑا ہی سخت اور نازک ہے، (اور عربی محاورے کے مطابق) ”چھری ذبح میں ہڈی تک پہنچ گئی ہے“، آج کوئی بچانے والا نہیں، سوائے اس کے جس پر خدائے پاک رحم فرماویں۔ والی اللہ الاشتکاء!

میں نے جو چند باتیں ان کی تفسیر کے متعلق ذکر کی ہیں، یہ موصوف کے وہ اصول وقواعد ہیں، جن پر ان کی اس تفسیر کی اساس اور بنیاد ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی آیات کو اپنے منشا ومقصد اور خواہش کی طرف پھیر دینا اور ان آیات کی ایسی تاویل کرنا جو نہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور نہ ہی ان سے اللہ راضی ہیں، نہ اس کے متعلق صاحب وحی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی تائید منقول ہے اور نہ ابتدائی مخاطبین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی کوئی توجیہ پیش کی جاسکتی ہے، بلکہ موصوف کی پیش کردہ تفسیر وتاویل کے برخلاف ثابت شدہ اور (سنداً) صحیح بہت سے مقامات ہیں، جن کی تمام تر تفصیلات اس مقام پر بیان کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس رسالہ میں ان پر نقد وتبصرہ کی گنجائش ہے، لہٰذا ہم بعض غفلت خوردہ

اشخاص کو بیدار کرنے اور دھوکہ میں مبتلا افراد کی تنبیہ کی خاطر بعض آیات کے متعلق موصوف کی بیان کردہ تفسیر مختصر نقد کے ساتھ ذیل میں ذکر کیے دیتے ہیں:

① كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (بقرہ:٦٥) کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"مطلب یوں ہے کہ ہوجاؤ ذلت خوردہ، کمتر، مانند بندر کے، انسانیت کے رتبے سے گرے ہوئے، تا آنکہ مروت اور انسانیت کی علامات میں سے کچھ بھی تم میں پائی جاویں۔"

(صفحہ:٢٦١) پر "فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا" (بقرہ:٢٤٣) کے تحت یوں رقم فرماتے ہیں:

"یعنی تمہاری بزدلی کی وجہ سے تو تم مرنے ہی کے لائق ہو، یعنی تم پر دشمن غلبہ پا لے گا اور تم اپنے دشمن پر فتح اور ظفریابی کی زندگی نہ پاسکو گے۔"

"ثُمَّ أَحْيَاهُمْ" "یعنی پھر خدائے پاک نے ان میں عزم واستقلال کی روح پیدا فرمائی کہ قتال کے لیے آمادہ ہوگئے، جس کی بناء پر ان کو دشمن پر مدد اور ظفریابی عطا ہوئی۔"

② (صفحہ: ٢٦٩) آیت "أَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ" (بقرہ:٢٥٩) اس آیت کو بھی ظاہری معنی سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن موصوف اس آیت کے ایک لفظ کے سوا بقیہ تمام الفاظ کو ظاہری معانی ومفاہیم کے مطابق برقرار رکھنے پر مجبور ہوگئے۔

③ "فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ" (بقرہ:٢٦٠) اس آیت کی تفسیر ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی تفسیر کے مطابق کی ہے، ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی یہ تفسیر (جو جمہور کے خلاف ہے) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل فرمائی ہے، مزید برآں مولانا ابو الکلام نے "المنهية" میں جمہور مفسرین کے قول کی خوب تردید وتنقید بھی کی ہے۔ (ملاحظہ ہو: ص: ٢٧٠ تا ٢٧١)

④ "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" (ص:٢٠٠) اس آیت کے معنی میں بھی موصوف، تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر کئی آیات کی ایسی باطل تاویلات ذکر کی ہیں، جو اہل سنت والجماعت اور اکابرین امت کی آرا کے صریح مخالف ہیں۔ موصوف کی پوری تفسیر ایسی بودی و کمزور تاویلات سے اٹی پڑی ہے، جن کی ان آیات میں ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے۔

موصوف کا خاص وطیرہ رہا ہے کہ مختلف آیات کی تفسیر میں احادیث وآثار کی جانب توجہ نہیں کرتے، بلکہ یونانی اور فرانسیسی مؤرخین کی مختلف تاریخی کتب پر ان کا دارومدار ہوتا ہے، چاہے ان کا مدار محض تخمینی وقیاسی آرا وافکار ہی ہوں اور احادیث کی طرف التفات نہیں فرماتے، اگرچہ اس حوالے سے ان بے دلیل تاریخی روایات اور قدیم کتبوں سے زیادہ قوی سند کی احادیث موجود ہوں، ایسے ہی لوگوں کے متعلق باری جل شانہ کا فرمان ہے:

''مَا لَهُمْ بِذَالِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔'' (زخرف: ۲۰)

ترجمہ: ''ان کو اس کی کچھ تحقیق نہیں، محض بے تحقیق بات کر رہے ہیں''۔

اسی طرح یہ بھی ان کی ایک خاص عادت ہے کہ جب بھی کسی تاویل کے متعلق موصوف کوئی رائے قائم فرما لیتے ہیں تو اس کو امر قطعی شمار کرتے ہیں، جس کے مقابل نہ ان کے نزدیک حدیث مرفوع کی کوئی حیثیت ہے، نہ اثر صحیح کی اور نہ ہی درست فکر وتدبر سے حاصل شدہ نتیجہ اس کے مقابلے میں کوئی مقام رکھتا ہے۔

نیز ان کا خاص طریق کار رہا ہے کہ کسی آیت کے متعلق کمزور قول کی مفسرین کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، حالانکہ اس کے علاوہ دیگر کئی صحیح اقوال موجود ہوتے ہیں، پھر اس ضعیف قول کو رد کرتے ہیں اور ان مفسرین ہی کے اقوال میں سے کوئی قول ذکر کر کے یہ باور کراتے ہیں کہ گویا یہ ان کا اختراع کردہ ہے اور وہی سب سے پہلے اس کے پیش کرنے والے ہیں، جبکہ تمام مفسرین کو اس کے متعلق کچھ خبر نہ تھی اور کبھی تو ان مفسرین پر تمسخرانہ طنز بھی فرما دیتے ہیں، موصوف اپنے اسلوب

وانداز میں عرب شاعر کے اس شعر کی مجسم تصویر ہیں:

نَزَلُوْا بِمَكَّةَ فِيْ قَبَائِلِ نَوْفَلٍ وَنَزَلْتُ بِالْبَيْدَاءِ أَبْعَدَ مَنْزِلِ

ترجمہ: ”مخالفین، مکہ میں قبائل نوفل کے ہاں پناہ گزیں ہوئے اور میں میدان میں ان سے کہیں دور مقام پر اترا ہوں۔“

اپنی تفسیر ”ترجمان القرآن“ میں ان کا طرز وانداز کچھ یوں رہا ہے:

وَذِيْ خَطَلٍ فِي الْقَوْلِ يَحْسَبُ أَنَّهُ مُصِيْبٌ فِيْمَا يُلَمِّمُ بِهِ فَهُوَ قَائِلُهُ

ترجمہ: ”لغو اور مہمل باتیں کرنے والا اپنے آپ کو درست خیال کرتا ہے، اسی بنا پر جو خیال اس کے دل میں اترتا ہے، اس کو کہہ ڈالتا ہے۔“

بعض اردو رسائل میں ان کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے برملا یہ اعلان کیا ہے:

”وہ امور و احکام، جن پر نجات اخروی کا دارومدار ہے، جس طرح نماز کے باب میں ”أَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ“ کو بصراحت بیان فرمایا گیا ہے، ان امور واحکام کو بھی اسی تصریح کے ساتھ بیان کیا جانا ضروری تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر صراحت چاہیے تھی اور یہ ضروری تھا کہ قرآن ہی میں ان پر ایمان وتصدیق کا حکم دیا جائے، چنانچہ جن امور پر نجات اخروی کا دارومدار ہے، ان کے علاوہ اگر کوئی حکم آیا ہے اور وہ عقائد کے زمرہ میں داخل نہیں تو اس کا قبول کرنا اور اس کے متعلق عقیدہ رکھنا، کسی شخص پر لازم نہیں ہے۔“

نیز مزید رقم طراز ہیں:

”میرے عقیدے کے مطابق تو حضرت مسیح ابن مریم کا (قرب قیامت کے زمانہ میں) نزول بھی نہ ہوگا۔“

اس پر میں نے موصوف کو لکھ بھیجا کہ آنجناب یہ عقیدہ کیسے اپنا رہے ہیں، جبکہ نزولِ مسیح کے متعلق صحیح اور متواتر احادیث موجود ہیں؟! آپ ان کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟! تو ان کا جواب کچھ یوں تھا:

"نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو علاماتِ قیامت کے سلسلے کیا گیا ہے اور ان کا یہ نزول، عقائد میں شمار نہیں ہوگا۔"

محوِ حیرت ہوں کہ جس نظریہ و عقیدہ کو ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں، اس کی تصدیق کرنا عقائد میں سے نہیں ہے؟! جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بات ارشاد فرمائی اور اس کے وقوع کی خبر دی، پھر اس حدیث کی سند کی صحت اور اس کا اتصال ثابت ہو گیا اور روئے زمین کے مشرق و مغرب میں وہ حدیث، تواتر کے ساتھ نقل کی جاتی رہی ہے تو اس کے بعد بھی اس بات پر ایمان لانے اور اس کی تصدیق کرنے کے لیے کسی اور چیز کا انتظار کیا جائے گا کہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں صریح حکم ارشاد فرمائیں: "عیسیٰ ابن مریم کے نزول پر ایمان لاؤ؟!" صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ موصوف کے نزدیک یہ تصریح نہ صرف حدیث میں ضروری ہے، بلکہ قرآن میں بھی یوں صراحت کی جانی چاہیے کہ عیسیٰ ابن مریم کے نزول پر ایمان لے آؤ۔ کیا حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاک ارشاد: "وكيف أنتم إذا نزل فيكم ابن مريم؟!" یعنی "تمہاری کیا حالت ہوگی جبکہ عیسیٰ ابن مریم تمہارے درمیان اتریں گے؟" کافی نہیں ہے؟! اتنی صراحت سے بھی بڑھ کر کیا صراحت ہو سکتی ہے؟! اور واقعی اس خبر سے بڑھ کر تصریح کیا ہوگی؟! اس کے ساتھ ساتھ اس کا تواتر معنوی ایسا معروف ہے جیسے سورج کا طلوع ہونا زحل سیارے کی رفعت سے مستغنی کر دیتا ہے۔

اگر موصوف کا وضع کردہ قاعدہ مان لیا جائے تو: پانچ نمازوں کا ذکر صراحتاً کہاں وارد ہوا ہے؟! اسی طرح زکوٰۃ کے نصاب اور کفارۂ صوم کے مسائل کہاں صراحتاً ارشاد فرمائے گئے ہیں؟! اسی طرح دیگر کئی احکام، جن کا احاطہ بھی دشوار ہے، وہ کہاں صراحتاً ذکر کیے گئے ہیں؟! اب کیا ان امور کی

فرضیت کا اعتقاد رکھنا بھی ان امور میں سے شمار نہ ہوگا جن پر نجات اخروی کا دارومدار ہے؟! کیا ایسا شخص کافر نہ ٹھہرے گا جو ان امور کی فرضیت کا انکار کرے؟! ہمارے شیخ حضرت امام العصر (مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) اپنے رسالہ "إکفار الملحدین في ضروریات الدین" میں تحریر فرماتے ہیں:

"جب آپ اتنی بات جان گئے تو اب ہم کہتے ہیں: نماز ایک فریضہ ہے، اس کی فرضیت کا اعتقاد بھی فرض ہے، اس کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے اور اس کا انکار، کفر ہے، اسی طرح اس سے بے خبر رہنا اور نہ جاننا اور نہ سیکھنا کفر ہے۔ اسی طرح مسواک کرنا سنت ہے، لیکن اس کی سنیت کا اعتقاد فرض ہے اور اس کا جاننا، سیکھنا سنت ہے، اور اس کا انکار، کفر ہے، اس سے بے خبری محرومی ہے اور اس کا ترک کرنا خدائے پاک کی جانب سے عتاب یا سزا کا سبب ہے۔"

اس رسالہ کے شروع ہی سے تفصیل وطوالت سے کام لینے کا ارادہ نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس مقام پر میں نے محض اس بنا پر خوب تفصیل ذکر کی ہے کہ موصوف کی تفسیر میں مجھے واضح فریب دہی دکھائی دی اور میں اس قسم کے اعتراضات سے چشم پوشی اور تسامح برتنے کو بددیانتی سمجھتا ہوں؛ اس لیے کہ الحاد وزندقہ کی زہریلی ہوائیں اس وقت سارے ہندوستان میں چل رہی ہیں اور اس قطعۂ زمین کے اطراف میں پھیل چکی ہیں اور قرآن کے سمجھنے کا دارومدار ایسی تفاسیر پر رکھا جانے لگا ہے، جن میں عصری تقاضوں کے مطابق دل رُبا تعبیرات ہوں، ان (باطل عقائد ونظریات) سے صرف وہی شخص بچ سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ صحیح فہم عطا فرمائیں، یا وہ شخص جس کا نفس ان بزرگانِ دین کی صحبت میں پاک ہو جن کی صحبت میں قلوب کی حیرت انگیز اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ ان تمام شرائع واحکامات سے، جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے، اس کا سینہ ٹھنڈا اور دل مطمئن رہتا ہے اور ان احکامات میں وہ اپنی کمزور رائے کی بنیاد پر رائے زنی نہیں کرتا۔

پنجاب کے ایک اہل حدیث محترم عالم (مولانا ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ) نے "ترجمان القرآن"

کے رد میں ایک تفسیر تالیف فرمانا شروع کی ہے اور اس کی ایک جلد شائع بھی ہو چکی ہے، لیکن میں اب تک اس کا مطالعہ نہیں کر سکا اور میرا خیال ہے کہ فاضل مذکور نے اس تنقیدی تحریر میں خوب سیر حاصل بحث کی ہوگی، کاش! مولانا ابوالکلام صحیح علم رکھتے اور دین محمدی سے گہرا قلبی شغف ومحبت رکھتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ دورِ حاضر کی ان عظیم ہستیوں میں شمار ہوتے، جن پر زمانہ فخر کرتا اور لوگوں کے قلوب میں ان کی خوب قدر ومنزلت ہوتی، لیکن دین کی محبت، مومن کے دل میں مولانا ابوالکلام کی محبت سے کہیں زیادہ جگہ رکھتی ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ کو ان ناپاک نظریات کے اختلاط سے محفوظ رکھا جائے جو قابل قدر بصیرت اور عقولِ سلیمہ رکھنے والوں کی بصیرت انگیز نگاہوں میں شریعت کی ساکھ کو کمزور کرتے اور اس کی قدر ومنزلت کو گھٹاتے ہیں، اللہ رب العزت ساری امت کو درستگی کی ہدایت نصیب فرمائے اور شاہراہِ مستقیم پر گامزن فرمائے!



عنایت اللہ مشرقی
اور ان کی تفسیر "تذکرہ"

اہلِ باطل کی تفاسیر میں سے ایک عنایت اللہ مشرقی امرتسری کی تفسیر ہے، جس کا نام موصوف نے ''تذکرہ'' رکھا ہے، اس شخص کے احوال، بلند و بانگ پہاڑ پر جلتی آگ سے زیادہ عیاں ہیں، یہ شخص سرسید احمد خان کی راہ پر ہی گامزن ہے، جس کا تذکرہ اسلامی اصولوں کے انہدام کے حوالے سے پہلے گزر چکا ہے، موصوف کی آرا اکثر اصولوں میں سرسید کی آرا کے بالکل موافق ہیں، جب اس نے اپنی مذکورہ تفسیر تالیف کر کے شائع کی تو علمائے حق نے اس کو دیکھ کر بالاتفاق اس شخص کے کفر کا فتویٰ دیا اور اہلِ حق میں سے کسی نے بھی اس فتوے کے متعلق پس و پیش سے کام نہیں لیا، اس ملحد نے اپنے پیش رو کی بدی میں پیروی کرتے ہوئے مزید کیچڑ اچھالا۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے:

> ''اسلام اور راہ راست یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کائنات میں بکھری نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے والا ہر شخص ''مسلمان'' ہے اور ان سے محروم رہنے والا کافر ہے۔''

''اصحابِ جنت'' اور ''اصحابِ نعیم'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو ''یہود و نصاریٰ'' کا نام دیتے ہیں۔''

اوراس کے بالمقابل ''اصحابِ نار'' اور ''اصحاب جحیم'' کی تفسیر یوں کی ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو خود کو ''مسلمان'' کہتے ہیں۔''

اوراپنے اس موقف پر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

''اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصَّالِحُوْنَ.'' (انبیاء:۱۰۵)

ترجمہ: ''اُس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔''

موصوف کا کہنا ہے:

''نیکوکاروں سے مراد اہل حکومت نصاریٰ ہیں؛ اس لیے کہ یہی لوگ روئے زمین کے وارث ہیں اورانہی کی حکومت ہے۔''

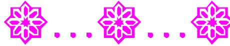
اس ملحد کے نزدیک پل صراط، حساب وکتاب، حشر اور جنت ودوزخ کا کوئی تصور نہیں، بلکہ جنت اوراس کی حور وقصور کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کے نزدیک انعام یافتہ لوگوں سے مراد یہی اہل سلطنت وحکومت ہیں۔ اور ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ'' کا مصداق بھی یہی لوگ ہیں اور جس قوم کو فرماں روائی اور حکومت حاصل نہ ہو تو وہی اس کے نزدیک ''ضالون'' (گمراہ) ہیں اور وہی ''مغضوب علیهم'' (اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق) ہیں۔ نوبت بایں جارسد کہ یہ شخص یہاں تک بھی لکھ گیا ہے:

''عقیدۂ تثلیث کے قائل ہونے کے باوجود نصاریٰ مسلمان ہیں۔''

اس کے نزدیک کفر واسلام کا تعلق عقیدہ وقول سے نہیں، بلکہ صرف عمل کے ساتھ ہے اور اس کے نزدیک اسلام کی بنیاد ان پانچ ستونوں پر ہے ہی نہیں، جن کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ''بني الإسلام علی خمس'' (یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: کلمۂ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) میں ہے، بلکہ نفس وشیطان کے فریب میں آکر اس نے ان کے بجائے خود ساختہ

دس اصول گھڑ لیے ہیں اور اس کے تئیں نماز اور دیگر دینی اعمال و شرعی شعائر پر نجات کا مدار نہیں، البتہ کبھی کبھار اپنی تحریر میں جنت و دوزخ کا تذکرہ کر کے قاری کو شش و پنج میں ڈال دیتا ہے، لیکن یہ بھی دھوکہ دہی اور فریب کاری ہے، ان امور پر اس کا قلبی ایمان ہی نہیں، وہ تو اس کے برخلاف عقیدہ رکھتا ہے، اس کے علاوہ بھی کئی بدتر و نامعقول افکار و خیالات کا حامل ہے۔

بہرکیف موصوف کے کفر کی وجوہات اتنی زیادہ ہیں کہ اس مقام پر اُن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اس نے ''خاکساران'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈال کر لوگوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دی، اس تنظیم کی بنیاد بھی خفیہ سازشیں تھیں، جن کو یہاں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ الهادي إلى الحق!



چند نئی تفاسیر

میرے اس مقدمہ ''یتیمۃ البیان'' کے (پہلی بار) چھپنے کے بعد پچھلے چالیس سالوں کے دوران کئی تفاسیر منظر عام پر آئی ہیں، میری مراد عصر حاضر میں لکھی گئی تفاسیر ہیں، سلف کی وہ قدیم تفاسیر مقصود نہیں، جو اس دوران دوبارہ طبع ہوئی ہیں، جیسے ''تفسیر قرطبی'' اور ''تفسیر قاسمی'' وغیرہ، جو حال ہی میں دمشق سے چھپی ہیں، ان قدیم تفاسیر پر تبصرہ مقصود نہیں، بلکہ یہاں معاصر اہل علم کی تفاسیر پر نقد وتبصرہ پیش نظر ہے، ان میں سے بعض اہل علم ودانش اور ارباب دین وتقویٰ کی تالیف کردہ تفاسیر ہیں اور بعض تفاسیر ایسے لوگوں کی ہیں جن کو معمولی علم حاصل ہے، لیکن ایک مفسر کو جن علوم میں رسوخ وکمال کی ضرورت ہوتی ہے، وہ انہیں حاصل نہیں، یا پھر تیسری قسم میں اہل ہویٰ وخواہش پرستوں کی (تفاسیر) ہیں۔ آخری دو قسم کی تفاسیر میں لائق گرفت وتنبیہ طلب اور قابل مناقشہ ومباحثہ امور ہیں اور ایسے مباحث بھی ہیں جو شاہراہِ مستقیم اور راہ راست سے خارج ہیں۔ افسوس کہ ''یتیمۃ البیان'' کی دوبارہ اشاعت ہونے جارہی ہے، اور اس بار یہ کتاب حذف واضافے کے ساتھ منظر عام پر آئے گی، لیکن میری صحت تفصیلی بحث اور مزید توضیح کی متحمل نہیں، اس لیے اشارات پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوں، امید ہے اہل دانش کے لیے یہ اشارات کافی ثابت ہوں گے۔ واللہ الهادي إلى الصواب!

① معارف القرآن مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

استاذ کبیر، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ عافیت کے ساتھ ان کی

مبارک زندگی میں مزید برکت عطا فرمائے - کی یہ تفسیر آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، اس تفسیر کا ماخذ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''بیان القرآن'' ہے، مولانا نے اس تفسیر میں واضح عبارات میں ''بیان القرآن'' کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اور عصر حاضر کی ضروریات کے پیش نظر مسائل ومباحث کا اضافہ کر دیا ہے، یہ تفسیر ہماری تعریف کی محتاج نہیں؛ اس لیے کہ اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ علماء وعوام سبھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

② معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ استاذ کبیر، علامہ، محدث مولانا محمد ادریس کاندھلوی - رحمۃ اللہ علیہ - کی تفسیر ہے، مولانا سورۂ فاطر کے آخر تک پہنچ پائے تھے اور سورۂ حجر تک تفسیر طبع ہو چکی ہے (بعد میں ان کے صاحب زادے مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تکملہ تحریر فرمایا اور اب مکمل تفسیر چھپی ہوئی دستیاب ہے، از مترجم) یہ قابل قدر تفسیر ہے، جس میں عمدہ ونفیس عبارات ومباحث ملتی ہیں، یہ دونوں تفسیریں، ہندوستان میں رائج اردو زبان میں ہیں۔

③ تفسیر ماجدی مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

اردو کی اس تفسیر میں قرآن کریم کا ترجمہ ہے اور اس میں عربی تفاسیر سے عبارات منتخب کر کے تفسیری فوائد قلم بند کیے گئے ہیں، بعض مقامات میں مولانا بکثرت مواد یکجا کر دیتے ہیں، اس تفسیر میں انگریزی لٹریچر سے جدید علوم اور انکشافات کے متعلق عمدہ تاریخی مباحث بھی ذکر کیے گئے ہیں، اس کا اسلوبِ بیان، انجیلوں، عہد عتیق، کماری اور تلمود (جیسی قدیم کتب) کی مانند ہے، لیکن مؤلف کو علوم دینیہ میں رسوخ حاصل نہیں، عربی علوم یعنی صرف ونحو اور بلاغت سے بھی ادنیٰ واقفیت ہے، عقائد میں تصلب ومضبوطی نہیں، اس لیے اس تفسیر پر کلی اطمینان نہیں کیا جا سکتا، ضرورت ہے کہ کوئی معتبر ومستند عالم دین ابتدا سے انتہا تک حرف بحرف اس تفسیر کا مطالعہ کرے اور اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرے؛ تاکہ ناظرین کے لیے صبح روشن ہو جائے۔

④ تفہیم القرآن مولانا مودودی

بلاشبہ مؤلف موصوف اردو زبان کے باصلاحیت صحافی تھے،صحافت میں ان کو وہبی ملکہ حاصل تھا،طرزِ انشا میں بھی ان کا اسلوبِ تحریر منفرد ہے،کسی موضوع کے مختلف اجزا کو حل کرنے میں ان کا قلم رواں ہے، جو عوام کے لیے جاذبِ نظر اور نئی نسل کے ذہنوں کو اپنی جانب مائل کرنے والا ہے،بعض بحثوں میں موصوف نئے افکار بھی پیش کرتے ہیں،لیکن افسوس صد افسوس کہ موصوف کو دینی علوم میں رسوخ حاصل نہیں، نہ علوم بلاغت وادبِ عربی میں کمال حاصل ہے، چنانچہ موصوف اپنے ادبی ذوق کو بلیغ عربی طرزِ گفتگو سے مقید کرتے ہیں اور ہمیشہ دوسروں کے ملبے پر اپنی عمارت کی بنیاد ڈالتے ہیں،لیکن جب اپنے خاص اسلوب میں اس کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو راہ راست سے ہٹ جاتے اور حق سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ نیز موصوف کی خود رائی اور خود پسندی بعض اوقات ان کے قلم سے ایسا کھیل کھیل جاتی ہے کہ جواُن کے لیے ہمیشہ باعث شرمندگی وجہالت بن جاتا ہے،باوجودیکہ موصوف اردو طرز تحریر وانشا پردازی کے علاوہ ہر فن میں کوتاہ نظر واقع ہوئے ہیں،لیکن ہر مسئلے کے متعلق اپنی تحقیق پیش کرتے اور سلف صالحین کی تحقیر کر جاتے ہیں، یہ پہلو بھی ان کی کتب ورسائل کو عیب دار بنا گیا ہے،اس بنا پر ان کی تفسیر میں کئی قابل گرفت ونقد امور ہیں اور مختلف مباحث پر تنبیہ ومناقشہ کی ضرورت ہے۔ یہ رسالہ اس حوالے سے تفصیلی بحث اور مثالیں تحریر کرنے کی گنجائش نہیں رکھتا،لیکن مشتے نمونہ ازخروارے کے طور پر ہم چند مثالوں پر اکتفا کریں گے:

تفہیم القرآن کے چند قابل گرفت مباحث

① سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد سے متعلق آیات کی تفسیر (ج:۱،ص:۲۸۸،طبع پنجم) میں یوں رقم طراز ہیں:

”جس سوسائٹی میں سود کی نحوست ہو، وہاں حرص، لالچ،بخل،بغض وحسد،آپس میں

نفرت اور غم وغصہ جیسی اخلاقی بیماریاں نشوونما پاتی ہیں، جو لوگ سود دیتے ہیں، ان میں حرص، لالچ اور بخل جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں اور جو سود لیتے ہیں ان میں آپس میں حسد، بغض اور عداوت جیسے امراض فروغ پاتے ہیں، چناں چہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان دونوں قسموں کے افراد پائے جاتے تھے، جس کی بنا پر مسلمانوں کو شکست میں ان بیماریوں کا پایا جانا منجملہ دیگر اسبابِ ہزیمت کے بہت تاثیر رکھتا تھا۔''

ذرا غور فرمایئے! کیا قرآن کریم میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کی شکست میں ان اخلاقی امراض کا کردار تھا؟! اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں:

''وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ۔''

(آل عمران:۱۵۲)

ترجمہ: ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدہ کو سچ کر دکھایا تھا، جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم خود ہی کمزور ہو گئے اور باہم اختلاف کرنے لگے اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھلا دی گئی۔''

اور دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

''إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ''۔ (آل عمران:۱۵۵)

ترجمہ: ''یقیناً تم میں سے جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی، جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے، اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔''

(ذرا ان ارشاداتِ خداوندی اور موصوف کی رائے کا موازنہ کیجیے) کہاں اللہ تعالیٰ کا فرمان اور کہاں موصوف کی بے جا نکتہ آفرینی؟! مان لیا کہ چند نوجوانوں نے اپنے امیر کی حکم عدولی کی، ان کے حکم کی تاویل کی اور مال غنیمت کے حصول کو ترجیح دی تو کیا یہ ان میں حرص وطمع، بخل اور حسد وبغض (جیسے باطنی امراض کے وجود) کا نتیجہ کہلائے گا؟! تسلیم ہے کہ سود کی حرمت کا حکم اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا، لیکن اخلاص کے ساتھ ایمان قبول کر لینے کے بعد یہ مذموم رذائل ان کی طبائع میں اس قدر موثر ہو سکتے تھے؟! ان سب باتوں کو ایک طرف چھوڑ یئے! کیا اللہ تعالیٰ نے ایسے کسی سبب کی جانب اشارہ بھی فرمایا ہے؟! کیا ''بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا'' (ان کے بعض اعمال کے سبب سے) کا مطلب وہی ہے جو استاذ مودودی نے بتلایا ہے؟!

گویا موصوف کو کسی ایسی فرصت کا ہی انتظار تھا کہ جس میں ان پاک باز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے انتقام لے سکیں اور ان پر لعن طعن اور یاوہ گوئی کریں اور وہ ان پر طنز وتشنیع کے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں اس کھلی کج روی سے ہدایت نصیب فرمائے اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی رضا کا پروانہ عطا فرمائے۔

ایک اور عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ موصوف نے سید قطب کی تفسیر ''في ظلال القرآن'' کا مطالعہ کیا اور اس میں غزوۂ احد سے متعلق قرآنی آیات (آل عمران: ۱۲۱ تا ۱۸۹) کی تفسیر سے استفادہ کیا، میرا مقصد یہ ہے کہ سید قطب نے قرآن کریم کی ان انسٹھ (۵۹) آیات کی تفسیر ایک ہی مضمون کی مانند کی ہے اور ان کے ذیل میں لطائف وحقائق آیات کے باہمی ربط وتعلق کو بیان کیا ہے، اس اثنا میں غزوۂ احد کی چند آیات کے بعد جب یہ آیت آئی: ''لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً'' (آل عمران: ۱۳۰) یعنی ''سود مت کھاؤ (یعنی نہ لو اصل سے) کئی حصے زائد (کر کے)'' تو سید قطب نے اس آیت کی تفسیر میں درج ذیل کلمات تحریر کیے:

''معرکۂ احد کے واقعات کے متعلق قرآن کے بیانات کا سیاق وسباق اس جانب بھی توجہات مبذول کراتا ہے کہ اس معرکے کے واقعات کو پیش کرنے اور اس ضمن میں تزکیۂ نفوس اور انہیں شہوتوں کے شکنجے سے آزاد کرنے، حرص وطمع کے بوجھ اور دلوں میں مدفون بغض ونفرت کی اندھیریوں سے نکالنے اور لالچ وبخل اور دیگر چھپی خواہشات سے نجات پانے کے حوالے سے توجیہات کے بیان میں حیران کن مناسبت ہے۔''

آگے طویل تفصیل کے ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

''اس آیت کا بھی ان تنظیمی احوال سے گہرا رابطہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ مضبوط منہج کے موافق امت مسلمہ کی حیات کی بنیاد ہیں، وہ آسمانی منہج جو صرف سیاست وحکومت میں نہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں باہمی مشاورت پر قائم ہے اور سودی نظام کے بجائے باہمی امداد وتعاون پر قائم ہے، باہمی تعاون اور سودی معاملات کسی نظام میں یکجا نہیں ہو سکتے۔''

آگے مزید یوں رقم طراز ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سودی لین دین سے منع کیا، تنگی وکشائش ہر حالت میں مال خرچ کرنے اور اللہ ورسول کی اطاعت کو نزول رحمت کا مدار ٹھہرایا۔''

نیز لکھتے ہیں:

''باہمی تعاون پر قائم معاشرہ، سودی معاملات کی بنیاد پر فروغ پانے والی سوسائٹی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے قریب ہوتا ہے، نیز غصے کو دبانا اور عفو ودرگزر سے کام لینا، نصرت خداوندی کے اسباب میں سے ہیں۔''

اب آپ۔اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے۔ذرا غور فرمایئے! کہاں سید قطب شہید کا یہ فصیح

وبلیغ کلام اور کہاں مودودی صاحب کا وہ عیب دار کلام، جو کانوں سے پہلے دماغ کے لیے بوجھل ہے؟!

استاذ مودودی، سید قطب کے کلام کے جوہر اور ان کی غرض کو پا ہی نہیں سکے، ان کا خیال جس طرف گیا کہہ گئے اور اپنے غلط فہم کی بنا پر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اخلاقی بیماریاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پائی جاتی تھیں اور یہی مسلمانوں کی شکست میں اثر انداز ہوئیں، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون!

بخدا آپ ہی بتائیے کہ جس شخص کی علمی پونجی اتنی ہو اور فہم قرآن کا یہ درجہ ہو تو کیا ایسا شخص قرآن عظیم کی تفسیر لکھنے کا حق دار ہے؟!

میں سمجھتا ہوں کہ تفسیر قرآن کا موضوع ایسی تفاسیر سے بالکل مستغنی ہے، ہندوستان میں موصوف سے قبل بھی اردو میں کئی تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، جن میں مولانا ابوالکلام احمد دہلوی جیسے شخص (کی تفسیر) بھی ہے، جو اردو ادب میں استاذ مودودی سے کہیں زیادہ فائق تھے، بلکہ مودودی صاحب تو ان کے خوانِ ادب کے خوشہ چیں ہیں، مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر کا نام ''ترجمان القرآن'' تجویز کیا تھا، استاذ مودودی بھی اس تفسیر سے استفادہ کرتے ہیں اور اس استفادے کی روشنی میں جو جی میں آئے لکھ ڈالتے ہیں، لیکن موصوف طرز تحریر اور انشا پردازی میں دیگر ادباء سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی منفرد تحقیقات پیش کرنا پسند کرتے ہیں، جو ان سے پہلے کسی نے پیش نہ کی ہوں؛ تاکہ وہی سب سے فائق قرار پائیں، درحقیقت اس سوچ نے بہت لوگوں کو دھوکہ وفریب میں مبتلا کیا ہے، پھر اس جذبۂ سبقت پر اکتفا نہیں ہو پاتا اور انسان جہالت یا گمراہی کی گہری کھائی میں جا گرتا ہے اور بسا اوقات اس گمراہی اور غلطی میں اس کی تقلید کرنے والے بھی سامنے آجاتے ہیں، یوں پیروکار اور سرکار دونوں ہی گمراہ ہو جاتے ہیں۔

④ سورۂ بقرہ میں آسمانوں کی تفسیر کے متعلق مودودی صاحب نے (ج:۱، ص:۶۱ طبع پنجم) کچھ یوں تحریر کیا ہے:

''سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا تعین مشکل ہے، انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے، جو برابر بدلتے رہے ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا، بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراجس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کررکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے، وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔''

موصوف کی یہ تحریر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قرآن کریم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق ان سات آسمانوں کے قائل نہیں، جن کی صفات اوران میں دروازوں کا ذکر قرآن میں ہے، انسانی آراوافکاراوران کے باہمی اختلاف کوچھوڑیئے! یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اپنی صریح اور واضح نصوص میں کیا ثابت کیا ہے؟ کیا سورۂ فصلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں؟

''فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَأَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا.''

(فصلت:۱۲)

ترجمہ: ''سو دو روز میں اس کے سات آسمان بنادیئے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیج دیا۔''

نیز متواتر احادیث کی نصوص کیا ثابت کرتی ہیں؟ خصوصاً واقعۂ معراج کے متعلق قطعی احادیث، جن میں آسمانوں کی کیفیت اوران میں فرشتوں کے وجود کا بیان ہے اوراس کے علاوہ نظام خداوندی اور عجیب وغریب آسمانی نظام کی پردہ کشائی ہے، یونانی ویورپی فلسفے ہمیں نہ سنایئے اور سائنسی علوم اورسائنس دانوں کا آسمانوں (کی حقیقت) تک نہ پہنچ سکنا بھی نہ بتایئے! ان کا ادراک تو آسمان کی فضا میں معلق چمکتے دمکتے ستاروں تک بھی نہیں پہنچ پایا، چاند تک پہنچنے اور ''مریخ'' پر اپنے

خلائی جہاز اتار لینے کے باوجود وہ فضائی کائنات کی وسعت پر حیران وششدر ہیں، ان میں بعض ستارے تو ایسے ہیں کہ سیکڑوں سالوں میں بھی ان کی روشنی زمین تک نہیں پہنچتی اور یہ تمام دیکھے اور اَن دیکھے روشن چراغ آسمانِ دنیا کے نیچے ہی ہیں۔

آپ اس نیلے گنبد (آسمان) کی بلندی اور اس کی چھت کی اونچائی پر غور کیجیے! اور پھر اس ارشادِ خداوندی پر نگاہ ڈالیے:

”أَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا.“

(نازعات:۲۷،۲۸)

ترجمہ: ”بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا فی نفسہٖ زیادہ سخت ہے یا آسمان کا؟! اللہ نے اس کو بنایا (اس طرح سے کہ) اس کی سقف کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا۔“

اور دوسرے مقام پر اس فرمان پر بھی غور کیجیے:

”أَفَلَا يَنْظُرُوْنَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ.“ (غاشیہ:۱۷،۱۸)

ترجمہ: ”کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے۔“

چوں کہ ان سائنس دانوں کی عقلیں اور ادراک آسمانوں تک نہیں پہنچ سکے؛ اس لیے وہ یہ گمان کر بیٹھے کہ یہ سب بس آنکھوں کی قوتِ بصارت کی انتہا اور دیکھنے والے کے لیے ایک خوش نما منظر ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلاشبہ ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ لوگ ناکام ونامراد ہیں؛ اس لیے کہ قرآن کریم نے آسمانوں کے وجود اور ان کی صفات، صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یقینی وقطعی متواتر احادیث نے ان کی تفصیلات اور دیگر احوال بتلائے ہیں، مثلاً یہ کہ آسمان، خدائی فرشتوں کی جائے سکونت ہیں اور ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، (البتہ) اللہ

تعالیٰ کسی مستقر ومکان سے بلند وبالا ہے اور وہ کسی مادی ٹھکانے کا محتاج نہیں، وہ بے نیاز ذات ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور وہی تمام مخلوقات کا خالق اور بلند وبرتر ہے۔

بہرکیف آسمان، اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور موجود ہیں، ان کے متعلق واضح آیات کی صورت میں قطعی دلائل ہیں، ان کا انکار، قرآن کریم کے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے مترادف ہے، جبکہ قرآن کریم، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر ایمان، ضروریاتِ دین میں سے ہے، اور ضروریاتِ دین میں تاویل ان کے انکار کے مترادف ہے۔ جبکہ مودودی صاحب کی ''تفہیم القرآن'' میں ذکر کردہ رائے سے آسمانوں کے وجود سے انکار کا وہم ہوتا ہے اور قرآن وحدیث اور شریعت کے ثابت کردہ نظریہ سے عدم اطمینان جھلکتا ہے، قرآن وحدیث اور شریعت صراحتاً آسمانوں کے وجود اور ان کی حقیقت بتلاتے ہیں تو پھر یہ کہنے پر اکتفا کرنا کہ ''آسمانوں کی حقیقت کی تعیین مشکل کام ہے اور اس حوالے سے لوگوں کی آرا مختلف ہیں''، ایسی کمزور بات کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟! بھلا قرآن کریم کی صریح آیات اور قطعی ویقینی احادیث کے سامنے سائنس دانوں کی آرا کی کیا حیثیت ہے؟! منصف مزاج قاری کو واضح وقطعی دلائل کی روشنی میں مودودی صاحب موصوف کی اس غلط ''تفہیم'' کا وزن خود ہی جانچ لینا چاہیے۔

مزید براں مودودی صاحب نے جب ''في ظلال القرآن'' (ج:۱،ص:۶۲، طبع پنجم) میں پڑھا:

> ''استوا علی العرش کے مفہوم میں کھوج کرید کی گنجائش نہیں، سوائے اس کے کہ استوا سے محض غلبہ واستیلا اور خلق وتکوین کا ارادہ مراد لیا جائے۔ اسی طرح یہاں مقصود سات آسمانوں کے متعلق بھی اس بحث وتحقیق کی گنجائش نہیں کہ ان کی اَشکال وابعاد کی تعیین کی جائے، بلکہ اس نص سے کلی مفہوم مراد لینے پر اکتفا کیا جائے، یعنی مراد کائنات سماوی وارضی کی درستگی وبرابری ہے، یہ پہلو لوگوں کی طرف اس ذات کے

انکار کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے، جو خالق کائنات اور تمام کائنات پر غالب ہے۔“

اگرچہ سید قطب کا یہ کلام اس مقام کے اعتبار سے کوتاہ دامن ہے، لیکن اس پہلو کے علاوہ بالکل بے غبار ہے۔ یہاں صاحبِ تفہیم القرآن، سید قطب کی مرادو مقصود کا ادراک نہ کر پائے اور ان سے سبقت کے جذبے میں جو جی میں آیا لکھ گئے اور یوں گمراہی کے قریب ہو گئے، اب آپ مکرر نگاہ ڈالیے اور دونوں تحریروں کا موازنہ کیجیے، دونوں آرا میں واضح فرق پائیں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مودودی صاحب کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ نہ ان کا دل، قرآن کے بیان پر مطمئن ہے اور نہ ہی حدیث میں ذکر کردہ تفصیل سے ان کا سینہ ٹھنڈا ہے، اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو انصاف سے کام لیتے ہوئے دوراز کار تاویلات نہ کرے، موصوف کی شخصیت سے متاثر اکثر قارئین کا ذہن ان حقائق اور ان کے اندوہناک نتائج تک نہیں پہنچ پاتا، جو خفیہ طور پر ان کے قلب و دماغ میں سرایت کر جاتے ہیں، لچک دار تعبیرات پر فریفتہ نئی نسل کا کیا کہیے! حالانکہ یہ خوش نما تعبیرات کسی مٹکے سے آتی گونج سے زیادہ اہمیت کی مستحق نہیں، اللہ تعالیٰ حق گو ہیں اور وہی حق کی جانب رہبری فرماتے ہیں۔

③ سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

”وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ۔“ (بقرہ:۶۳)

ترجمہ: ”اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر معلق کر دیا۔“

کی تفسیر میں موصوف یوں رقم طراز ہیں:

”اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے، بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا۔“

یہ موصوف کے اعتزالی ذوق کی دلیل ہے، گویا موصوف حسی و حقیقی رفع کے منکر ہیں اور (رفع حقیقی کے بجائے) خوف ناک صورت حال کی تمثیل لائے ہیں، حالانکہ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا صریح فرمان ہے:

"وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ." (أعراف:۱۷۱)

ترجمہ: "اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح ان کے اوپر معلق کر دیا اور ان کو یقین ہوا کہ اب ان پر گرا۔"

ایسی صریح نص اور اس میں واقع لفظ "نتقنا" کے بعد یہ اعتزالی تاویل کیونکر ممکن ہے؟!

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں فرماتے ہیں:

"نتق الشيء" یعنی کسی چیز کو اس طرح کھینچ لینا کہ وہ نرم ہو کر جھک پڑے، باری تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ."

مودودی صاحب موصوف یہاں بھی صاحب "في ظلال القرآن" کی منشا کو نہیں سمجھ سکے۔ سید قطب لکھتے ہیں:

"ایسا عہد و پیمان لیا جو بھلایا نہ جا سکے اور ایسی حالت میں لیا کہ بھلائی نہ جا سکے، یہ عہد اس حالت میں لیا گیا کہ پہاڑ ان کے اوپر سائبان کی مانند معلق تھا، انہوں نے یہ پیمان اس خلاف عادت و خوف ناک سائے میں قبول کیا، جس میں صلاحیت تھی کہ اس عہد کے بعد اوندھا ہونے سے انہیں محفوظ کر سکے، بلاشبہ یہ عہد و پیمان ایک خوف ناک و طاقت ور معجزہ کے سائے میں ان کو دکھایا گیا۔"

صاحبِ "ظلال" کا کلام لفظ "الظلة" کو اس متعارف مفہوم سے خارج نہیں کرتا، انہوں نے اسے ایک خوف ناک معجزے کا نام دیا ہے، مودودی صاحب یہاں بھی تحریف کر گئے اور خوف ناک معجزے کا ترجمہ، خوف ناک صورت حال سے کر کے سروں پر حقیقی طور پر پہاڑ کے بلند

ہونے کو بعید از عقل قرار دے گئے، یہی تحریف ان سے قبل مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں کی ہے۔

۴۔سورۂ انعام کی آیت ہے:

''فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰى كَوْكَبًا.'' (الانعام:۷۶)

ترجمہ:''پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔''

اس آیت کی تفسیر میں تفہیم القرآن (ج:۱،ص:۵۵۶، طبع پنجم) میں موصوف لکھتے ہیں:

''یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے، جو منصب نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہو سکتی تھی، کس کر کے امرِ حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔''

پھر آگے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

''حیرت و تردد کی یہ منزلیں اور مراحل، سفرِ توحید کے دوران سامنے آئے، چنانچہ ان منزلوں میں مسافر کے ٹھہرنے کا کوئی اعتبار نہیں؛ کیوں کہ اس کے بعد مسافر کی آخری منزل، توحید تک پہنچنا ہے، تو اعتبار انتہا کا ہے نہ کہ ابتدائے سفر کا، اور اعتبار جائے قرار کا ہے، سفر کی انتہا سے پہلے مراحل کا اعتبار نہیں۔''

موصوف کی اس تعبیر و تحریر میں کئی قابل گرفت پہلو ہیں:

اول: ہر نبی یا رسول فطری طور پر عقیدۂ توحید پر پیدا ہوتا ہے، یہ عقیدہ اس کے دل میں راسخ ہوتا ہے اور وہ اس پر مطمئن بھی ہوتا ہے، ناممکن ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی لمحہ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کے بغیر گزرے، توحید کے متعلق نبی کا تردد یا حیرت ممکن ہی نہیں۔ حدیث میں وارد ہے:

”کل مولود یولد علی الفطرة، فأبواه یهودانه أو ینصرانه أو یمجسانه.“

ترجمہ: ”ہر بچہ، فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔“

جب ایک عام بچے کی یہ حالت ہوتی ہے تو نبی ورسول بننے کے لیے پیدا ہونے والے بچے کا کیا حال ہوگا؟! اللہ تعالیٰ پر ایمان تو اس کی فطری خلقت میں ہوتا ہے اور اس عقیدے کے لیے وہ کسی قسم کے استدلال کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ تمام استدلالات اور غور وتدبر سے قبل اس فطری صلاحیت سے عقیدۂ توحید کی رہبری پاتا ہے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، اہل حق کے نزدیک یہی عقیدہ برحق ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ استدلال، غور وفکر، کائنات میں کھوج کرید اور اس میں جاری منفرد نظام میں تدبر کے ذریعے وہ یقین سے عین الیقین کی جانب ارتقا حاصل کرلے اور پھر عین الیقین سے حق الیقین کا درجہ پالے، دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باری تعالیٰ سے یہ سوال اس نکتے کو واضح کرتا ہے:

”رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ.“ (بقرہ:۲۶۰)

ترجمہ: ”اے میرے پروردگار! مجھ کو دکھلا دیجیے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے؟!۔“

دوم: مودودی صاحب کا کلام صراحتاً بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، عقیدۂ توحید کے حوالے سے حیرت وتردد کے مراحل سے گزرے ہیں اور پھر استدلال کے بعد توحید تک پہنچے اور ان منزلوں کو طے کرنے کے بعد حق کی رہنمائی پائی ہے، جو ہر مسافر کو درپیش ہوتے ہیں، انبیاء ورسل علیہم السلام کے متعلق یہ رائے غلط اور کھلی گمراہی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ اس مقام پر بھی مودودی صاحب نے سید قطب کی ''في ظلال القرآن'' کی پیروی کی ہے، لیکن موصوف ان کی بات کے درست مطلب تک نہیں پہنچ پائے، اگرچہ یہاں صاحب ''في ظلال القرآن'' کی تعبیر میں بھی کوتاہی ہے۔

بہر کیف بلوغ سے قبل اور بعد کفر وشرک سے انبیاء کا معصوم ہونا، متفقہ عقیدہ ہے اور اس پر امت محمدیہ کا اجماع ہے، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ نبی، عقیدۂ توحید میں متردد ہو، یا حیرت میں رہے، یا کسی سے اس عقیدے کے متعلق دریافت کرے، یا اس تک رسائی کے لیے کوئی استدلال کرے، نبی کی زندگی کے ایک لمحے میں عارضی طور پر اور اثنائے سفر بھی شرک و بت پرستی ممکن نہیں۔

سوم: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کلام تو خصم کے ساتھ مباحثہ ومجادلہ کی قبیل سے، مشرکین کو خاموش کرنے کے لیے اور منکرین پر حجت تام کرنے کی غرض سے تھا، نیز اس میں ان کی گمراہی پر لطیف تنبیہ اور ان کو پھسلن کے مقام سے بچانا مقصود تھا، اہل بلاغت اور حکمت کے ساتھ دعوت دینے والوں کا یہی وطیرہ رہا ہے، وہ بذات خود ہرگز حیرت وشک میں اور حق سے بے بہرہ نہ تھے کہ یوں کہنے کی ضرورت پیش آئے کہ مسافر کو منزل تک پہنچنے سے قبل ان مراحل سے گزرنا ناگزیر ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مودودی صاحب کی تحریروں میں قابل گرفت ونقد مقامات کے یہ چند نمونے ہیں، بعض مقامات، جہاں راہ راست سے ہٹے ہیں، میں نقد سخت ہوگا، یہاں تو صرف کڑکتی بجلیوں میں سے ہلکی سی روشنی دکھلانا مقصود ہے۔ والله ولي التوفيق إلى الهداية!

موصوف کی کتب ورسائل کا ایک عیب یہ ہے کہ بسا اوقات کسی عالم نے انہیں تنبیہ کی کہ فلاں مقام پر آپ کا قلم وقدم پھسلا ہے تو متنبہ ہوکر وہ غلطی کا اعتراف کرتے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے تعبیر کو تبدیل کرکے یہ باور کراتے کہ انہوں نے رجوع کرلیا، یا تاویل کرتے ہوئے تعبیر بدل لیتے اور آئندہ ایڈیشن، تعبیرات کے تغیر وتبدل اور اصلاح کے ساتھ شائع کرتے،

لیکن اپنے رجوع اور تعبیری تبدیلی کا اعلان نہیں کرتے، چنانچہ ان کی کتب کے گزشتہ ایڈیشن جو لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں، لوگ اصلاح وتبدیلی سے ناواقفیت کی بنا پر انہیں جوں کا توں پڑھتے ہیں اور گمراہی میں ہی رہتے ہیں، کاش کہ موصوف ببانگ دہل اپنے رجوع کا اعلان کرتے اور غلطیوں کی اصلاح کرتے تو لوگوں کی نظروں میں ان کا مقام بلند ہوجاتا اور اللہ تعالیٰ ان سابقہ لغزشوں کو معاف فرمادیتے، لیکن صد افسوس کہ نہ انہوں نے اظہار کیا اور نہ ہی رجوع کا اعلان کیا، گویا ان سے غلطی ہوئی ہی نہیں۔

اس نوعیت کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق انہوں نے ذکر کیا:

"ان سے منصب نبوت کے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگئی تھی، اس لیے وہ حکم خداوندی کا انتظار کیے بغیر اپنی قوم کو چھوڑ کر چل دیئے تھے۔"

یہ بات انتہائی نامناسب تھی، چناں چہ اہل علم نے اس غلطی پر متنبہ کیا؛ کیونکہ نبی جب منصب نبوت کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو گویا اس عظیم منصب کی اہلیت ہی نہیں رکھتا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے اس انتخاب وچناؤ میں کوتاہی ہوئی تو تب اللہ تعالیٰ کے علم کا غیر محیط وغیر صحیح ہونا لازم آئے گا۔ بہرکیف اہل علم کی تنبیہ کے بعد موصوف نے اپنی تعبیر بدل لی، لیکن اس کا اعلان نہیں کیا؛ اس لیے پہلے ایڈیشن میں یہ غلطی اب بھی باقی ہے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے جسد عنصری کے ساتھ زندہ حالت میں آسمانوں پر اٹھائے جانے کے متعلق بھی موصوف نے اپنی تعبیر کو اسی طرح تبدیل کرلیا، لیکن عام اطلاع نہیں کی، اس نوع کی کئی اور مثالیں بھی ہیں، اللہ ہمیں بھی اور انہیں بھی راہ ہدایت نصیب فرمائے۔

⑤ تفسیر "تدبر قرآن" اور مولانا اصلاحی

"تدبر قرآن" اردو زبان میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ہے، مؤلف اپنی دیگر تالیفات کی بنا پر معروف شخصیت ہیں، مودودی صاحب کے قریبی رفقاء میں شمار ہوتے تھے اور ان

کے حامیوں سرفہرست تھے، ''جماعت اسلامی'' میں ان کی بیس سالہ رفاقت اور امارت کو تسلیم کرنے کے بعد علیحدگی اختیار کی، علیحدگی کا سبب، مصلحتوں اور عملی حکمتوں کی بنا پر احکام شرعیہ کی تبدیلی کے مسئلے میں مودودی صاحب کے ساتھ ان کا اختلاف تھا۔ مودودی صاحب کی رائے تھی کہ اسلام کے بنیادی مقاصد دو قسم کے ہیں:

۱۔ وہ اساسی مقاصد جن میں تغیر وتبدل کی کوئی گنجائش نہیں، جیسے: عقائد، توحید ورسالت وغیرہ۔

۲۔ جن میں مصلحت وحکمت کی بنا پر تبدیلی ہوسکتی ہے، ان کا کہنا تھا کہ شریعت میں اس قسم کے نظائر بے شمار ہیں، مثلاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اعلان فرمایا تھا:

''الأئمة من قريش.''

ترجمہ: ''یعنی امام وخلیفہ، قریشی ہی ہوسکتا ہے''۔

اور آپ نے معاشرے کے افراد کے درمیان مساوات کے حوالے سے صریح قرآنی حکم کو ترک فرمادیا تھا، قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ.'' (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: ''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔''

موصوف کی اس تحریر پر میں نے اپنے رسالے ''الأستاذ المودودي وشيء من حياته وأفكاره'' میں بھرپور تنقید کی ہے، مزید وضاحت کے لیے مذکورہ رسالہ ملاحظہ فرمائیے۔

استاذ مودودی نے جب اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کا آغاز کیا تو اصلاحی صاحب نے بھی

تفسیر لکھنے کا ارادہ کرلیا؛ اس لیے کہ وہ استاذ مودودی کو علوم عربیت و بلاغت کے حوالے سے کوتاہ سمجھتے تھے اور مولانا اصلاحی ان خصوصیات میں ان سے فائق تھے۔ چناں چہ مولانا اصلاحی نے ”تدبر قرآن“ کے نام سے ایک تفسیر لکھنی شروع کی اور تین ضخیم جلدوں میں سورۂ بنی اسرائیل تک پہنچے، مجھے امید تھی کہ یہ تفسیر علمی غلطیوں سے محفوظ ہوگی، لیکن افسوس کہ جب میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا اور بلا استیعاب مختلف مقامات کی ورق گردانی کی تو کئی ایسے مباحث نظر آئے، جن میں موصوف نے جمہور مفسرین اور ائمہ اہل سنت والجماعت کی مخالفت کی ہے، یوں میری امیدیں ناکام ثابت ہوئیں اور متوقع مسرت مکدر ہوگئی، حالانکہ مجھے امید تھی کہ یہ حسرت ہر قسم کے تکدر سے پاک ہوگی، چنانچہ مولانا اصلاحی نے درج ذیل آیات کی تفسیر میں جمہور مفسرین کی مخالفت کی ہے:

① ”وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ۔“ (البقرہ:۶۳)

② ”فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا۔“ (البقرہ:۷۳)

③ ”وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا۔“ (آل عمران:۳۷)

④ ”وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ۔“ (النساء:۱۵۹)

تفصیل کے لیے درج ذیل حوالے ملاحظہ کیجیے: (ج:۱،ص:۱۹۹، ج:۱،ص:۲۰۵، ج:۱، ص:۶۸۰، ج:۲،ص:۱۹۵)۔

یوں میرا اعتماد خائب وخاسر ہوگیا، یہ تفسیر بحث وتحقیق کے ساتھ بالا ستیعاب مطالعہ کی محتاج ہے، اگر مؤلف محترم خود ہی بے لاگ تنقید اور بلاتعصب تحقیق ومراجعت کریں تو اپنے بہت سے رجوع فرمالیں گے، واللہ الهادي إلى الحق!

⑥ ”في ظلال القرآن“ اور سید قطب

بلاشبہ مؤلف موصوف، عربی ادب میں مہارت اور جدید ادبی اسلوب تحریر میں خداداد ملکہ

رکھتے ہیں، حسنِ تصویر اور خوب صورت منظر کشی میں انہیں بے پناہ قدرت حاصل ہے، ان کے کلام میں رونق اور خوب صورتی نمایاں ہے، آیاتِ قرآنیہ کے باہمی ربط کے حوالے سے کافی حد تک باتوفیق ہیں، مختلف آیات کو ایک ہی عنوان کے تحت نہایت عمدگی کے ساتھ یکجا کر دیتے ہیں، جن سے ان میں باہمی مناسبت اور ربط و تعلق واضح ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر آیت اگلی اور پچھلی آیت سے جڑی ہوئی ہے اور ان میں کوئی افتراق وانتشار نہیں، ان کی تفسیر کا یہ امتیاز باریک بینوں کے نزدیک قابل قدر اور لائق اعتنا ہے، میرا خیال ہے کہ موصوف قرآن کو اس کی پاکیزہ روح کے ساتھ امت کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، لیکن بعض پہلوؤں سے کوتاہی دکھائی دیتی ہے اور کہیں کہیں تو راہ راست سے ہٹنے کا واہمہ بھی ہوتا ہے۔ افسوس کہ سر دست میرے لیے اس تفسیر کی مزید تحقیق ممکن نہیں اور نہ ہی اس کو کھنگالنے کی فرصت ہے۔

سید قطب کی کتاب "العدالة الاجتماعية" کے بعض مباحث بھی قابل نقد ہیں، خصوصاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق انہوں نے رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "حضرت عثمان، مروان کے ماتحت تھے، وہ انہیں جیسے چاہتا ہانکتا تھا، وہ اصحابِ رسول اللہ کو برطرف کر کے اعدائے رسول اللہ کو مناصب حکومت سونپا کرتے تھے، اور ان کا عہد خلافت میں ایک شگاف ہے۔"

اس کے علاوہ بھی خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کے متعلق کئی نازیبا باتیں انہوں نے لکھی ہیں، حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں بہت سے مناقب منقول ہیں، سید قطب کے انہی مباحث نے مودودی صاحب کو "خلافت وملوکیت" میں ہفوات تحریر کرنے کی جرأت دی اور سید قطب کے انہی مباحث نے مجھے ان کے تفسیری مباحث سے بے اطمینان کر دیا اور ان کی دیگر تحقیقات پر بھی اعتماد نہیں رہا، حالانکہ معاصر نوجوان اُدباء ان کے دلدادہ اور ان کی تحریروں پر فریفتہ ہیں۔

بلاشبہ قرآن کریم کی تفسیر اوراس کا حق ادا کرنا انتہائی دشوار تر اور نازک ترین کام ہے، سید قطب کے متعلق مذکورہ گزارشات محض اپنا دینی فریضہ ادا کرنے کی غرض سے تحریر کی ہیں، ورنہ ایک صالح نظام کے قیام کے لیے ان کی اخلاص پر مبنی جدوجہد کا میں قدردان ہوں، جن کے نتیجے میں انہیں اس راہ میں تکلیفیں سہنی پڑیں، ناکامیوں اور محرومیوں کو برداشت کرنا پڑا، اور آخر کار جان کا نذرانہ بھی پیش کیا، اللہ تعالیٰ ان کو ان خدمات اور راہِ حق میں جان قربان کرنے کا بہترین صلہ وبدلہ نصیب فرمائے۔ واللہ الموفق!



قرآن کریم کی مختلف وجوہِ اعجاز جن کے ذریعے اقوامِ عالم کو چیلنج کیا گیا

گزشتہ صفحات میں ذکر کردہ مباحث کی بنا پر میں مقصودی بحث سے بہت دور نکل گیا تھا، اب میں دوبارہ مقصود کی جانب لوٹتا ہوں اور مقصد کی جانب لوٹنا پسندیدہ بھی ہے، قرآن کریم کی وجوہ اعجاز کے متعلق یہ موضوع گزشتہ تمام موضوعات سے اہم بلکہ ان کی روح ہے۔

گزشتہ مباحث سے یہ نکتہ واضح ہوا کہ قرآن کریم کی تفسیر مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور بعض مفسرین نے ان میں سے کسی ایک پہلو کو لیا اور اپنے زمانے و احوال کے مطابق تفسیر تالیف کر کے حظ وافر حاصل کرنے میں کامیابی پائی، بلاشبہ اللہ کی یہ کتاب دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے، جس کا اعجاز مرورِ زمانہ کے باوجود برقرار رہے گا، اس کے ذریعے خطبائے زمانہ اور فصحائے عرب کو چیلنج کیا گیا اور انہیں مقابلہ ومجادلہ کی دعوت دی گئی، خواہ انسان ہوں یا جنات، لیکن بلند درجہ فصحاء گنگ رہ گئے اور ان کی ادبی برق انگیزیاں ماند پڑ گئیں، آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عرب کے باشندے فصاحت وبلاغت میں کتنا بلند مقام رکھتے تھے؟! ان کے حیرت انگیز قصائد، رجزیہ اشعار، مختصر وطویل فصیح وبلیغ خطبے، زوردار مسجع کلام، آراستہ پیراستہ نظمیں اور دلنشیں نثری کلام (کا ذخیرہ کتب ادب میں) بکھرا پڑا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ عاجز ودرماندہ رہ گئے، ان کی قرآن کے مقابلے کی آرزوئیں ختم ہو گئیں، انہوں نے قولاً، عملاً اور اعتقاداً قرآن پر پختہ یقین کر لیا، ان کا عجز اس قدر ظاہر وباہر ہوا کہ کسی بھی صاحب فہم وفراست کو اس میں شک نہیں۔

قرآن کی مثال اس بلند و بانگ خطیب کی سی ہے، جو کھلے بندوں اپنے نظم ونسق کے حسن اور ضبط ووصف کی عمدگی کا واشگاف اعلان کرے، اسی طرح قرآن، حکماء وفلاسفہ تمام انسانوں کے سامنے ببانگ دہل نظام کے قوانین، تہذیب کے دستور، ارتقا وترقی کے رموز واشارات، سیاست کی روح، ادارت کے ضوابط اور حکمت وموعظہ حسنہ کے ساتھ خلق خدا کو اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور کلام کے ضمن میں ایسے امور کے متعلق قطعی دلائل قائم کرتا ہے، جنہیں حکماء وفلاسفہ محال یا بعید از عقل خیال کرتے ہیں، ان دلائل سے سینے ٹھنڈے اور قلب ودماغ مطمئن ہوتے ہیں، اگر وہ عقل کو گہرے غور وفکر کا موقع فراہم کریں اور ہر قسم کی کج روی والحاد اور حسد وعناد سے اپنی طبیعتوں کو پاک کرلیں (توان دلائل سے انہیں قلبی طمانینت حاصل ہوسکتی ہے)۔

بلاشبہ دنیوی علوم وفنون میں جس قدر ارتقا ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کے عجائبات بھی اتنی تیزی سے صفحۂ عالم پر روشن ہوتے جارہے ہیں، نیز قرآن کریم کے ذوقی ووجدانی اور برہانی ویقینی عجائبات بھی اپنا لوہا منواتے جارہے ہیں، قرآن کریم گزرتے زمانوں کے ساتھ ساتھ یونہی اپنی صفت اعجاز پر برقرار رہے گا، نہ کبھی پرانا ہوگا نہ بوسیدہ ہوگا اور دنیا کے آخری لمحات تک یوں ہی رہے گا۔

راقم سطور نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں اپنے ایک قصدہ میں کہا تھا:

مُحَمَّدٌ جَاءَ بِالْقُرْآنِ مُعْجِزَةً ... دَامَتْ لَنَا رَوْضَةٌ مُخْضَرَّةٌ أُنُفًا
أَحْكَامُهُ الْغُرُّ أَضْحَتْ لِلأَنَامِ هُدًى ... آيَاتُهُ أَنْجُمٌ تَهْدِي الْوَرٰى طَرَفًا
أَلْفَاظُهُ نُسِّقَتْ دُرٌّ مُنَضَّدَةً ... دَقَّتْ لَطَائِفُهُ لَا تَرْتَجِي لُطْفًا
كَالنَّجْمِ إِذْ لَمَعَتْ وَالشَّمْسِ إِذْ سَطَعَتْ ... وَالْعَيْنِ إِذْ نَبَعَتْ وَالصَّوْبِ إِذْ وَطَفَا
فَاقَتْ حَقَائِقُهُ رَاقَتْ دَقَائِقُهُ ... يَهْدِيْكَ نُوْرًا مُبِيْنًا لِلْقُلُوْبِ شِفَا
فَاحَتْ حَدَائِقُهُ سَاحَتْ عَجَائِبُهُ ... صَوْبٌ دَرُوْرٌ كَمَوْجِ الْبَحْرِ مَا نَشَفَا

بَحْرٌ عَظِيْمٌ إِذَا مَا غُصْتَهُ نَظَرًا يُجْدِيْكَ دُرًّا ثَمِيْنًا غَالِيًا تُحَفًا
فَاقَتْ بَلَاغَتُهُ أَعْلٰى ذُرٰى قُلَلٍ حَارَ الْعُقُوْلُ هُنَا عَنْ كُنْهِهَا رَهَفًا

ترجمہ: ''① محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنی معجزہ کے ہمراہ تشریف لائے، جو ہمارے لیے دائمی سرسبز وشاداب باغ کی مانند ہے۔

② قرآن کریم کے روشن احکام، خلقِ خدا کے لیے ہدایت کا سامان ہیں اور اس کی آیات، ستاروں کی مانند ہیں، جن سے لوگ راہ یاب ہوتے ہیں۔

③ قرآنی الفاظ بہترین ترتیب پر پروئے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں اور اس کے لطائف ومعارف انتہائی دقیق ہیں، جن کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

④ گویا قرآن کریم دمکتا چاند، روشن سورج، بہتا چشمہ اور برستی بارش ہے۔

⑤ اس کے حقائق بلند وبانگ ہیں اور اس کے دقائق خوش نما ہیں، جو واضح نور کی طرف تمہاری رہبری کرتے ہیں، جو دلوں کی شفا کا باعث ہے۔

⑥ قرآن کریم کے روحانی باغات کی خوش بو خوب مہکتی ہے، اس کے عجائبات بہتے چلے جارہے ہیں، گویا یہ ایسی موسلا دھار بارش ہے جو سمندر کی موجوں کی مانند کبھی خشک نہ ہوگی۔

⑦ یہ ایک وسیع سمندر ہے، جس میں آپ غور وفکر کرنے کے لیے غوطہ زن ہوں تو آپ کو قیمتی لعل وجواہر کے تحفے عنایت کرے گا۔

⑧ اس کی فصاحت وبلاغت بلند وبالا پہاڑوں کی چوٹیوں سے فائق ہے، یہاں عقلیں اپنی کمزوری کی بنا پر اس بلاغت کی حقیقت کے متعلق حیران وششدر ہیں۔''

مذکورہ تمہید کے بعد سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز کس جہت سے

ہے؟ اور یہ قرآن، اللہ تعالیٰ کی حجت بالغہ اور معجزۂ ناطقہ بن کر قرنِ اول کے لوگوں کی فصاحت و بلاغت، زبان کی تیزی، اور طلاقت لسانی پر کیونکر غالب ہو کر رہا؟ امام قاضی ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ ''إعجاز القرآن'' (ص:۱۰ مکتبہ سلفیہ) میں تحریر فرماتے ہیں:

''وقد كان يجوز ممن عمل الكتب النافعة في معاني القرآن وتكلم في فوائد من أهل العربية وغيرهم من أهل صناعة الكلام أن يبسطوا القول في الإبانة عن وجه معجزته، والدلالة على مكانه، فهو أحق بكثير مما صنفوا فيه من القول في الجزء ودقيق الكلام في الأعراض، وكثير من بديع الإعراب وغامض النحو، فالحاجة إلى هذا أمسّ، والاشتغال به أوجب، وقد قصر بعضهم في هذه المسألة حتى أدّى ذلك إلى تهول قوم منهم إلى مذاهب البراهمة فيها، ورأوا أن عجز أصحابهم عن نصرة هذه المعجزة يوجب أن لا يستنصر فيها، ولا وجه لها حين رأوهم قد برعوا في لطيف ما أبدعوا، وانتهوا إلى الغاية فيها أحدثوا ووضعوا، ثم رأوا ما صنفوا في هذا المعنى غير كامل في بابه، ولا مستوفى في وجهه، قد أخل بتهذيب طرقه، وأهمل ترتيب بيانه''.

''صنعت کلام عرب (عربی گرائمر) کے ماہرین علمائے ادب وغیرہ نے معانی قرآن کے متعلق مفید کتب تحریر فرمائیں اور فوائد قرآنی کے متعلق کلام فرمایا، اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ قرآن کریم کا سبب اعجاز ظاہر کرتے اور اس کے بلند مرتبہ ومقام کو واضح کرتے، جزء لایتجزی اور اعراض کے متعلق دقیق نکتہ سنجیوں اور بہت سے مشکل نحوی و اعرابی مباحث کے متعلق تصنیفات سے زیادہ یہ

موضوع اس کا حق دار تھا کہ اس کے بارے میں کلام کیا جائے؛ کیونکہ اس کی ضرورت زیادہ ہے اور اس میں اشتغال زیادہ ضروری ہے۔ بعض اہل علم نے اس مسئلے کے حوالے سے کوتاہی برتی، نیتجتاً ایک جماعت اس کے متعلق فرقہ براہمہ کے نظریہ ومذہب کی جانب مائل ہوگئی اور یہ رائے قائم کرلی کہ جب اس معجزے کی مدد سے خود علمائے اسلام عاجز ہیں تو ان کا تعاون نہیں کرنا چاہیے اور قرآن کے اعجاز کا کوئی قابل التفات سبب ہے ہی نہیں، اس طبقے نے یہ نظریہ اس وقت قائم کیا جب انہوں نے علمائے عرب کی دقیق نکتہ سنجیوں اور اپنے وضع کردہ علوم وفنون کے متعلق اعلیٰ کاوشوں کو دیکھا اور پھر اس موضوع کے حوالے سے ان کی تصانیف پر نگاہ ڈالی تو انہیں اپنے موضوع پر نامکمل اور سبب اعجاز کے بیان سے قاصر پایا اور اسباب اعجاز کی تہذیب میں مخل اور اس کے بیان کی ترتیب میں مہمل دیکھا۔''

''اعجازِ قرآنی'' کے موضوع پر لکھی گئی کتب

اعجاز قرآن کا ایک مستقل موضوع ہے، جس پر قدیم وجدید دور میں مستقل کتب لکھی گئی ہیں، میرے علم کے مطابق اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ابو عثمان جاحظ (متوفی: ۲۵۵ھ) نے تصنیف کی جو ''البیان والتبیین''، ''الحیوان'' اور ''البخلاء'' جیسی ادبی کتب کے مؤلف ہیں، انہوں نے اس حوالے سے ''نظم القرآن'' کے نام سے کتاب تالیف کی ہے۔ قاضی ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''إعجاز القرآن'' میں اس کتاب کا تعارف یوں کرایا ہے:

''جاحظ نے بھی نظم قرآنی کے متعلق کتاب تصنیف کی، جس میں اپنے پیش رو علماء کے ذکر کردہ مباحث میں کوئی اضافہ نہیں کیا اور اس موضوع کے اکثر مباحث میں موجود التباس کی وضاحت نہیں کی۔''

ہم امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ پر تو نکتہ چینی نہیں کریں گے، جیسے فاضل ادیب (مصطفی صادق) رافعی رحمۃ اللہ علیہ

نے بھی ان کے کلام سے چشم پوشی برتی ہے، لیکن جاحظ کو ہم اس پہلو سے معذور سمجھتے ہیں؛ اس لیے کہ وہ اس موضوع کے سب سے پہلے مصنف ہیں اور انہیں تقدم وسبقت کا شرف بہر حال حاصل ہے۔

پھر شیخ ابوعبداللہ واسطی معتزلی (متوفی: ۳۰۶) نے "إعجاز القرآن في نظمه وتاليفه" کے نام سے اس موضوع پر کتاب تصنیف کی، صاحب "کشف الظنون" اور علامہ ابن الندیم رحمہما اللہ دونوں نے اپنی کتابوں میں اس تالیف کا تذکرہ فرمایا ہے، لیکن ہم تاحال اس کتاب سے مطلع نہیں ہو سکے۔ البتہ صاحب "أسرار البلاغة" و "دلائل الإعجاز" شیخ عبدالقاہر جرجانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۴۷۴ھ) نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھی ہیں، جن میں مفصل وضخیم شرح کا نام "المعتضد" ہے اور دوسری مختصر شرح کا نام ہمیں معلوم نہیں، (علامہ جرجانی جیسی بلند پایہ شخصیت کی جانب سے اس کتاب کی شرحیں لکھنا ہی) اس کتاب کے شرف وفضیلت کے لیے کافی ہے۔

بعد ازاں ابوالحسن علی بن عیسی رمانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۳۸۲ھ) نے "إعجاز القرآن" کے نام سے لگ بھگ تیس صفحات پر مشتمل مختصر رسالہ لکھا، جو حال ہی میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی (انڈیا) سے چھپا ہے اور میں اس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ دورِ حاضر میں علوم بلاغت کے متعلق اہل علم کی لکھی گئی کتب کی بہتات کے پیش نظر اس رسالے کے مباحث زیادہ بلند پایہ نہیں۔ شیخ رافعی سے اس رسالے کے مصنف کے نام میں تسامح ہوا ہے، انہوں نے مصنف کا نام "ابوعیسی رمانی" ذکر کیا ہے، جب کہ ابن ندیم وعلامہ ابن خلکان رحمہما اللہ وغیرہ کے بیان کے مطابق درست نام "ابن عیسی" ہے۔

پھر امام قاضی ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۴۰۳) نے جو علم کے بحرِ بیکراں، مشہور محقق ومتکلم، شیخ اہل سنت ولسان امت تھے، "إعجاز القرآن" کے نام سے معروف کتاب تصنیف فرمائی، شیخ رافعی نے امام موصوف اور ان کی اس کتاب کی مدح وستائش اور اس سے استفادے کے باوجود

اس کی حیثیت کم تر بتلائی ہے، لیکن راقم کہتا ہے: اس کتاب کی بنا پر امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تمام امت اور خصوصاً فاضل رافعی پر بڑا احسان ہے؛ اس لیے کہ قاضی صاحب موصوف نے ہی اعجاز قرآنی کے متعلق طریقۂ استدلال واضح کیا اور امت کے لیے دلائل مہیا فرمائے، ان کی اس کتاب کی تصنیف کو ایک ہزار برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن کتاب آج بھی تر وتازہ معلوم ہوتی ہے اور اس دور میں علوم کی تدوین اور کتب کی تالیف کی بہتات کے باوجود علمائے زمانہ اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتے، پھر ان ادوار میں اس کی اہمیت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ جب مدون علوم اس درجے تک نہیں پہنچے تھے اور تمام علوم خصوصاً علوم بلاغت کی تدوین مکمل نہیں ہوئی تھی؟! علوم فصاحت وبلاغت کے محلات کی تکمیل تو امام اہل سنت شیخ عبدالقاہر جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوئی ہے، جب یہ علوم پختہ ہی نہ ہوئے تھے تو کامل کیوں کر ہوتے؟! امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو ایسی عمدہ تعبیرات سے مزین کیا ہے کہ عقل وفہم عش عش کر اٹھتی ہے اور قدم وقلم جھوم جھوم جاتے ہیں۔

صاحب ''إتقان'' وصاحب ''کشف الظنون'' وغیرہ کے بیان کے مطابق محدث شہیر، امام احمد بن محمد خطابی بستی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۳۸۸ھ) یعنی صاحب ''معالمُ السنن'' نے بھی اس موضوع پر تصنیف فرمائی ہے اور ان کے بعد ابن سراقہ (۱) اور رویانی رحمہما اللہ نے بھی قلم اٹھایا ہے، شاید رویانی سے مراد ابوالمحاسن رویانی ہیں، جو اکابر علمائے شوافع میں سے ہیں اور ''بحر المذاهب'' اور ''مناصیص الشافعیة'' کے مصنف ہیں، ان کا انتقال ۵۰۶ھ میں ہوا تھا۔

---

(۱) فاضل رافعی نے ابن سراقہ کی حق تلفی کی ہے، بل کہ ان کے متعلق حد سے تجاوز کیا ہے، ان کی کتاب کے متعلق موصوف کا کہنا ہے: ''اگر ان کی کتاب لوگوں کے لیے مفید ہوتی تو روئے زمین پر باقی رہتی۔'' راقم کہتا ہے: موصوف ایک ایسی کتاب کی منزلت کو کیوں گھٹاتے ہیں، جس کے مصنف کا خود اعتراف ہے: ''اعجاز قرآن کے سبب میں علماء کا اختلاف ہے اور انہوں نے بہت سے اسباب ذکر کیے ہیں، سبھی مبنی بر حکمت اور درست ہیں، لیکن وہ سب وجوہ اعجاز کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ پائے۔'' یہ عبارت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الإتقان'' میں اور خود رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب میں درج کی ہے۔

نیز اس موضوع پر امام رازی (متوفی:۶۰۶ھ)، ابن ابی اصبغ (متوفی:۶۵۴ھ) اور شیخ زملکانی (متوفی:۷۲۷ھ) رحمۃ اللہ علیہم کی بھی تالیفات ہیں، فاضل رافعی کا کہنا ہے: شاید یہ کتابیں ایک دوسرے سے مستفاد ہیں، ممکن ہے کہ یہ تالیفات گونا گوں خوش نما اسالیب اور عمدہ تعبیرات پر مشتمل ہونے اور اسباب اعجاز کے اظہار کے حوالے سے پر رونق اور جمال آویز ہوں، لیکن افسوس کہ ان میں بہت سے بیش بہا اور قیمتی خزانوں سے امت تا حال فائدہ نہیں اٹھا پائی، شاید اللہ تعالیٰ مستقبل میں کوئی سبیل پیدا فرمادے۔

ابن الندیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''الفہرست'' میں مذکورہ کتب کے علاوہ مزید دو کتابوں کا ذکر کیا ہے:
ایک ابن اخشید رحمۃ اللہ علیہ کی ''نظم القرآن'' اور دوسری ابو علی حسن بن علی بن نصر رحمۃ اللہ علیہ کی ''نظم القرآن''، نیز اعجاز قران کے موضوع پر علامہ قاسم بن فیرہ شاطبی شافعی اور مطرزی رحمہما اللہ کے رسالوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

اس موضوع پر متقدمین ومتاخرین اہل علم کی یہ دس سے زائد کتابیں میرے علم میں ہیں، بعدازاں طویل تر زمانہ گزرجانے اور ان ائمہ امت کے بعد نابغہ روزگار مصری ادیب اور ادبائے زمانہ کے سرخیل، ادیب فاضل مصطفی صادق رافعی مرحوم اس میدان میں آئے، موصوف دور حاضر کے اُدباء میں سے ہیں، انہوں نے معاصر ادبی اسلوب میں اپنی کتاب ''إعجاز القرآن'' تالیف کی، جو مباحث پچھلے اہل علم نے اجمالاً ذکر کیے تھے، موصوف نے ان کی تفصیل وتوضیح کی، جہاں انہوں نے اشارات سے کام لیا تھا، موصوف نے ان بحثوں کو واضح کیا، نیز دور حاضر میں ارتقا پذیر علمی وفنی مباحث اور ان کی روشنی میں اعجاز قرآنی کے پہلوؤں کو آشکارا کیا اور ائمہ سابقین کی تحریروں کے ان پہلوؤں کی توضیح وتشریح کی جو اشارتاً تھیں، البتہ موصوف کے بارے میں وہی کچھ کہنا مناسب ہوگا جو خود انہوں نے قاضی باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے:

''موصوف، عبارت آرائی میں باکمال اور زبان کے اعتبار سے کافی حد تک کشادہ واقع ہوئے ہیں، فنی مہارت وپختگی اور حسن تصرف کی اضافی صلاحیتوں کے ساتھ جاحظ اور ان کے مقلد ابن العمید کی راہ پر گامزن ہیں۔''

فاضل رافعی، جاحظ کا اسلوب بیان رکھتے ہیں، تعبیر وتزئین کی گہرائیوں میں غوطہ زن رہے ہیں اور انشا کے میدان میں ان کا قلم خوب طرب انگیز رقص کا مظاہرہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کو قرآنی بلاغت کا اعتراف کرانے سے قبل اپنی فصاحت وبلاغت کا گرویدہ بنانے میں کوشاں ہیں، عبارت کی روانی ایسی ہوتی ہے کہ بعض اوقات کلام کی مراد سمجھ نہیں پڑتی۔

ادیب رافعی نے ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ''المثل السائر'' سے خوب استفادہ کیا ہے، لیکن اس کی صراحت نہیں کی، اس کے باوجود میں ان کے فضل وکمال اور دل میں ان کے اسلوب تحیر وانشا کی قدر ومنزلت اور عظمت کا انکار ہرگز نہیں کروں گا، لیکن خواہش ہے کہ کوئی معاصر ادیب ہمت کرکے اصل کتاب کے حجم کے ایک تہائی حصے میں اس کی تلخیص واختصار پیش کردے، بلکہ ایک تہائی بھی زیادہ ہوگا، تب یہ تلخیص علوم بلاغت کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہوگی اور ان شاء اللہ طلبائے علم بلاغت کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

اعجاز قرآن کے موضوع پر مذکورہ مستقل کتب کے علاوہ امت محمدیہ کے باکمال علمانے اپنی دیگر تالیفات میں جو لعل وجواہر بکھیرے ہیں، اگر انہیں ایک کتاب میں یکجا کردیا جائے تو علم بلاغت کے گلے کے لیے ایک گراں قیمت ہار تیار ہوجائے گا اور وہ تالیف، ذخیرۂ علم وادب کی روشن جبیں ثابت ہوگی، ان منتشر مباحث میں کچھ شیخ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی گراں قدر کتابوں ''أسرار البلاغة'' اور ''دلائل الإعجاز'' کے مختلف مباحث کی ضمن میں، امیر یمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الطراز'' میں اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''نهاية الإيجاز'' میں ذکر فرمائے

ہیں، اگرچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ دو کتابوں سے ہی انتخاب کیا ہے، لیکن اس کو اختصار کہنے کی تعبیر بھی مجازی ہے۔ اسی طرح علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں مثلاً: ''بدائع الفوائد''، ''مدارج السالکین'' اور ''کتاب الفوائد'' وغیرہ میں اعجاز قرآنی کی انواع کے متعلق مختلف لطائف ونکات بکھیرے ہیں، علاوہ ازیں متاخر مفسرین نے بھی اس موضوع کے متعلق بحث کی ہے، مثلاً صاحب ''کشاف'' علامہ زمخشری، جو بلند پایہ مفسرین کے سرخیل اور ان کے بلند وبالا مینارے کے روشن چراغ ہیں، نیز امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر کبیر'' میں، ادیب وکاتب ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''المثل السائر'' میں، امام ابو سعود رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ''إرشاد العقل السلیم'' میں اور صاحب ''روح المعانی'' علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ماہرینِ علم وفن نے بھی گراں قدر مباحث ذکر فرمائے ہیں۔

قرآن کریم کی وجہ اعجاز

علمائے بلاغت نے قرآن کریم کی مختلف وجوہ اعجاز ذکر فرمائی ہیں، جن میں سے اکثر صحیح ہیں، اگرچہ درجات کے اعتبار سے ان میں تفاوت ہے، میرے نزدیک سب سے باطل وجہ وہ ہے جو نظام معتزلی نے بتلائی ہے، اس کا کہنا ہے:

> ''قرآن کا اعجاز'' صرفة'' (معتزلہ کی ایک اصطلاح) کی بنا پر تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے فصحائے عرب سے قرآن کے مقابلے کی قدرت واستعداد دور فرما دی تھی اور ان کی عقلیں سلب کر دی تھیں، اگرچہ فی نفسہ قرآن کا مقابلہ ممکن تھا، لیکن یہ خارجی رکاوٹ حائل تھی اور اسی بنا پر قرآن، معجز ٹھہرا۔''

اس رائے کا فساد کسی تنبیہ کا محتاج نہیں؛ کیوں کہ اس کے بہت سے مفاسد نمایاں ہیں۔

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے اعجاز قرآنی کی وجوہ صحیحہ کو چار اقسام میں تقسیم فرمایا ہے:

”پہلی قسم: قرآن کریم کا حسن تالیف وکلماتِ قرآنی کا باہمی ربط وتعلق، قرآن کریم کی فصاحت اوراس کی وجوہ اعجاز، قرآن کی بلاغت جوعرب کے شہسواران ادب کی عام عادت کے خلاف تھی، اس قسم کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی وجہ اعجاز اس کی فصاحت وبلاغت ہے۔

دوسری قسم: قرآن کے منفرد نظم کی صورت اور اسالیبِ کلامِ عرب کے برخلاف نرالا اسلوب بیان۔

تیسری قسم: غیب کی خبریں دینا اور مستقبل کے بارے میں ایسی پیش گوئیاں بیان کرنا، جوقرآن کے بیان کے مطابق ہوکر رہیں۔

چوتھی قسم: گزشتہ ادوار، ہلاک شدہ اقوام اورگزری شریعتوں کے متعلق خبر دینا، حالانکہ جس ہستی پر قرآن نازل ہوا وہ امی تھے، لکھے پڑھے نہ تھے اور یہ ایسے واقعات ہیں کہ جن میں سے کسی ایک قصے کا علم بھی ایسے چنیدہ اہل کتاب کو ہوسکتا تھا، جنہوں نے عمر بھر اس علم کو سیکھنے میں صرف کرڈالی ہو۔“ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اختصار کے ساتھ مکمل ہوا۔

ازاں بعد قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ان چاروں وجوہِ اعجاز کی ایسی توضیح وتفصیل فرمائی ہے کہ جوقلوب کے لیے سامانِ شفا اور آنکھوں کو جلا بخشتی ہے، موصوف کی ذکر کردہ پوری بحث درست ہے، بلکہ اس حوالے سے میری رائے ابن سراقہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے موافق ہے کہ:

”یہ اہل علم وجوہ اعجاز کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ پائے۔“

میں کہتا ہوں کہ یہ نکتہ بھی اعجاز قرآنی کا حصہ ہے کہ اس کی وجوہ اعجاز کبھی ختم نہ ہوسکیں گی، بلکہ ہر دور میں ایسی وجوہ اعجاز ظاہر ہوتی رہیں گی جوگزرے زمانوں میں آشکارا نہ ہوئی ہوں گی۔

كَالْبَدْرِ مِنْ حَيْثُ الْتَفَتَّ رَأَيْتَهُ
يَهْدِيْ إِلَيْكَ نُوْرًا ثَاقِبًا

ترجمہ: ’’وہ چودھویں کے چاند کی مانند ہے، تو جس جانب رخ کرے گا تجھے دکھائی دے گا اور وہ تیری آنکھوں کی چمکتے نور کی طرف رہبری کرے گا۔‘‘

كَالشَّمْسِ فِيْ كَبِدِ السَّمَاءِ وَضَوْءُهَا
يَغْشَى الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَمَغَارِبًا

ترجمہ: ’’وہ وسط آسمان میں چمکتے سورج کی مانند ہے، جس کی روشنی نے مشرق ومغرب کے شہروں کو ڈھانپ لیا ہے۔‘‘

البتہ قرآن کے جس پہلو کے ذریعے عرب کے بلغاء وخطباء اور فصحاء وشعراء کو مقابلے کا چیلنج کیا گیا تھا، وہ قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت سے بھرپور اور منفرد سلاست آمیز اسلوب پر مشتمل نرالی عبارات ہیں؛ اس لیے کہ فصحائے عرب اسی میدان کے ماہر اور اسالیب بیان کے رمز آشنا تھے اور اپنے خداداد ذوق ووجدان اور معرفت ویقین کی بنا پر ان امور کو خوب پہچان لیتے تھے۔ انہیں قرآن کی فصاحت وبلاغت کے متعلق کوئی التباس تھا نہ کوئی شبہ اور نہ ہی اس پہلو کسی وسوسے کا شائبہ تھا (اسی بنا پر قرآن کی فصاحت وبلاغت کے پہلو کو سامنے رکھ کر انہیں مقابلے کا چیلنج دیا گیا تھا)، جمہور اہل علم اسی رائے کی جانب مائل ہیں، چناں چہ علامہ ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

’’صحیح تروجہ اعجاز جس پر جمہور اہل علم وماہرین فن کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے نظم وبیان، معانی ومفاہیم کی درستگی اور کلمات کی فصاحت وبلاغت کی بنا پر معجز ہے۔‘‘

جب اعجاز قرآنی کا مدار فصاحت وبلاغت پر ہی ٹھہرا تو اب میدان کار وسیع اور بحث کا دائرہ کشادہ ہے اور قرآن مجید کی خدمت کے لیے یہی جہت سب سے زیادہ لائق اہتمام ہے، لیکن امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق اس عمل کو عمدگی سے سرانجام دینا تب ہی ممکن ہے کہ ان علوم وفنون میں تقدم وتفوق حاصل ہو جو بلند مرتبہ وقابل قدر ہیں، جو دقیق راہ اور لطیف ماخذ

کے حامل ہیں، اس بنا پر اعجاز قرآنی کی صحیح معرفت امت کے چنیدہ اہل علم کو ہی حاصل ہوئی ہے، بلکہ یہ مقولہ ضرب المثل بن چکا ہے:

''لم يدر إعجاز القرآن إلا الأعرجان.''

یعنی ''قرآن کریم کے اعجاز کا صحیح علم صرف دو اپاہجوں کو حاصل ہوا ہے۔''

ان دو شخصیتوں سے مراد ''دلائل الإعجاز'' کے مصنف شیخ عبدالقاہر جرجانی اور تفسیر ''کشاف'' کے مصنف علامہ جار اللہ محمود زمخشری ہیں۔ ہمارے شیخ امام العصر (مولانا محمد انور شاہ کشمیری) رحمۃ اللہ علیہ اس مقولے میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

''أحدهما من زمخشر، والآخر من جرجان.''

یعنی ''ان دونوں میں سے ایک زمخشر سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے جرجان سے۔''

اور ایسے اہل علم کی کم یابی کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک اور اس کی تہہ تک پہنچنا دشوار ہے اور کیوں کر نہ ہو، جب کہ علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں امام اصمعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

''فرسان الشعراء أقل من فرسان الحرب.''

یعنی ''شہسوارانِ شعر وادب کی تعداد، شہسوارانِ حرب وضرب سے کم تر ہے۔''

اور ابو عمرو بن علاء رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی درج کیا ہے:

''العلماء بالشعر أعزّ من الكبريت الأحمر.''

یعنی ''شعر وبیان سے واقف کار علماء، کبریت احمر سے بھی زیادہ نایاب ہیں۔''

آگے علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وإذا كان الكلام المتعارف المتداول بين الناس يشق تمييزه، ويصعب نقده، ويذهب عن محاسنه الكثير، وينظرون إلى كثير

من قبيحه بعين الحسن، وكثير من حسنه بعين القبح، ثم يختلفون في الأحسن منه اختلافا كثيرا، وتتباين آراؤهم في تفضيل ما تفضل منه ، فكيف لا يتحيرون فيما لا يحيط به علمهم، ولا يتأتى في مقدورهم، ولا يمثل بخواطرهم؟! إلى آخر ما قال رحمه الله۔"

ترجمہ: "جب لوگوں کے درمیان متعارف ومتداول کلام میں درست وغلط کی تمیز اور اس کو نقد کی کسوٹی پر پرکھنا دشوار ہوتا ہے اور اس کے بہت سے محاسن نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہیں، چناں چہ بسا اوقات قبیح کلام کو بنظر تحسین دیکھتے ہیں اور بہت سے حسین کلاموں کو بنظر قبیح دیکھتے ہیں، پھر سب سے حسین کلام کی تعیین میں اہل فن کا خوب اختلاف ہوتا ہے اور افضل کی تعیین میں آرا مختلف ہوتی ہیں، (جب مخلوق کے متداول کلام کا یہ حال ہے) تو پھر اس کلام میں وہ کیوں کر حیران نہ ہوں گے کہ جس کو ان کا علم محیط نہیں، اور جو ان کی قدرت میں نہیں اور ان کے خیال وخاطر میں بھی نہیں آتا؟!۔"

اعجازِ قرآنی کے متعلق علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے چند اقوال

ہمارے شیخ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ "مشکلات القرآن" کے مؤلف، اپنے زمانے میں اس حوالے سے اپنی مثال آپ اور گزشتہ صدیوں کے چنیدہ اہل علم کی نظیر تھے، اللہ تعالیٰ نے موصوف میں ایسی خصوصیات یکجا فرمادی تھیں جو کسی ایک شخصیت میں بہت کم ہی جمع ہوتی ہیں، وہ اعجاز قرآنی کی معرفت رکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کا دل مطمئن تھا، سابقہ مقولہ: "لم يدر إعجاز القرآن إلا الأعرجان" نقل کر کے کبھی کبھار یوں فرمادیا کرتے تھے: "وأنا ثالثهما" یعنی "اعجاز کی معرفت کے پہلو سے ان دو شخصیات کا تیسرا میں ہوں۔"

نیز فرمایا کرتے تھے:

''نظم قرآنی کا اعجاز میرے نزدیک مشرق سے طلوع ہونے والے سورج سے زیادہ واضح ہے، جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، بلکہ سورج کا طلوع ہونا تو مشتبہ ہوسکتا ہے اس طور پر کہ افق میں دکھائی دینے والی ٹکیہ بعینہ سورج نہ ہو، بل کہ اس کا پرتو اور عکس ہو؛ اس لیے کہ جدید سائنسی تحقیق یہ ہے کہ سورج کے اپنے حقیقی افق سے طلوع ہونے سے چند منٹ قبل ہی اس کی ٹکیہ دکھائی دینے لگتی ہے (جو عکس اور پرتو ہوتا ہے)۔''

پھر اس نکتے کو آسانی سے سمجھانے کے لیے شیخ یوں مثال بیان فرمایا کرتے تھے:

''مثلاً: ایک پیالے میں چاندی کا درہم ڈال کر اتنے فاصلے پر رکھ دیا جائے کہ وہ درہم نظر نہ آئے، پھر اس پیالے میں پانی بھر دیا جائے تو اس درہم کا عکس پانی کی سطح پر دکھائی دینے لگتا ہے (اسی طرح طلوع سے پہلے ہی آسمان کے افق پر سورج کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے) بلکہ سورج کی ٹکیہ کے بارے میں تو شک وشبہ کا امکان ہے، لیکن نظم قرآنی کا اعجاز ایسا یقینی ہے کہ اس میں ذرہ بھر بھی شک کی گنجائش نہیں، سینہ اس معاملے میں اتنا ٹھنڈا ہے کہ کوئی حیرت وسرگردانی نہیں، دل اس پر مطمئن اور آنکھیں فرحت وسرور پاتی ہیں اور میرے نزدیک قرآن کا اعجاز کسی پھٹی شئے کی پھٹن وشگاف اور سورج کے طلوع سے زیادہ واضح ہے۔''

بلاشبہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ علوم بلاغت کی مہارت میں ایسا بلند مقام رکھتے تھے کہ ان کے مرتبے کو پہنچنا دشوار ہے، بلکہ ان کی گرد پا کو پانا بھی مشکل ہے، فصاحت وبلاغت ان کی رگ وپے میں بسی ہوئی تھی اور فرمایا کرتے تھے:

''بلاغت کی معرفت کے لیے اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک معیار ودیعت

فرمادیا ہے، میں بلاغت میں کسی کا متبع ومقلد نہیں اور مجھے اس فن میں ایسی عطا فرمادی ہے جس کی بدولت میں بلاغت کے مراتب کا ادراک کرلیتا ہوں۔‘‘

بسا اوقات میں دیکھتا تھا کہ قرآنی تعبیر سے ان پر وجد ونشاط طاری ہوجاتا تھا اور وہ اس طرح جھومتے تھے جیسے چڑیا پر بارش کی بوندیں پڑیں تو وہ جھومنے لگتی ہیں، یوں ہی ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ، قرآن کریم کی حلاوت وطراوت سے لطف اندوز ہوتے اور اس کی تمازت ان کے قلب وروح میں ایسے سرایت کرتی تھی جیسے بدن میں روح سرایت کیے ہوئے ہے، وہ قرآنی تعبیر کی تروتازگی ورونق اور چاشنی سے متحیر ہوجایا کرتے تھے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

’’تفسیرِ قرآن میں سب سے قابلِ اہتمام امر یہ ہے کہ قرآن کریم کی جلالت وجزالتِ شان کے تقاضے کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے مقصد ومطلب کو واضح کیا جائے، اس کے نظم کا اعجاز اپنی فطری سادگی کے ساتھ برقرار رہے اور ایسے تکلفات اور مقدر ومحذوف عبارات نکالنے سے پرہیز کیا جائے جو اس کے عمدہ معجز نظم کے منافی ہوں؛ کیونکہ عبارات میں تکلفات اور مقدرات، قرآن کریم کو اس کے بلندوبالا مقام سے گرادیتے ہیں، جس کے ورے کوئی انتہا نہیں اور نہ اس کے بعد کوئی منتہی ہے۔‘‘

رُتَبٌ تَقْصُرُ الْأَمَانِيُّ حَسْرٰى
دُوْنَهَا مَا وَرَائَهُنَّ وَرَاءُ

ترجمہ: ’’ایسے بلند مراتب ہیں جن تک پہنچنے سے امیدیں حیرت زدہ ہیں اور جن کے آگے کچھ بچا نہیں۔‘‘

شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام کی تائید علامہ زمخشری کے بیان سے بھی ہوتی ہے، موصوف رقم طراز ہیں:

’’اللہ تعالیٰ کی عالی مرتبہ کتاب اور کلام معجز کے مفسر پر لازم ہے کہ نظم قرآنی کو اپنے

حسن اور بلاغت قرآنی کو اپنے اپنے کمال پر برقرار رکھے اور جس کلام کے ذریعے چیلنج کیا گیا ہے، اس کو عیوب سے سلامت رکھے۔"

بعض اہل علم کا کہنا ہے:

"قرآن کے اس پہلو کو اپنے تمام پہلوؤں سمیت جاننا ہی کلام اللہ کے عجائبات سے مطلع مفسر کا ہدف ہے اور یہی فصاحت کی بنیاد وجوہر اور بلاغت کے ہار کا درمیانی قیمتی موتی ہے۔"

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید، شیخ ابراہیم بن عمر بقاعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۸۸۵ھ) کی کتاب "نظم الدرر في تناسب الآي والسور" کی بہت تعریف فرماتے تھے اور بلند مرتبہ پہلو سے امت میں متداول تفاسیر پر اسے فوقیت دیتے تھے اور فرماتے تھے:

"موصوف نے بشری وسعت وطاقت کے اعتبار سے اس موضوع کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔"

حضرت کی تمنا تھی کہ ان کی حیات میں یہ کتاب طبع ہو جائے اور انہوں نے مکتبہ مصریہ سے اس کا عکس لینے کا عزم کر لیا تھا، لیکن موت اس امید کے درمیان حائل ہو گئی اور حضرت یہ حسرت دل میں لیے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے، کسی شاعر نے کہا تھا:

وَلَمْ يَتَّفِقْ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهِ
وَكَمْ حَسَرَاتٍ فِيْ بُطُوْنِ الْمَقَابِرِ

ترجمہ: "اس شخص کی امید کے مطابق اتفاق نہ ہو سکا، یہاں تک کہ وہ اپنی راہ پر گامزن ہو گیا اور کتنی ہی حسرتیں قبروں میں مدفون ہیں۔"

عرب کے نامور شاعر ذو القروح، الملک الضلیل (دونوں امرؤ القیس کے القاب ہیں) کا شعر ہے:

وَمَا الْمَرْءُ مَا دَامَتْ حَشَاشَةُ نَفْسِهِ
بِمُدْرِكٍ أَطْرَافَ الْخُطُوْبِ وَلَا آلِ

ترجمہ: ’’انسان جب تک خوش عیش و مطمئن رہے، حوادث کا ادراک و تجربہ حاصل نہیں کرسکتا۔‘‘

پروردگار عالم کا فرمان عالی شان ہے:

’’أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنَّىٰ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ.‘‘ (النجم: ۲۴-۲۵)

ترجمہ: ’’کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے؟! سو خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا (کی بھی)۔‘‘

اب میں قرآنی اعجاز، نظم قرآنی کے امتیازات اور قصص وواقعات کے بیان میں قرآن کی خصوصیات وآداب کے متعلق وہ تمام مباحث ذکر کروں گا، جو میں نے شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہیں، یا شیخ کے ان علوم تک کسی واسطے سے میری رسائی ہوئی ہے؛ تاکہ گزشتہ سطور میں ان کی جو تعریف وتوصیف کی ہے، اس کی سچائی ظاہر ہو، مشکلات قرآن ودیگر علوم ومعارف قرآنیہ میں تحقیقات ومباحث سے حضرت شیخ کے بلند مقام کا اندازہ ہو اور اس کتاب کی امتیازی حیثیت واضح ہو جس کا مقدمہ لکھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ بعدازاں آپ شیخ کے ان مباحث کا اعجاز قرآن کے متعلق علمائے امت کے اقوال اور علوم قرآنیہ کے حوالے سے ان کی دیگر تصانیف سے موازنہ کرلیجیے؛ تاکہ اس سلسلے میں آپ کو فہم وبصیرت حاصل ہو، جس کی روشنی میں آپ صحیح حکم اور صریح حق تک پہنچ سکیں۔

یہ موضوع اس پہلو کے گزشتہ تمام موضوعات سے اہم ہے؛ اس لیے کہ اس کا راستہ دقیق، معنویت کے اعتبار سے لطیف اور انتہائی پوشیدہ ومخفی حقائق کا حامل ہے، اس کے متعلق تحقیق کے لیے فطری وطبعی ذوق اور عقلی درایت کی ضرورت ہے، نیز گہرے غور وتدبر، قلبی یکسوئی اور دقت فکری کے ساتھ علوم بلاغت میں مہارت ضروری ہے، لیکن ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نہایت بلیغ انسان اور اختصار کے خوگر تھے، ان کی تعبیرات سے نامانوس شخص ان کے کلام کو پہیلی خیال کرتا ہے۔

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

"ما رأيت بليغا قط إلا وله في القول إيجاز، وفي المعاني إطالة."

ترجمہ: "میرے مشاہدے کے مطابق ہر فصیح وبلیغ انسان کے کلام میں اختصار اور معانی ومفاہیم میں وسعت ہوا کرتی ہے۔"

میں نے اپنے شیخ، "فتح الملهم شرح صحيح مسلم" کے مصنف، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

"مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک جملہ کی تشریح وتوضیح کے لیے بسا اوقات مستقل رسالہ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اس حوالے سے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل وہی تھا، جو ابن الندیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الفهرست" کی ابتدا میں تحریر فرمایا ہے:

"بعض نفوس، مقدمات وتمہیدات کی بجائے محض نتائج کی جانب توجہ دیتے ہیں، وہ مقصودی کلام سے مطمئن ہوتے ہیں، عبارات کی طوالت سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔"

یا جیسے خلیل بن احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"(علمی مباحث میں) بعض ابواب کی ہم ایسی تشریح کر سکتے ہیں کہ ہر کس وناکس انہیں سمجھ سکے، لیکن ضروری ہے کہ ہمارے بعد ایک عالم کی امتیازی حیثیت برقرار رہے۔"

ابن یعیش رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "شرح المفصل" میں اس قول کو نقل کرکے اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس لیے کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ جو شخص اختصار میں بلاغت کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ تطویل واطناب میں بھی بلاغت پر قادر ہوگا۔"

بہر کیف حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی عادت، عبارت میں اختصار کو ترجیح دینے کی تھی، وہ مقدمات کی تمہید اور تفصیلی کلام کے ذریعے توضیح وتشریح کے عادی نہ تھے، اس بنا پر میں ان کے اقوال ذکر کروں گا اور جہاں تشریح کی ضرورت ہوگی تو مراد کی وضاحت کے لیے تشریح اور مفصل کلام کروں گا اور ان اقوال وتفصیلات کا ماخذ شیخ کے بعض رسائل میں ذکر کردہ مباحث یا ان کے کلام کا فہم ہے، جو توفیقِ خداوندی اور نصرتِ ایزدی سے مجھے حاصل ہوا ہے۔

وجوہِ اعجاز سے متعلق علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"قرآن کریم تمام کا تمام معجز ہے اور قرآن کا یہ اعجاز اس کے مفردات ومرکبات، اس کے کلمات کی ترتیب اور اس کے مقاصد وحقائق میں جاری وساری ہے، لہٰذا قرآن کریم لفظی وترکیبی اعتبار سے معجز ہے، ترتیب کے اعتبار سے بھی معجز ہے، نیز اپنے اغراض ومقاصد اور بلند علوم وحقائق کے پہلو سے بھی معجز ہے۔"

اعجاز قرآنی باعتبار مفردات

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"مفردات کے اعتبار سے قرآن کے معجز ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ جب قرآن کسی ایک معاملے کی وضاحت کرتا ہے، جس میں عقلاء مختلف ہوں اور اس کے مختلف پہلو زیر بحث ہوں، عقلیں حیران وسرگرداں ہوں اور حقیقت کا ادراک نہ کرسکتی ہوں، معاملہ مختلف آرا کے درمیان دائر ہو، اختلاف ختم نہ ہو رہا ہو اور نہ ہی کوئی راہ نکل رہی ہو تو ایسے مقامات میں قرآن کریم (ایک ہی) مفرد کلمے کے ذریعے ایک ایسی تعبیر اختیار کرتا ہے کہ اس سے زیادہ حقیقت کو واضح کرنے والی، موقع ومقام کے مناسب اور مقصد کو پوری طرح ادا کرنے والی کوئی اور تعبیر ناممکن

ہوا کرتی ہے، اگر انسان وجنات مل کر بھی اس مقام پر اس لفظ سے زیادہ حقیقت کے قریب تر اور مقصود کو واشگاف کرنے والا کوئی اور لفظ لانے کی کوشش کریں تو ناکام ونامراد ہوں گے اور اپنے عجز وقصور سے آگاہ ہوجائیں گے؛ اس لیے قرآنی تعبیر کے علاوہ مطلوبہ غرض کو کسی اور لفظ سے پوری طرح ادا کرنا محال ہے، یوں قرآن محض ایک کلمے سے ایسی مخفی حقیقت کو واضح کردیتا ہے جس کے متعلق افکار سرگرداں ہوں اور کئی کلمات کے ذریعے بھی اس کی وضاحت نہ کرسکیں، چہ جائیکہ ایک کلمے سے؟!۔"

آگے مقصودی بحث کے لیے تمہید کے طور پر اس نکتے کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں:

"موت" اور قرآن میں لفظِ "توفّي" کا استعمال

عام کفارِ عرب، موت کے بعد کی زندگی کے منکر تھے اور ان کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد انسان کے جسم کے جوڑ بکھر جاتے اور اس کے بدن کے اجزا فنا ہوجاتے ہیں کہ ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں ان کے اس باطل عقیدے کو ذکر فرمایا ہے، سورۂ انعام میں ارشادِ ربانی ہے:

"وَقَالُوْا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ."

(الانعام:۲۹)

ترجمہ: "اور یہ کہتے ہیں کہ جینا اور کہیں نہیں، صرف یہی فی الحال کا جینا ہے اور ہم زندہ نہ کیے جاویں گے۔"

اس کے علاوہ بھی کئی آیات اس موضوع سے متعلق ہیں۔

صحیح بخاری میں کسی شاعر کا قول نقل کیا گیا ہے:

يُخْبِرُنَا الرَّسُوْلُ بِأَنْ سَنُحْيِيْ
وَكَيْفَ حَيَاةُ أَصْدَاءٍ وَهَامٍ؟!

ترجمہ: ''یہ رسول ہمیں بتاتا ہے کہ ہم عن قریب (مرنے کے بعد) دوبارہ زندہ ہوں گے، حالاں کہ صدائیں اور کھوپڑیاں کیوں کر زندہ ہوسکتی ہیں؟!''

(اس شعر میں لفظ ''أصداء''، ''الصدیٰ'' سے ماخوذ ہے) عربوں کا خیال تھا کہ جب کسی شخص کو قتل کردیا جائے تو اس کے سر سے ایک پرندہ نکلتا ہے، جو بآوازِ بلند صدائیں بلند کرتا ہے: ''اسقوني، اسقوني''، یعنی ''مجھے قاتل کا خون پلاؤ، مجھے قاتل کا خون پلاؤ''، جب تک اس کے خون کا انتقام نہ لے لیا جائے (وہ پرندہ یہی صدائیں لگاتار رہتا ہے، شاعر نے اسی بدعقیدہ کی جانب اشارہ کیا ہے)۔ لفظِ ''الصدیٰ'' کی یہ تشریح صحیح بخاری کی مختلف شرحوں اور فرید وجدی کے ''دائرة المعارف'' میں مادہ ''الصدیٰ'' کے تحت مذکور ہے۔

بہرکیف عربوں کے نزدیک مرنے کے بعد حساب وکتاب اور دوبارہ زندگی ومعاد کا کوئی تصور نہیں تھا، ان کا گمان تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، کبھی فنا نہ ہوگی، صاعد اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے ''طبقات الأمم'' (ص: ۶۸) میں علامہ شہرستانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الملل والنحل'' میں اور ان کے علاوہ دیگر اہل علم نے بھی عربوں کا یہ اعتقاد ذکر کیا ہے۔

عربوں کی ایک جماعت، معاد کی قائل بھی ہے، چناں چہ بعض عرب شعرا کے اشعار میں معاد کا تذکرہ ملتا ہے، پھر اس معاد کے قائل ان لوگوں میں بھی باہمی اختلاف تھا، ان کے دامن میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے دل مطمئن ہوں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی بے اطمینانی کی کیفیت کو یوں بیان فرمایا ہے:

''فَهُمْ فِيْٓ أَمْرٍ مَّرِيْجٍ'' (سورہ ق: ۵)

ترجمہ: ''غرض یہ کہ وہ ایک متزلزل حالت میں ہیں۔''

ابوطیب متنبی نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

تَخَالَفَ النَّاسُ حَتّٰى لَا اتِّفَاقَ لَهُمْ إِلَّا عَلٰى شَجَبٍ، وَالْخُلْفُ فِي الشَّجَبِ

فَقِيْلَ: تَخْلُصُ نَفْسُ الْمَرْءِ سَالِمَةً وَقِيْلَ: تَشْرَكُ جِسْمُ الْمَرْءِ فِي الْعَطَبِ

وَمَنْ تَفَكَّرَ فِي الدُّنْيَا وَمُهْجَتِهِ أَقَامَهُ الْفِكْرُ بَيْنَ الْعَجْزِ وَالتَّعَبِ

ترجمہ: ''① لوگوں کے باہمی اتنے اختلافات ہیں کہ موت کے سوا کسی چیز پر متفق نہیں، بلکہ موت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔

② بعض کا کہنا ہے کہ انسان کی روح تو صحیح سالم خلاصی اور آزادی حاصل کرتی ہے (یعنی موت وفنا صرف جسم پر طاری ہوتا ہے) اور بعض کہتے ہیں کہ موت وہلاکت میں جسم وروح دونوں شریک ہوتے ہیں۔

③ جو شخص بھی دنیا اور اس کی زندگی کے بارے میں غور وفکر کرے گا تو یہ سوچ وفکر اس کو عاجزی اور تکان کے درمیان لا کھڑا کرے گی۔''

زمانۂ جاہلیت میں عربوں نے اپنے ادراک واحساسات کے مطابق موت کے مختلف نام متعین کر رکھے تھے، جن کو علامہ ابن سیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''المخصّص'' (۶ / ۱۱۵) میں درج کیا ہے، وہ نام درج ذیل ہیں:

۱-همیغ (غین معجم کے ساتھ، ایک قول کے مطابق عین مہملہ کے ساتھ همیع ہے)

۲-النیط ۳-الزهر ٤-المنون ٥-الشعوب ٦-الفود ٧-الحمام ٨-السام

٩-المقدار ١٠-قتيم ١١-جباز ١٢-حلاق ١٣-القاضية ١٤-الطلاطل

١٥-الطلاطلة ١٦-العول ١٧-الذام ١٨-الكفت ١٩-الجداع

٢٠-الحزرة (زائے معجمہ مقدم ہے) ٢١-الحتف ٢٢-الخالج.

علامہ ابن سیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں سے اکثر اسماء کے لیے زمانۂ جاہلیت کے شعراء کے اشعار

سے شواہد بھی پیش کیے ہیں اور موت کے اسما میں (تئیسواں) لفظ: ''المتوفّي'' کو بھی ذکر کیا ہے اور اس کے لیے قرآنی آیت سے شاہد پیش کیا ہے، معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے عربوں کے ہاں لفظ ''المتوفّي''، موت کے معنی میں مستعمل نہیں تھا، اسلام کی آمد کے ساتھ قرآن نازل ہوا، قرآن نے معاد، موت کے بعد کی زندگی، حشر نشر، اور حساب کتاب کے عقائد بیان کیے اور ان کے عقائد: فنائے محض، روح کا باقی نہ رہنا، دوبارہ زندگی کو بعید از عقل سمجھنا اور اجزائے بدنی کے پارہ پارہ اور چورہ چورہ ہونے کے بعد یکجا ہونے پر تعجب کا اظہار کرنے جیسے بدعقیدوں کی تردید وتنقید کی اور واضح کیا کہ بظاہر معدوم ہونے کے بعد دوبارہ بقا حاصل ہوگی اور قرآن نے ان کے لیے ایسی مثالیں پیش کیں، جو موت کے بعد کی زندگی کی حقیقت کو عام ذہنوں کے قریب کریں اور اس میں موجود خفا اور بعد کو دور کیا؛ تاکہ ان مثالوں سے قلوب کو اطمینان اور نفوس کو شفایابی حاصل ہو اور اس حقیقت کو آشکارا کرنے لیے لفظ ''المتوفّي'' استعمال کیا، جس کے معنی ہیں: ''کسی چیز کو کامل طور پر صحیح سالم وصول کر لینا کہ اس میں کوئی نقص نہ ہو''؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ارواح کے لیے الگ مقام اور اجزائے بدن کے لیے جدا ٹھکانہ ہے اور جب وہ علیم وخبیر ذات چاہے گی تو ان کو جمع فرمادے گی، قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

''وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيْرٌ.'' (الشوریٰ:۲۹)

ترجمہ: ''اور وہ ان (خلائق) کے جمع کر لینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے، قادر ہے۔''

چنانچہ بدن کے ذرات میں سے کوئی ذرہ اس کے علم سے پوشیدہ نہیں اور نہ ہی اجزائے بدن میں اس کو اشتباہ ہوگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيْظٌ.'' (ق:۴)

ترجمہ: ''اور ہمارے پاس (وہ) کتاب یعنی لوح محفوظ (موجود) ہے۔''

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''عرب کے یہ (فصیح وبلیغ لیکن قرآنی تعبیرات کے حوالے سے) سیدھے سادے اور ناتجربہ کار ادبا، قرآن کے ان حقیقت ومعرفت سے بھرپور، وقار اور چاشنی لیے ہوئے، بلند مرتبہ، فصیح اور پائیدار الفاظ کی نظیر کہاں پیش کر سکتے ہیں؟! غور کیجیے کہ قتل کے لیے لفظ ''شہادت'' کس خوبی سے استعمال کیا گیا اور موت کے لیے کیا خوب تعبیر ہے:

''فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ.'' (الاحزاب:۲۳)

ترجمہ: ''پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے۔''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ''تحیۃ الإسلام'' میں رقم طراز ہیں:

''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت کے معنی میں لفظ ''توفّي'' کا استعمال قرآن کی اتباع کرتے ہوئے اسلامی دور میں ہی شائع ذائع ہوا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ازہری نے ''تهذيب الألفاظ'' میں اور ثعالبی نے ''فقه اللغة'' میں موت کے ناموں میں لفظ ''المتوفّي'' ذکر نہیں کیا۔''

راقم عرض کرتا ہے: حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ صاحب ''المخصّص'' علامہ ابن سیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے ناموں میں لفظ ''المتوفّي'' ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا کہ اس کے لیے شاہد کے طور پر صرف قرآن کریم کی آیت لائے ہیں (اگر کلامِ جاہلیت میں شواہد ہوتے تو حسب عادت انہیں ذکر کرتے)، نیز ان کے ہاں اس کی حقیقت ویسی تھی ہی نہیں، جو اسلام نے پیش کی ہے، تب وہ لفظ ''المتوفّي'' سے موت کو کیسے تعبیر کر سکتے تھے؟ وہ نہ تو اس معنی میں موت کی حقیقت سے واقف تھے اور نہ ہی اس لفظ ''توفّي'' سے آگاہ تھے، بلکہ وہ لفظ ''توفّي'' کا صرف لغوی معنی ہی جانتے تھے، یعنی کسی چیز کو کامل طور پر پورا پورا

وصول کرلینا، چنانچہ مشہور شاعر طرفہ کی بہن نے اپنے بھائی کے مرثیے میں (یہ الفاظ اسی معنی میں استعمال کرتے ہوئے) کہا تھا:

عَدَدْنَا لَهُ سِتًّا وَّعِشْرِيْنَ حِجَّةً
فَلَمَّا تَوَفَّاهَا اسْتَوٰى سَيِّدًا ضَخْمًا
فُجِعْنَا بِهِ لَمَّا رَجَوْنَا إِيَابَهُ
عَلٰى خَيْرِ حَالٍ لَا وَلِيْدًا وَلَا قَحْمًا

ترجمہ: ”ہم نے اس کی عمر کے چھبیس برس شمار کیے، جب اس نے اپنی عمر کے چھبیس سال پورے پورے وصول کرلیے تو وہ ایک عظیم سرخیل کے منصب پر فائز ہوگیا۔ ہمیں اچانک اس (کی موت) کا صدمہ پہنچا، جب ہم اس کی اچھی حالت میں واپسی کی امید میں تھے، جو نہ بچپنے کی حالت تھی نہ بڑھاپے کی۔“

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”لفظ ”توفی“ کے ذریعے ایک اور باریک نکتے کی جانب بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ ”متوفی“، ”متوفي“ کا حق ہوا کرتا ہے، مثلاً: اگر ایک شخص صحرا سے (اپنے گمشدہ) گھوڑے کو پکڑ لے تو یہ نہیں کہا جائے گا: ”توفَّيتُ الفرس“ (میں نے اپنے گھوڑے کو پورا پورا وصول کرلیا) بلکہ یوں کہا جائے گا: توفيت حقي (میں نے اپنا پورا حق حاصل کرلیا)۔

اور فارسی زبان میں اس کا ترجمہ یوں ہوگا: ”وصول کردم حق خویش را۔“

چناں چہ جب لفظ ”توفی“ اپنے حق کے حصول کے لیے بولا جاتا ہے اور اپنا حق کسی اور کے پاس صرف عاریتاً ایک مقررہ مدت کے لیے ہوتا ہے اور لفظ ”عاریت“ اس جہت سے ضمنی طور پر مدت کے اتمام کو بھی شامل ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اس مستعار

چیز کو جب جی چاہے واپس لینے کا اختیار ہوتا ہے، جیسے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وَتَرَاكَضُوْا خَيْلَ الشَّبَابِ وَحَاذَرُوْا
مِنْ أَنْ تُرَدَّ فَإِنَّهُنَّ عَوَارِيْ

ترجمہ: ”وہ جوان گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانے لگے اور انہیں اندیشہ ہوا کہ یہ گھوڑے ان سے واپس لے لیے جائیں گے؛ اس لیے کہ وہ گھوڑے انہیں بطور عاریت دیئے گئے تھے۔“

اور صاحب حق جب چاہے، اپنا حق واپس لے سکتا ہے، دیکھیے یہ مفہوم یہاں بھی معتبر ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا تھا:

وَمَا الرُّوْحُ وَالْجُثْمَانُ إِلَّا وَدِيْعَةً
وَلَابُدَّ يَوْمًا أَنْ تُرَدَّ الْوَدَائِعُ

ترجمہ: ”روح اور جسم تو ودیعت کردہ چیزیں ہیں اور ودیعت ایک دن ضرور واپس لے لی جاتی ہے۔“

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”جب لفظ ”التوفِّي“ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس میں ایک اور باریک نکتہ ہوتا ہے، یعنی اس لفظ سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ ”متوفّٰی“ ایک باقی رہنے والی ذات کی ملکیت بن گیا؛ اس لیے اب وہ نہ ہلاک ہوگا اور نہ ہی فنا ہوگا۔“

”تحیۃ الإسلام“ میں حضرت شیخ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

”جان لیجیے کہ لفظ ”توفِّي“ کے معنی حق کو وصول کرنے کے ہیں، جب اس کی نسبت

مقام اختصاص میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ''متوفّٰی''اس کے بعد فنا نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ وہ ''باقی'' کی ملکیت بن چکا ہے (اور باقی کی ملکیت بھی باقی ہوتی ہے)، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یہی معنی مراد ہیں:

''وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ.'' (البقرہ:۲۸)

ترجمہ: ''تم محض بے جان تھے، سو تم کو جان دار کیا، پھر تم کو موت دیں گے، پھر زندہ کریں گے۔''

یعنی دوسری مرتبہ کا مارنا اور جلانا اس طرح دائمی نہ ہوگا، بلکہ اس کی انتہا ''ثم إليه ترجعون.'' (البقرۃ:۲۸) (پھر ان ہی کے پاس لے جائے جاؤ گے) پر ہوگی اور اس کی انتہا ''مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ'' (جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا) پر ہوگی، چنانچہ جب روح ''متوفّٰی'' ہوتی ہے تو وہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمیشہ باقی رہے گی، معلوم ہوا کہ لفظ ''توفّي''، ''متوفّٰی'' کے باقی رہنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور چونکہ تمام انسانوں کے بدن ان کی روحوں کے ساتھ باری تعالیٰ کے دربار میں ''متوفّٰی'' نہیں ہوتے، جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بدن اور روح دونوں کی ''توفي'' ہوئی، اس لیے سورۂ آل عمران میں لفظ ''توفي'' کے بعد ''ورافعك إليّ'' (آل عمران:۵۵) (یعنی (فی الحال) تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں) کے الفاظ بھی بڑھائے ہیں اور اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت قرار دیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کی طرف ''توفّي'' کی نسبت یا تو مقام اختصاص میں ہوتی ہے، یا مقام ارسال (یعنی مطلقاً لفظ ''توفّي'' کے استعمال کے وقت) میں ہوتی ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ اس لفظ کی نسبت فرشتوں کی جانب ہوتی ہے۔

’’مفردات القرآن‘‘ میں علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی شاید یہی مراد ہے: ’’توفي اختصاص وشرف، لا توفي موت‘‘ (یعنی اعزاز وتکریم اور اختصاص پر مبنی توفی ہے، نہ کہ موت کے معنی میں)‘‘۔ انتهى بتصرف وتلخيص.

چونکہ نیند کے دوران بھی ایک قسم کی ’’توفي‘‘ ہوتی ہے؛ اس لیے قرآن کریم نے نیند کے لیے بھی لفظ ’’توفي‘‘ کا استعمال کیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

’’اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا.‘‘

(الزمر: ۴۱)

ترجمہ: ’’اللہ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے ان جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی۔‘‘

ایک اور مقام میں ارشاد ہے:

’’وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ.‘‘ (الانعام: ٦٠)

ترجمہ: ’’اور وہ ایسا ہے کہ رات میں تمہاری روح کو (ایک گونہ) قبض کر دیتا ہے۔‘‘

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’باری تعالیٰ کے فرمان ’’اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ‘‘ میں صراحتاً لفظِ ’’الأنفس‘‘ اس لیے ذکر کیا گیا کہ موت کے وقت کی ’’توفّي‘‘ کی حقیقت لوگوں کو قرآن سے ہی معلوم تھی، اس کے برخلاف نیند کے وقت ’’توفّي‘‘ ان کے نزدیک ایک انوکھی چیز تھی، چنانچہ قرآن نے انہیں بتایا کہ نیند میں بھی روح کی ’’توفی‘‘ ہوتی ہے، یہ صراحت ضروری تھی، پھر جب ایک اس معنی کا علم ہو گیا تو اس مفہوم میں دوسری بار مطلقاً (لفظِ ’’أنفس‘‘ کے بغیر) لفظ ’’توفي‘‘ استعمال کیا گیا اور یوں فرمایا: ’’وهو الذي يتوفاكم بالليل‘‘ (الانعام: ٦٠)۔‘‘

راقم عرض کرتا ہے: شیخ کی مراد یہ ہے کہ جب ایک بار انہیں بتلادیا کہ نیند میں بھی ''توفي'' ہوتی ہے اور لوگوں کو یہ بات بتانے اور سکھانے کے لیے اس کے ساتھ لفظ ''الأنفس'' بھی لایا گیا تو اس ''توفّي'' کی حقیقت ان کے علم میں آ گئی اور لفظ ''توفّي'' بمعنی نیند بھی لوگوں کے درمیان متعارف ہو گیا تو اس کے بعد ''وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِاللَّيْلِ'' میں لفظ ''الأنفس'' ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی، یوں شیخ نے دلوں میں کھٹکتے اس اشکال کو دور فرمادیا کہ پہلی آیت ''توفّي'' کے ساتھ لفظ ''الأنفس'' ذکر کیا گیا اور دوسری آیت میں ترک کردیا گیا (اس میں کیا راز ہے؟) کیا کہنے شیخ کے! انہوں نے کس قدر عمدہ علمی جواہر اپنی تالیفات میں بکھیر دیئے ہیں!!

پھر شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''میری مراد یہ ہے کہ یہاں باری تعالیٰ نے لفظِ ''الأنفس'' کی صراحت اس حقیقت کے اظہار کے لیے فرمائی ہے کہ نیند اور موت دونوں میں (الگ الگ نوعیت کی) ''توفي'' ہوتی ہے، اور اس فعل میں اللہ تعالیٰ کا بلاواسطہ دخل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کبھی ایسے حقائق کا اظہار کرتا ہے جن کو اہل عرف نہ جانتے ہوں، شاید عرب یہ نکتہ نہ جانتے ہوں گے کہ موت کے موقع پر لفظ ''توفّي'' بمعنی وصول کرنا استعمال ہوتا ہے۔''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ''تحیۃ الإسلام'' کے کئی مقامات پر ایک بحث فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یوں ہے:

''جان لیجیے کہ اہل جاہلیت، موت کو محض فنا و عدم سمجھتے تھے، قرآن نے ان کو بتلایا کہ معاملہ ایسا نہیں ہے جیسے وہ سمجھ رہے ہیں، بل کہ موت درحقیقت ''توفي'' (پورا پورا وصول کرنے کا نام) ہے، اگرچہ ''توفي'' بعینہ موت نہیں، لہٰذا ''توفي'' کا اطلاق موت کے محل پر ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ ''توفي'' کا اطلاق موت پر ہے، (موت کے

لیے لفظ ''توفي'' کا استعمال) عربوں نے قرآن سے ہی سیکھا تھا اور قرآن نے ہی اس حقیقت کی جانب ان کی رہنمائی کی اور انہیں یہ حقیقت سمجھائی، دراصل لفظ ''توفي'' ہر مقام پر پورا پورا وصول کر لینے کے معنی میں ہے، چنانچہ موت، نیند اور رفع (زمین سے اٹھالینا) تینوں پر یہ لفظ صادق آتا ہے، اس مسئلے کی حقیقت اور عربی لغت کی فقہ یہی ہے۔ قرآن کا مقام ومنصب، حقائق کو واشگاف کرنا ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا ذوق اور عربیت میں کچھ مہارت عطا فرما رکھی ہے، وہ بخوبی جانتا ہے کہ قرآن، عامیانہ طرزِ گفتگو اختیار نہیں کرتا، بلکہ الفاظ کے انتخاب میں اس کا منفرد طریقہ ہے اور وہ اس حوالے سے لفظ کی اصل وضع کا خوب لحاظ کرتا ہے اور ان حقائق کی رعایت بھی کرتا ہے جن کے لیے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے، اسی بنا پر قرآن کریم میں کسی ایک لفظ کے بدلے دوسرا لفظ رکھنا دشوار ہی نہیں، محال وناممکن ہے اور یہ عمل اشیا کے حقائق اور ہر مقام کے پورے حق سے ناواقفیت کی بنا پر ہی انجام دیا جاسکتا ہے، قرآن کریم اتنے دقیق انداز میں ایک مفرد تعبیر کر کے فوائد متعین کرتا ہے کہ جس سے انسانی عقلیں قاصر اور دانشورانِ قوم کے شعور وادراک عاجز ہیں۔''

بعد ازاں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''عقیدة الإسلام في حیاة عیسٰی علیه السلام'' اور اس کی تعلیقات بنام ''تحیة الإسلام'' میں آیتِ ''توفّي'' یعنی ارشادِ ربانی: ''یا عیسٰی إني متوفیك ورافعك إليّ'' (آل عمران: ۵۵) کے متعلق عجیب وغریب بلاغی اسرار اور نظم قرآنی کے ایسے لطائف ومعارف درج کیے ہیں، جو با کمال اہل علم ودانش کو حیران وششدر کر دیتے ہیں، یہاں ان کے دریائے علم کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی ہے اور ساحل کنارے نہایت گراں قدر اور قیمتی موتی اچھالے ہیں، جو فصاحت کے ہار کا درمیانی موتی اور بلاغت وکمال کی بنیاد بننے کے لائق ہیں۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے مفصل کلام کیا اور اس مقام سے متعلق تمام مباحث کا احاطہ کیا جن سے علوم بلاغت میں شیخ کا بلند مقام واضح ہوتا ہے، جس تک پہنچنے سے بلغاء کے قدم قاصر اور شیخ کے معاصرین حیران ہیں۔

اگر حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی ان دونوں کتابوں میں بکھرے مباحث کو یکجا کیا جائے اور محض اس آیت کے متعلق شیخ کے ذکر کردہ مراجع کی عبارات ان کے منتخب بکھرے موتیوں کو جمع کیا جائے اور پھر انہیں معاصر اسلوب کے مطابق عمدگی سے ترتیب دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور بلاشبہ یہ کتاب، کتب تفسیر اور کتب بلاغت و بیان میں اعلیٰ پائے کا ذخیرہ ثابت ہوگی۔

اس مقام پر شیخ نے اس نکتے کی بھی تحقیق فرمائی ہے کہ لفظ "توفي" کا موت کے معنی میں استعمال کنایہ بیانیہ ہے یا کنایہ اصولیہ؟ اور کنایہ، حقیقت لغویہ ہے یا مجازِ لغوی؟ اور کون سا قول حق ہے؟ اس کے علاوہ بھی علم بلاغت کے ایسے لطائف و معارف بیان فرمائے ہیں، جن کی صحیح معنوں میں وہی قدر کر سکتا ہے جو خود فصیح و بلیغ ہو، علم معانی کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہو اور الفاظ کی فصاحت میں بھی اس کو حظ وافر حاصل ہو۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "عقيدة الإسلام" میں اس سلسلے میں ایک مستقل فصل قائم فرمائی ہے جس کا عنوان یوں ہے:

> "فصل في تفسير لفظ "المتوفي"، وشرحه لغة وعرفا، وبيانه حقيقة وكناية، وتوفية حقه، واستيفاء مستحقه".
>
> "یعنی یہ فصل لفظِ "المتوفّي" کی تفسیر، اس کی لغوی و عرفی تشریح، اس کے حقیقی و کنائی استعمال کی توضیح، نیز اس کے حق کو پورا پورا ادا کرنے اور اس کے مستحق مصداق کو واضح بیان کرنے کے بارے میں ہے۔"

درحقیقت حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اس لفظِ "توفي" کی اس قدر بحث و تحقیق کا باعث، نبوت کے جھوٹے دعوے دار ملعون مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ملحد متبعین کی تردید کرنا تھا، جن کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی دیئے جا چکے اور موت سے ہم کنار ہو چکے ہیں اور اپنے اس باطل نظریے پر انہوں نے قرآن کریم (کے اسی لفظ "توفي") سے استدلال کیا ہے اور قرآن کی

شدید تحریف کرتے ہوئے اس کے معنی ومفہوم کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے، نیز قرآن کے مقصود میں تصحیف کرتے ہوئے اسے منسوخ ٹھہرایا ہے، چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اسی لفظ کے بارے میں اس بدبخت، جاہل (مرزا قادیانی) اور اس کے متبعین نے شور وشغب ڈال رکھا ہے، ان کا شور شرابا اس چکی سے ابھرنے والی آوازوں کی مانند ہے جس میں آٹا پس ہی نہ رہا ہو۔ انہوں نے اس لفظ کے متعلق اصرار وتکرار کرتے ہوئے صفحات کے صفحات کالے کر ڈالے ہیں، اس جاہل کی کوئی بھی تحریر دیکھ لیجیے، اس لفظ پر اونٹ کی مانند جگالی کرتا دکھائی دے گا، جس کی بنا پر ناظرین اکتا جاتے ہیں اور ان کا دل لکھنے والے پر لعنت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہی اس کی پھوٹی کوڑی ہے جس کی تردید کی گئی تو دھتکارا گیا اور تنقید وتردید کا جواب نہ دے پایا، چنانچہ اس کی حالت اس شعر کا مصداق تھی:

مَا زَالَ سِرُّ الْكُفْرِ بَيْنَ ضُلُوْعِهِ
حَتّٰى اصْطَلٰى سِرُّ الزِّنَادِ الْوَرٰى

ترجمہ: ''کفر کا راز ہمیشہ اس کی پسلیوں کے درمیان (دل میں پوشیدہ) رہا، یہاں تک کہ چقماق کے اندر چھپی آگ بھڑک اٹھی۔''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملعون کا خوب علمی مقابلہ کیا اور بہترین اسلوب میں اس کے نظریے کی تردید کی اور حق کو ایسا واشگاف فرمادیا کہ (اس مسئلے کے متعلق) مزید بحث کی گنجائش نہیں چھوڑی اور اس بدبخت کو گویا شیر کے سامنے ڈال آئے، (نیز اہل حق کے عقیدے کو اس انداز سے) ثابت کیا کہ گویا قرآن اسی ملعون (کے باطل نظریے) کی تردید اور اس کے پہلو میں دہکتا انگارا رکھنے کے لیے نازل ہوا ہے، چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ہر جانب سے دروازے بند کر دیئے اور وہ دنیا میں ناکام ونامراد اور آخرت میں دائمی عذاب کا مستحق ٹھہرا، یہ مختصر رسالہ ان تمام تفصیلات ومباحث کو مکمل بیان کرنے کا متحمل نہیں، اس لیے ہم اس قلیل مقدار پر بھی اکتفا کرتے ہیں، بارہا دل میں یہ

خیال گزرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھاؤں گا اور ان نفیس علمی مباحث کو ان کے گراں قیمت خزانوں سے نکال کر پیش کروں گا؛ تا کہ علم بلاغت کے طلبہ کو شیخ کے بلند تر و تابناک علمی خوان عام کا فیضان حاصل ہو سکے، واللہ ولي التوفيق وهو حسبي ونعم الوكيل!

راقم عرض کرتا ہے: قرآن کریم کے اعجاز کے اس دقیق و مخفی پہلو یعنی قرآنی مفردات کے اعجاز کو جس طرح ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے، ان سے قبل کسی کی نظر اس طرف نہیں گئی اور نہ ہی اس پہلو کو اس درجہ واضح کیا ہے، اگرچہ اعجاز قرآنی کے دیگر پہلوؤں مثلاً: ترکیب یا ترتیب کے پہلو سے اعجاز کو علمائے سلف نے بھی بیان کیا ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان جہتوں کو اعجاز قرآنی کا مدار اور قرآن کے چیلنج اور مقابلے کا محل شمار نہیں کیا، حالانکہ اعجاز قرآن کے حوالے سے یہ پہلو سب سے زیادہ اہتمام کے لائق اور مجادلہ و مقابلہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے، چناں چہ میں کبار اہل علم کے بعض بیانات کا انتخاب کر کے اس نکتے کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا، ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اس جانب توجہ کا یہ سبب نہیں کہ فصحاء بلغاء کو معمولی غور و فکر سے اس جہت کا ادراک ہو جاتا ہے، یا سلف نے اس پہلو پر تنبیہ فرما دی، بلکہ درحقیقت شیخ کا عزم ہی ہوتا تھا کہ دقیق و مخفی گوشوں کو بے نقاب کریں اور ان پہلوؤں کو واضح کریں جو متقدمین نے واضح نہیں کیں، چناں چہ متوسط درجہ کے اہل علم کی طرح ان کی عادت محض متقدمین کی تحقیقات کو نقل کر دینے کی نہیں ہے، بلکہ وہ محققین علماء کی راہ پر گامزن ہیں، جو تحقیق و تدقیق کی انتہا کو پہنچ چکے ہوں، البتہ حسب ضرورت سلف کے اقوال بھی ذکر فرما دیتے ہیں، واللہ المستعان!

لفظِ ''ضِيْزٰى'' کے استعمال میں نکات

راقم عرض کرتا ہے: بعض اوقات ایک لفظ قرآن کریم کے علاوہ قبیح لگتا ہے، سلیم طبیعت کو اس سے وحشت ہوتی ہے اور نا موافق لگتا ہے، لیکن وہی لفظ نظم قرآنی میں اتنا خوبصورت و مناسب

دکھائی دیتا ہے کہ کوئی دوسرا لفظ اس کا قائم مقام بھی نہیں بن سکتا اور اس کی وجہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی کاری گری کا اعجاز ہے، جس نے کائنات کی ہر چیز کو مستحکم اور عمدہ بنایا ہے اور اس میں کوئی خلل نہیں چھوڑا، مثلاً: لفظ ''ضِیزیٰ'' کو ہی لیجیے کہ جس مقام میں یہ کلمہ استعمال کیا گیا ہے، کوئی دوسرا کلمہ اس کی جگہ لے ہی نہیں سکتا، غور فرمایئے کہ سورۂ نجم (جس میں یہ لفظ آیا ہے) پوری کی پوری حرفِ ''یا'' کے سجع میں پروئی ہوئی ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ''وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى'' (النجم:۱،۲) یونہی سورت کے آخر تک ہر آیت کے آخر میں ''یا'' ہے، جب بتوں کا مشرکین کی جانب سے اولاد کی تقسیم (مشرکین اپنے لیے بچوں کو پسند کرتے تھے اور ملائکہ کو اللہ تعالی کی بیٹیاں کہتے تھے، انہوں نے از خود یہ تقسیم گھڑ لی تھی) اور کفار کے دیگر باطل عقائد کا تذکرہ آیا تو فرمایا: ''أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى، تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى.'' (النجم:۲۱،۲۲)

ترجمہ: ''کیا تمہارے لیے تو بیٹے تجویز ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ اس حالت میں تو یہ بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی!۔''

چناں چہ لفظ ''ضیزیٰ'' بھی اس حرف سجع کے مطابق ہے، جو پوری سورت کی تمام آیات کے آخر میں آیا ہے اور اس جگہ کوئی اور لفظ اس کا قائم مقام نہیں بن سکتا تھا، اگرچہ معنوی اعتبار میں اس سے خوبصورت لفظ بھی ہے، لیکن اس مقام پر وہ سورت کی دیگر آیات کے آخری لفظ کے موافق ومناسب نہ ہوتا، کیونکہ وہ سورت کے حرف سجع سے خارج ہوتا، مثلاً: اگر اس لفظ کا ہم معنی دوسرا لفظ رکھ کر یوں کہیں: ''(تلك إذًا) قسمة جائرة، أو ظالمة'' (یعنی تب تو یہ ظلم وناانصافی پر مبنی تقسیم ہوگی) تو بلاشبہ لفظی اعتبار سے لفظ ''جائرۃ'' اور ''ظالمۃ''، لفظ ''ضیزیٰ'' سے زیادہ خوبصورت ہیں، لیکن اس صورت میں اگر ہم کلام کو مربوط کر کے یوں پڑھیں گے: ''ألكم الذكر وله الأنثىٰ، تلك إذًا قسمة ظالمة'' تو نظم قرآنی میں اس طرح کی خوب صورتی نہیں رہے گی اور کلام ناقص چیز کی مانند تکمیل کا محتاج ہو جائے گا، نظم کلام کا ذوق وپہچان رکھنے والے پر یہ نکتہ مخفی نہیں رہ سکتا۔

نامور ادیب وانشا پرداز علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''المثل السائر'' (ص:۶۲) میں اس نکتے پر تنبیہ فرمائی ہے، جس کو میں نے قدرے اختصار وتلخیص کے ساتھ پیش کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس لفظ کے لطائف میں ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے اس لفظ کے ذریعے کفار کی مزعومہ تقسیم کی قباحت کی جانب اشارہ کیا ہے؛ کیونکہ لفظ اپنے معنی کا عنوان ہوا کرتا ہے اُدباء وبلغاء کی عادت ہے کہ معنوی ہولناکی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کوئی ہولناک لفظ لے آیا کرتے ہیں، یہ ایک وسیع اور مستقل تحقیق کا متقاضی موضوع ہے، جس کی اس مقام پر گنجائش نہیں۔

اس نکتے کی مزید وضاحت علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، جو انہوں نے اپنی کتاب میں ایک مقام پر (ص:۱۱۱) ذکر کیا ہے:

''لفظِ ''الأخدع'' دو مختلف شعروں میں استعمال ہوا ہے، ان میں سے ایک شعر میں یہ لفظ خوب صورت اور عمدہ معلوم ہوتا ہے، جبکہ دوسرے میں ثقیل اور طبع سلیم کو ناپسند محسوس ہوتا ہے، حماسہ کے منتخب شعراء میں سے ابن صمہ عبداللہ کا شعر ہے:

تَلَفَّتُّ نَحْوَ الْحَيِّ حَتّٰى وَجَدتُّنِيْ

وَجِعْتُ مِنَ الإِصْغَاءِ لَيْتًا وَأَخْدَعًا

ترجمہ: ''(جدائی کا وقت ہوا تو محبوب کے) محلے کی طرف بکثرت دیکھنے پر اور اس طرف کان لگانے کی بنا پر میری گردن کے کنارے اور گردن کی رگ میں درد ہونے لگا۔''

اب ابوتمام کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

يَا دَهْرُ قَوِّمْ مِنْ أَخْدَعِيْكَ فَقَدْ

أَضْبَحْتَ هٰذَا الأَنَامَ عَنْ خَرْقِكَ

ترجمہ: ''اے زمانے! اپنے حوادث ختم کر، تو نے اپنے حوادث سے انسانوں کو تنگ دل وتنگ عیش کر رکھا ہے۔''

غور فرمایئے: ابو تمام کے شعر میں یہ لفظ کانوں پر بوجھل اور سلیم طبیعت کے لیے ناپسندیدہ ہے، جبکہ ابن صمہ عبداللہ کے شعر میں درج اسی لفظ میں کئی گنا راحت وخفت اور انسیت وتر وتازگی پائی جاتی ہے۔''

کبھی ایک کلمے کو مفرد استعمال کیا جائے تو خوب صورت معلوم ہوتا ہے اور جمع استعمال کیا جائے تو ثقیل اور تنافر زدہ دکھائی دیتا ہے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، قرآن کریم پہلی صورت میں کلمہ کو مفرد ہی لاتا ہے اور جمع کی صورت میں بالکل نہیں لاتا، جبکہ دوسری صورت میں جمع لاتا ہے، مفرد حالت میں کبھی نہیں لاتا۔

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری صورت کی مثال اپنی کتاب (ص:۱۱۱) میں یوں ذکر فرمائی ہے:

''اس قسم کے اعجاز میں سے وہ الفاظ بھی ہیں، جن کے استعمال سے اعراض کیا جاتا ہے، حالانکہ ان سے اعراض کی کوئی دلیل نہیں ہوتی اور اس سلسلے میں صرف ذوق سلیم ہی رہنمائی کرسکتا ہے، اس عجیب مقام کی حقیقت واسرار معلوم نہیں ہوسکتے، اس قسم کے الفاظ میں سے لفظ ''لب'' بمعنی ''عقل''، ''لُبٌّ'' بمعنی ''مغز وگودہ'' مراد نہیں، جو چھلکے تلے ہوتا ہے، اس لفظ کا استعمال بصورت جمع ہی اچھا لگتا ہے اور کہیں بھی مفرد استعمال نہیں ہوا، مثلاً: ارشاد ربانی ہے: ''وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَاب'' (ابراہیم:۵۲) اور ''إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ'' (الزمر:۲۱) اس جیسے الفاظ میں لفظِ ''اَلْأَكْوَابُ'' اور لفظِ ''اَلْأَرْجَاءُ'' بھی ہیں، جو قرآن کریم میں صرف بصورت جمع ہی آئے ہیں اور ان کے مفرد الفاظ ''اَلْكُوْبُ'' اور ''اَلرَّجَا'' (الف مقصورہ کے ساتھ) قرآن میں مستعمل نہیں۔''

پہلی صورت کی مثال شیخ مصطفی صادق رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کی ہے:

''لفظ''الأرض ''قرآن کریم میں مفرد ہی استعمال ہوا ہے اور جہاں لفظ''السماء'' بصورت جمع ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی لفظ''الأرض ''مفرد ہی آیا ہے، اور جب اس لفظ کو جمع لانے کی ضرورت پیش آئی تو جمع کے معنی کی ادائیگی ایسی صورت میں کی گئی جس میں فصاحت کی روح، اس کی واقعیت اور کلام کا جمال برقرار رہے، اس مقام پر فکر وشعور، بے ساختہ جھکا ہی چلا جاتا ہے، ملاحظہ کیجیے کہ ارشاد ربانی ہے:''اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ'' (طلاق:۱۲) یہاں''سبع أرضین''نہیں فرمایا کہ اس سے لفظ میں کرختگی دَر آتی اور نظم قرآنی میں خلل واقع ہوجاتا۔''

ابن نفیس رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب''الطریق إلی الفصاحۃ''میں بیان فرمایا ہے:

''کبھی کلمے کو ایک صیغے سے دوسرے صیغے کی جانب، یا ایک وزن سے دوسرے وزن کی طرف، یا ماضی سے مستقبل کی طرف، یا اس کے برعکس نقل کیا جاتا ہے تو خوب صورت ہوجاتا ہے، جبکہ پہلے قبیح تھا اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، مثلاً: لفظ''خَوِدَ'' بمعنی ''أسرعَ''(جلدی کرنا) قبیح ہے، جب تو اسم''خود''(نرم ونازک عورت) بنایا تو اس کا قبح کم تر ہوگیا، اسی طرح''وَدَعَ''ماضی کے صیغے کے ساتھ قبیح ہے اس لیے کہ ماضی کا صیغہ''وَدَعَ''کم استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ لفظ فعل امر اور فعل مضارع کی صورت میں ہو تو حسن آجاتا ہے۔ یونہی لفظ''لبّ'' بمعنی ''عقل''مفرد ہو تو قبیح شمار ہوتا ہے، لیکن جمع کی صورت میں یہ قبح ختم ہوجاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:''لأولي الألباب''میں لفظ''لبّ'' مفرد حالت میں مجازاً ہی استعمال ہوا ہے، مثلا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:''ما رأیت من ناقصات عقل ودین أذهب للبّ الرجل الحازم من إحداکن''(میں نے عقل ودین میں کم ہونے کے باوجود عقل مند شخص پر غالب آنے میں تم سے بڑھ کر کسی

کو نہیں دیکھا)، یا پھر اضافت کی حالت میں مفرد استعمال ہوتا ہے، مثلاً: جریر کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

يَصْرَعْنَ ذَا اللُّبِّ حَتّٰى لَا حِرَاكَ بِهِ
وَهُنَّ أَضْعَفُ خَلْقِ اللّٰهِ أَرْكَانًا

ترجمہ: ''یہ عورتیں عقل مند انسان کو ایسا پچھاڑ دیتی ہیں کہ وہ بے حس وحرکت ہو جاتا ہے، حالانکہ وہ اعضاء وجوارح کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی کمزور ترین مخلوق ہیں۔''

اسی طرح لفظ ''الأرجاء'' کا استعمال بصورت جمع ہی مستحسن ہوتا ہے، مثلاً: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''والملك علی أرجائها.'' (الحاقۃ:۱۷) اور مفرد کے صیغے کے ساتھ صرف اضافت کی حالت میں استعمال ہوتا ہے، جیسے: ہم کہیں: ''رجا البئر'' (کنوئیں کا کنارہ)، یونہی لفظ ''أصواف'' بھی جمع کی صورت میں خوب صورت معلوم ہوتا ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَمِنْ أَصْوَافِهَا'' (النحل:۸۰) صیغۂ مفرد کے ساتھ اس کا استعمال بھلا نہیں لگتا۔ ابوتمام کا یہ قول ملاحظہ کیجیے:

فَكَأَنَّمَا لَبِسَ الزَّمَانُ الصُّوْفَا

ترجمہ: ''گویا زمانے نے اون پہن رکھا ہے۔''

نیز تمام مصادر بصورت مفرد حسین اور بصیغہ جمع قبیح سمجھے جاتے ہیں، یہی حال ''ضَيْفٌ وضُيُوفٌ'' کا ہے اور ''بُقْعَةٌ وبِقَاعٌ'' میں لفظ ''بِقَاعٌ'' بصورت جمع حسین معلوم ہوتا ہے، جیسے: ''بِقَاعُ الأَرْضِ.''

ابن نفیس رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ عبارت علامہ بہاء الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''عروس الأفراح'' میں نقل کی ہے۔

اگر ایک ہی معنی کے لیے متعدد الفاظ ہوں اور ان میں سے کوئی بھی ثقل، کراہت اور ابتذال

(یعنی کثرت استعمال کی بنا پر اپنی وقعت کو کھو بیٹھنے) سے خالی نہ ہو تو قرآن ایسے موقع پر اس مفہوم کو ایسے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، جو حقیقت کو واضح کر دے اور اس مفہوم کے لیے وضع کردہ الفاظ سے اعراض کر لیتا ہے، علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب (ص:۱۷) میں رقم طراز ہیں:

''وإن شئت أن تعلم من سر الفصاحة التي تضمنها القرآن فانظر إلى هذا الموضع؛ فإنه لما جيء فيه بذكر ''الآجر'' لم يذكره بلفظه، ولا بلفظ ''القرمد'' أيضا، ولا بلفظ ''الطوب'' الذي هو لغة أهل مصر؛ فإن هذه الأسماء مبتذلة، لكن ذكر في القرآن على وجه آخر، وهو قوله تعالى: ''وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاأَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا''، فعبر عن الآجر بالوقود على الطين''.

ترجمہ: ''اگر آپ قرآن کریم میں موجود فصاحت وبلاغت کے اسرار ورموز سے آگاہی چاہتے ہیں تو ذرا اس مقام پر غور کیجیے: جب قرآن کریم میں پکی اینٹ کا تذکرہ آیا تو اس کے لیے لفظ ''الآجر'' ذکر کیا، نہ لفظ ''اَلْقَرْمَدْ'' لایا اور نہ ہی اہل مصر کی لغت کے مطابق ''اَلطُّوْبُ'' استعمال کیا؛ اس لیے کہ (اس معنی ومفہوم کے لیے وضع کیے گئے) یہ تمام اسماء مبتذل (کثیر الاستعمال ہونے کی بنا پر بے وقعت اور گھٹیا) ہو چلے تھے، بلکہ قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایک منفرد انداز میں یوں بیان فرمایا: ''وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاأَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا'' (القصص:۳۸)(اور دلائل موسویہ دیکھ سن کر) فرعون کہنے لگا کہ: اے اہل دربار! مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا تو اے ہامان! تو ہمارے لیے مٹی (کی اینٹیں) بنوا کر ان

کو آگ میں پکواؤ، پھر ان پختہ اینٹوں سے میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ)۔

ملاحظہ کیجیے! کس خوبی سے پکی اینٹ کے لیے الوقود علی الطین (آگ پر پکانے) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔"

راقم سطور عرض کرتا ہے: مفسرین نے اس تعبیر کے متعلق ایک اور نکتہ بھی بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ فرعون کے زمانے سے قبل لوگ "اَلطُّوْبُ" اور لفظ "اَلْقَرْمَدُ" سے واقف نہ تھے، اس منفرد تعبیر میں اس کاری گری کی تعلیم بھی ہے اور "اَلْقَرْمَدُ" کی حقیقت کی وضاحت بھی ہے، بلاشبہ اس نوع کے نکات اور اسرار ورموز میں باہمی مزاحمت نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس روشن کتاب کی فصاحت وبلاغت اور اس کے حیران کن اعجاز سے متعلق اسرار میں ایسے انوکھے لطائف ومعارف ہیں، جن کے حسن وجمال، خوبی وکمال، رونق وتابناکی اور حسن سلاست وتازگی کی بنا پر انسانی عقلیں حیران وسرگرداں ہیں، اسرار ومعارف قرآنیہ کا یہ موضوع تو دریائے ناپیدا کنار ہے، یہاں تو میں اس دریائے علم کا ایک قطرہ اور رواں دواں چشمے کی چند بوندیں ہی پیش کرسکا ہوں، قرآنی محاسن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ انسانی عقلوں کے لیے ناممکن ہے، بلکہ اس میدان میں عقلیں حیران اور اس وادی میں خیالات وافکار سرگرداں ہیں، علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"اس فن میں غوطہ زنی کرنے والوں کو خوب غور وتدبر سے کام لینا چاہیے، وہ یہ جان لیں کہ قرآنی محاسن کے ہر گوشے میں خزانے پوشیدہ ہیں، اگر وہ قرآنی الفاظ کے استعمال میں پنہاں اسرار ورموز میں غور وفکر کریں اور ان کی توضیح وقیاس کے دریا میں غوطہ زن ہوں گے تو انہیں عجیب وغریب لطائف ومعارف دکھائی دیں گے۔"

بہر کیف مفردات کے اعتبار سے اعجاز قرآنی کے یہ چند پہلو میں نے حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی وضاحت کی خاطر بیان کیے ہیں۔

ترکیبِ نظم کے اعتبار سے اعجازِ قرآنی

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ترکیب وترتیب کے پہلو سے قرآن کا اعجاز اس طور پر ہے کہ قرآن کریم، مفردات کی مختلف تراکیب میں سے ایسی ترکیب کا انتخاب کرتا ہے، جو اس مقام کے مناسب ہو اور ذوق سلیم، سرسری غور وفکر میں بھی اس سے اکتاہٹ محسوس نہ کرے، قرآن بہرصورت ایسی ترکیب کا چناؤ کرتا ہے جس سے زیادہ بلیغ، حقیقت کو مکمل بیان کردینے والی اور مقصود کی وضاحت میں مفید تر ترکیب ممکن ہی نہ ہو، مثلاً: حق تعالیٰ شانہ کے اس فرمان پر ذرا نگاہ ڈالیے: ''وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ.'' (الانعام:۱۰۰) (اور لوگوں نے شیاطین کو اللہ کا شریک قرار دے رکھا ہے) سطحی رائے کے اعتبار سے یہاں عبارت یوں ہونی چاہیے: ''وَجَعَلُوْا الْجِنَّ شُرَكَاۗءَ لِلّٰهِ''، لیکن یہاں قرآن کریم کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ انہوں نے اللہ ہی کے لیے شریک ٹھہرائے ہیں، کسی اور کے لیے نہیں، یعنی انہوں نے اس معبود برحق کے لیے شریک ٹھہرائے جو یکتا اور ہر شریک سے بے نیاز و مستغنی ہے، (ترکیبی اعتبار سے) لفظ ''اللہ'' کو مقدم کرکے ان کے اس فعلِ بد کی قباحت کو عظیم تر گناہ کی صورت میں پیش کرنا مقصود ہے کہ یہ نری حماقت ہے، پھر چوں کہ مشرکین نے محض اللہ کے شریک ٹھہرانے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اللہ کا شریک بھی ان جنات کو ٹھہرایا جو اس کی مخلوقات میں ایک کمزور ترین مخلوق ہے، یہ دوسری حماقت پہلی سے بڑھ کر تھی، چنانچہ یہ کلام جس مقصد کے لیے لایا گیا، وہ اسی منتخب ترکیب سے ہی ادا ہوسکتا ہے، بہرکیف قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ظاہری عبارت سے ہٹا کر ایسی ترکیب چنتا ہے جس میں لطیف اسرار پنہاں ہوتے ہیں، جو انسانی عقلوں سے بلند تر اور فہم انسانی کے لیے دقیق تر ہوتے ہیں۔''

راقم سطور عرض کرتا ہے: مذکورہ قرآنی تعبیر کے مقصود سے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اختیار کردہ رائے اس احتمال پر مبنی ہے کہ لفظ "الجن" (ترکیبی اعتبار سے) "شرکاء" سے بدل ہو، علامہ ابو سعود رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں امام فراء وابواسحاق رحمہما اللہ کا یہی قول نقل کیا ہے، نیز امام ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیروں "بحر" اور "نہر" میں اسی کو حوفی اور ابوالبقا رحمہما اللہ کا مختار قول قرار دیا ہے۔

اس رائے پر اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ "الجن" کو "شرکاء" سے بدل قرار دینا درست نہیں؛ اس لیے کہ یہاں بدل کو مبدل منہ کی جگہ ذکر کرنا درست نہیں بنتا، حالانکہ یہ شرط ہے (کہ ایک اسم دوسرے سے اسی صورت میں بدل واقع ہوسکتا ہے، جب مبدل منہ کی جگہ بدل کو ذکر کرنے کے بعد کلام درست رہے) لیکن ممکن ہے کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ان علمائے نحو کے مذہب کی بنیاد پر ہو، جن کے نزدیک ترکیبی ضابطے میں یہ قاعدہ کلیہ شرط نہیں، بہرکیف یہ بحث اس مقام کے مناسب نہیں۔

ایک اور احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ "الجن" کو مفعول اول قرار دیا جائے اور "شرکاء" مفعول ثانی کو مذکورہ نکتے کی خاطر مقدم کیا جائے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں بھی بظاہر اسی احتمال کی ترجیح محسوس ہوتی ہے۔

بہر حال دونوں صورتوں میں "للہ"، "شرکاء" ہی سے متعلق ہے اور اسے اسی اہتمام کی بنا پر مقدم کیا گیا ہے، جو معنی کے بیان میں گزر چکا اور جس کی رعایت لفظ کی تفسیر میں کی گئی ہے، تفسیر کشاف میں علامہ زمخشری نے انہی دو احتمالوں کے متعلق بحث کی ہے، ملاحظہ فرمائیے، علامہ زمخشری کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

"فإن قلت : فما فائدة التقديم؟ قلت : فائدته استعظام أن يتخذ لله شريك من كان ملكاً، أو جنيا، أو إنسيا، أو غير ذلك ، ولذلك قدّم اسم الله على الشركاء۔"

ترجمہ: "اگر آپ کہیں گے: اس تقدیم (وتاخیر) کا فائدہ کیا؟ تو میں (جواب میں)

کہوں گا: اس کا فائدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی قباحت کو عظیم تر بنا کر پیش کرنا ہے، خواہ وہ شریک فرشتہ ہو، یا جن، انسان، اسی بنا پر لفظ ''اللہ'' کو ''الشرکاء'' پر مقدم کیا گیا ہے۔''

اس آیت کے تحت اہل علم نے دیگر ترکیبیں بھی درج کی ہیں، لیکن ان کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی ان ترکیبوں کی بنیاد پر حضرت شیخ کا کلام درست قرار پائے گا، اسی پر اکتفا مناسب ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''نيل الفرقدين'' کے خاتمے میں رقم طراز ہیں:

''ومن المعلوم أن لا ترادف في المفردات عند المحققين، وكذا في المركبات، فضرب زيد عمرا، وضرب عمرا زيد، وزيد ضرب عمرا، كلها تراكيب متغايرة في المعاني الثواني، وكذا زيد قائم، وقائم زيد، وزيد القائم، والقائم زيد''۔

ترجمہ: ''اہل علم میں یہ بات معروف ہے کہ محققین کے نزدیک نہ مفردات میں ترادف پایا جاتا ہے، نہ ہی مرکبات میں، چنانچہ ضرب زید عمرا، ضرب عمرا زید اور زید ضرب عمرا تینوں ترکیبیں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتی ہیں، اسی طرح زید قائم، قام زید، زید القائم اور القائم زید بھی جدا جدا معانی کے لیے مستعمل تراکیب ہیں۔''

راقم کہتا ہے: ترکیب وترتیب کی یہ جہت معنی کے اعتبار سے ہے اور اسی پر معنوی بلاغت کا دارومدار ہے اور یہ پہلو بسا اوقات ایسے دقائق ولطائف پر مشتمل ہوتا ہے کہ جن کا ادراک علامہ زمخشری اور جرجانی جیسے علومِ بلاغت میں مہارت کا بڑا حصہ پانے والے اہل علم ہی کر سکتے ہیں، اگر (بالفرض) فی زمانہ ان جیسا کوئی ہو، اس بنا پر (ترکیب وترتیب کا) یہ پہلو بہت اہم اور قابل توجہ واہتمام ہے، اسی لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس پہلو کی جانب توجہ فرمائی ہے۔

نظمِ کلام کی ترتیب کے دیگر پہلو بھی ہیں، مثلاً: کلام کے درمیان باہمی مناسبت، کلام کی آب وتاب اور حسن وجمال، سلاست، لفظی عیوب سے سلامتی، کانوں پر بوجھ بننے اور طبیعت کے لیے ناپسندیدہ ہونے سے محفوظ ہونا، گویا کلام خوبصورت ترتیب بنایا گیا اور منفرد قالب میں ڈھالا گیا ہو، علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ علمائے فن نے ان مباحث کی جانب توجہات مبذول کرائی ہیں، اس مقام کا حق ادا کرنے اور مقصود بحث کی وضاحت کے لیے چند مثالیں ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں، ملاحظہ فرمائیے:

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ ''المثل السائر'' (ص:۵۷) میں رقم طراز ہیں:

''جان لیجیے کہ مفردات کی بنسبت الفاظ کی ترکیب میں تفاضل وتفاوت زیادہ واقع ہوتا ہے؛ اس لیے کہ ترکیب زیادہ مشکل اور دشوار ہے، غور کر لیجیے کہ انفرادی طور پر قرآن کریم کے الفاظ تو عرب پہلے سے استعمال کرتے چلے آرہے تھے اور بعد کے عربوں نے بھی استعمال کیے ہیں، لیکن اس کے باوجود قرآن کریم ان کے تمام کلام سے بلند تر اور فائق ہے، یہ تفوق محض ترکیبی فوقیت کی بنا پر ہے۔ کیا ہماری اس کتاب کا بغور مطالعہ کرنے والا کوئی بھی قاری، قرآن کریم کی درج ذیل آیت ملاحظہ کرنے کے بعد بھی اس نقطۂ نظر کے متعلق شش وپنج میں مبتلا ہوسکتا ہے؟ ذرا غور کیجیے! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَقِيلَ يَٰٓأَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّٰلِمِينَ. ''

(ہود:۴۴)

ترجمہ: ''حکم ہوگیا کہ اے زمین! اپنا پانی (جو کہ تیری سطح پر موجود ہے) نگل جا اور اے آسمان! (برسنے سے) تھم جا، (چنانچہ دونوں امر واقع ہوگئے) اور پانی گھٹ

گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی (کوہِ) جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دور۔"

ان الفاظ میں ظاہری طور پر محسوس ہونے والا امتیاز محض ان کی خاص ترکیب وترتیب کی بنا پر ہے اور یہ خوبصورتی پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ دوسرے سے، دوسرا تیسرے سے اسی طرح آخر تک مربوط ہے، اب بھی آپ کو تردد ہو تو مزید غور کیجیے! اگر اس آیت کے الفاظ میں سے کسی بھی لفظ کو اٹھا کر الگ کر دیا جائے تو کیا اس لفظ میں وہ حسن وخوبی برقرار رہے گی، جو آیت میں اس کے مخصوص مقام پر رکھنے سے نکھر کر سامنے آئی ہے؟!۔

اس نقطۂ نظر کی شہادت وتائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ کبھی کسی جملے میں ایک لفظ آپ کو خوب صورت دِکھتا ہے، لیکن وہی لفظ دوسرے جملے میں ناپسند لگتا ہے، اس نکتے کا انکار وہی کر سکتا ہے جو فصاحت وبلاغت کے ذوق سے ناآشنا اور ترکیب وانفرادیت میں الفاظ کے استعمال کے لطیف اسرار سے واقف نہ ہو، اس حوالے سے ایک مثال بیان کرتا ہوں، جو مذکورہ رائے کی صحت کی گواہی دے گی، کبھی ایک ہی لفظ، قرآن کریم کی کسی آیت میں وارد ہوتا ہے اور وہی لفظ، ایک شعر میں بھی مستعمل ہوتا ہے، لیکن قرآنی آیت میں تو اس لفظ میں فصاحت ومتانت دکھائی دیتی ہے، جبکہ شعر میں وہی لفظ نامناسب وناموزوں نظر آتا ہے، ایک ہی لفظ میں یہ دو متضاد وصف محض ترکیب کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، ذرا ذیل میں آیت کریمہ ملاحظہ کیجیے:

"فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَئْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ." (احزاب:۵۳)

ترجمہ: "پھر جب کھانا کھا چکو تو اُٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت

بیٹھے رہا کرو؛اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے،سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ صاف صاف بات کہنے سے (کسی کا) لحاظ نہیں کرتا۔"

اوراب متنبی کا یہ شعر دیکھیے:

تَلَذُّ لَهُ الْمُرُوْءَةُ وَهْيَ تُؤْذِيْ وَمَن يَّعْشَقْ يَلَذُّ لَهُ الْغَرَامُ

ترجمہ: "شرافت ومروت اس کے لیے لذیذ ہے، حالانکہ یہی مروت، ایذا رساں ہےاور ایک عاشق کے لیے محبت کا بوجھ بھی لذیذ ہوا کرتا ہے۔"

متنبی کا یہ شعر،معنوی شرافت کے اعتبار سے ایک عمدہ شعر ہے،لیکن لفظ "تؤذي" اس شعر میں بھی استعمال ہوا ہےاور قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں بھی آیا ہے،لیکن اس لفظ نے ترکیبی ضعف کی بنا پر شعر کی قیمت گھٹا دی ہے، جبکہ قرآنی آیت کی ترکیب میں بہترین مقام پر واقع ہونے کی بنا پر اس کا حسن نکھر کر سامنے آتا ہے، اب غور وتدبر کرنے والے قارئین ہمارے بیان کردہ مذکورہ نقطۂ نظر کے حوالے سے انصاف سے کام لیں اوراس کی صحت سے آگاہی کے لیے اپنی سلیم طبائع کے سامنے پیش کریں، یہ پیچیدہ ودقیق بحث اضافی غور وفکر کی متقاضی ہےاور راقم کی دانست میں مجھ سے قبل یہ بحث کسی نے نہیں چھیڑی۔ نیز جب کلام میں لفظِ "تؤذي" استعمال ہوتو اس کو اپنے بعد والے کلام کے تحت درج اوراس سے متعلق ہونا چاہیے، جیسے آیت کریمہ "إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ" میں دکھائی دے رہا ہے،لیکن متنبی کے شعر میں اگلا مصرع:

وَمَن يَّعْشَقْ يَلَذُّ لَهُ الْغَرَامُ

جملہ مستانفہ ہے (یعنی ماقبل کا کلام مکمل ہو چکا ہےاوراس دوسرے مصرع سے اس کا کوئی تعلق نہیں)اوراس سے پہلے یہ لفظ "تؤذي" استعمال ہوا ہے"۔علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت یہاں مکمل ہوگئی۔

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ (المثل السائر: ۴۷ پر) مزید لکھتے ہیں:

”وأما إذا صارت مركبة فلتركيبها حكم آخر، وذاك أنه يحدث عنه من فوائد التأليفات والامتزاجات ما يخيّل للسامع أن هذه الألفاظ ليست تلك التي كانت مفردة، ومثال ذلك كمن أخذ لآلي ليست من ذوات القيم الغالية، فألّفها وأحسن الوضع في تأليفها، فخُيّل للناظر بحسن تأليفه، وإتقان صنعته أنها ليست تلك التي كانت منثورة مبددة، وفي عكس ذلك من أخذ لآلي من ذوات القيم الغالية، فيفسد تأليفها؛ فإنه يضيع من حسنها، وكذلك يجري حكم الألفاظ العالية مع فساد التأليف، وهذا موضع شريف ينبغي الالتفات إليه والعناية به.“

ترجمہ: ”جب یہی مفرد الفاظ، ترکیب میں استعمال ہوں تو ان کی ترکیب کا حکم جدا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکیب وتالیف اور حسنِ امتزاج کا ایک فائدہ یہ ہے کہ سننے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ وہ مفرد الفاظ نہیں ہیں، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص کچھ ایسے موتی اکھٹے کرلے، جو بہت قیمتی نہ ہوں، پھر ان موتیوں کو عمدگی سے جوڑ کر ترتیب دے دے، چنانچہ خوب صورت تنظیم اور عمدہ کاریگری کی بنا پر دیکھنے والا یہ خیال کرے گا کہ یہ وہ بکھرے ہوئے منتشر موتی نہیں ہیں، اس کے برعکس اگر وہ شخص نہایت قیمتی موتی جمع کر کے انہیں بری طرح مرتب کرے تو اس بے ترتیبی کی بنا پر ان کا حسن ماند پڑ جائے گا، ترکیبی فساد کے ساتھ اعلیٰ وبلند پایہ الفاظ کا بھی یہی حال ہوتا ہے، یہ عمدہ بحث واقعی قابل توجہ ولائق التفات ہے۔“

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ”مفاتيح الغيب“ (۲ / ۵۶۴) میں سورۂ بقرہ کی تفسیر کے آخر

میں رقم طراز ہیں:

''ومن تأمل في لطائف هذا النظم وفي بدائع ترتيبها علم أن القرآن، كما أنه معجز بحسب فصاحة ألفاظه وشرف معانيه، فهو أيضًا معجز بحسب ترتيبه ونظم آياته، ولعل الذين قالوا: إنه معجز بحسب أسلوبه، أرادوا به ذلك.''

ترجمہ: ''جو شخص نظمِ قرآنی کے لطائف اوراس کی ترکیب کے عجائبات میں غور وفکر کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ قرآن کریم جس طرح اپنے الفاظ کی فصاحت اور معانی ومطالب کی شرافت کی بنا پر معجز ہے، اسی طرح اپنی ترتیب وتالیف اور آیات کے نظم کے اعتبار سے بھی معجز ہے، جن اہل علم نے یوں کہا ہے کہ ''قرآن کریم اپنے اسلوب کے اعتبار سے معجز ہے'' تو شاید ان کی مراد بھی یہی ہے۔''

امیر یمنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الطراز'' (جلد سوم، فن ثالث) کے تحت الفاظِ قرآن کی خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ چار وجوہ کی بنا پر قرآن کریم کو فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ وبلند تر مقام حاصل ہے، چنانچہ موصوف (۳/ ۲۱۹) رقم طراز ہیں:

''الفاظ قرآنی کے ساتھ جو امتیازات وابستہ ہیں، کبھی تو ان کا تعلق مفرداتِ حروف کے ساتھ ہوتا ہے، کبھی ان حروف کی تالیف وترتیب کے ساتھ، کبھی الفاظ مفردہ کے ساتھ اور کبھی ان الفاظ پر مشتمل مرکبات کے ساتھ۔ کسی لفظ کے فصیح ہونے کے لیے انہی چار وجوہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہوا کرتا ہے اور قرآن کریم میں یہ چاروں کامل طور پر موجود ہیں۔''

پھر امیر یمنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان چاروں وجوہ کی تفصیل بیان کی ہے اور قرآن کریم سے ایک ایسی مثال بیان کی ہے جو ان سب وجوہ پر مشتمل ہے، ملاحظہ فرمائیے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

’’وَقِيْلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِيْ مَاءَكِ‘‘ ...الآية.(هود:٤٤)

پھر نہایت تفصیل سے اس آیت کے اچھوتے اور خوب صورت پہلوؤں: افراد وترکیب، وضع وترتیب اور لفظ ومعنی کے لحاظ سے علوم بیان ومعانی وبدیع کی جہتوں سے ظاہری وباطنی محاسن کو بیان کیا ہے۔ (۳/۲۲۶-۲۵۰) یہ اتنی عمدہ بحث ہے کہ ہر باب سے پھوٹتی خوش بو، ذہین وذکی انسان پر چھا جاتی اور اہل دانش کو طرب انگیز کرتی ہے، مزید براں موصوف کا اسلوبِ تحریر، دریائے حسن میں رواں دواں اور رگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے اور قاری کو ذوق ووجدان، معرفت ویقین، نور وبرہان اور سکینت وطمانیت ہر پہلو سے اعجازِ قرآن کی راہوں سے شناسا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اور تمام مستفیدین کی جانب سے وہ بہترین بدلہ عنایت فرمائیں، جو اپنے نیکوکار بندوں کو مرحمت فرمایا کرتے ہیں۔

طوالت کا اندیشہ اور ایجاز واختصار اور محض اشارات پر اکتفا۔ جو سرِ دست ہمارے پیش نظر ہے۔ کے ترک کا خوف ان مباحث کے تذکرے سے قلم کی لگام کھینچنے پر مجبور کررہے ہیں۔

اصحابِ بصیرت قارئین کرام! ہمارے شیخ (مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) نے منفرد نظم وبیان، مضبوط ومحکم ترتیب وترکیب، کے پہلو سے نظم قرآنی کے اعجاز کی جانب جو راہنمائی فرمائی ہے، میرا خیال ہے کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کردہ اقتباسات کی روشنی میں آپ کو اس بحث سے اجمالی شناسائی حاصل ہوئی ہوگی اور حضرت شیخ کے رشحاتِ قلم سے شفایابی کا سامان پایا ہوگا اور امید ہے کہ مفرداتِ قرآنی کی فصاحت کی دونوں جہتیں آپ کے علم میں آگئی ہوں گی، یعنی حروف کی باہمی مناسبت وربط، سننے میں خفیف ہونے اور بولنے میں سلیس ہونے کی جہت سے بھی اور مطلوبہ معانی ومقاصد کی ادائیگی کی جہت سے بھی، جن کے کلی حقائق سے صرف علیم وخبیر ہی باخبر ہے۔ اسی طرح مرکباتِ قرآنیہ کی فصاحت بھی آپ جان چکے ہوں گے کہ الفاظ کے باہمی ملاپ کی جہت سے اور ہر

کلمے کو اس کے مناسب مقام پر لانے کے اعتبار سے گویا ہر لفظ اگلے لفظ کے پچھلے دھڑ کو تھامے ہوئے ہے (یہ مرکبات کس سلیقے سے ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں!)، نیز ان کے معانی کے پہلو سے بھی جن کے لیے شان دار ترتیب ڈھالی گئی اور ان سے دقیق اغراض وابستہ کی گئیں۔ گزشتہ صفحات میں ذکر کردہ مباحث ایک صاحبِ بصیرت کے لیے کافی وشافی ہیں اور ان کے ذیل میں درج پند ونصیحت اس شخص کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی، جو قلب سلیم کا حامل ہو یا حاضر دماغی کے ساتھ بغور سنتا ہو۔

مقاصدِ قرآن کے اعتبار سے اعجازِ قرآنی

مقاصدِ قرآنی کے اعتبار سے قرآنی اعجاز کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”مقاصد سے میری مراد وہ امور ہیں جن کا سیکھنا، ان کے رنگ میں رنگ جانا اور ان کے مطابق خلق خدا کے ساتھ معاملہ کرنا قرآن کے مخاطبین کے لیے ضروری ہے، جیسا کہ علمائے امت نے اسمائے حسنیٰ کی تشریح میں بحث کی ہے۔“

اردو میں شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

”مقاصد سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے، جیسے علمائے کرام نے اسمائے حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے۔“

چونکہ شیخ کے کلمات مختصر تھے، اس لیے مجھے ان کے بارے میں کما حقہ شرح صدر نہ ہوا، چنانچہ میں نے اس حوالے سے حضرت شیخ محقق علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا اور ان کے سامنے یہ نقطۂ نظر پیش کیا تو انہوں نے مجھے یہ عبارت بھی سمجھائی اور حضرت عارف باللہ فقیر اللہ بن عبدالرحمن تراسی جلال آبادی علوی حنفی افغانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”قطب الإرشاد“ کے مطالعہ کی رہنمائی فرمائی، چنانچہ تمام تگ ودو اور مطالعہ وتحقیق سے استفادہ کے بعد اس بحث کا منتخب اور واضح خلاصہ ذکر کیے دیتا ہوں، ملاحظہ فرمائیے:

باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے تین پہلو

اسمائے حسنیٰ کے متعلق درج ذیل تین امور قابلِ غور ہیں:

① مرتبۂ علم ② مرتبۂ اعتقاد ③ مرتبۂ عمل

علمائے امت کے نزدیک ان اسماء کے ''تحقق'' کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ان اسماء کے معانی کے ساتھ متصف ہونے کا ویسا ہی اعتقاد رکھے جیسے باری تعالیٰ ان سے متصف ہیں اور ان کی ایسی معرفت وشناسائی حاصل کرے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کے مناسب ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق میں سے کسی کی طرح اور اللہ کی کسی صفت کو مخلوق کی صفات کی مانند نہ سمجھے، چنانچہ پختہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صفت ''بصر'' ثابت ہے، لیکن مخلوق کی آنکھوں کی مانند ہرگز نہیں اور اس کے لیے صفتِ ''سمع'' ثابت ہے، لیکن مخلوق کی ''قوتِ سمع'' کی طرح نہیں۔ یہی عقیدہ باقی صفات کے متعلق ہو اور ان صفاتِ ردیئہ سے باری تعالیٰ کی پاکی وبرتری بیان کرتا رہے، جو اس کی کبریائی وبزرگی کے لائق نہیں، اس کا مثل کوئی نہیں اور وہ سمیع وبصیر ہے، انسانی قدرت واستطاعت کی انتہا تک۔

اسی طرح اہل علم ان اسمائے حسنیٰ کے ساتھ ''تعلق'' سے یہ مراد لیتے ہیں کہ جب حق سبحانہ وتقدس، کبریائی کی ان اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف اور ان اسمائے حسنیٰ کے ساتھ موسوم ہیں تو ان صفات میں سے بندہ کا کیا حصہ ہے؟ اور اپنے خالق کے ساتھ اس کا تعلق کیسا ہونا چاہیے؟ چنانچہ اس حوالے سے علماء کا بیان ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمال وجلال میں ایسا مستغرق ہو کہ ہردم اس کے دل کو ان صفات کا استحضار رہو اور ان صفات کے آثار وانوار کا ان کے تقاضوں کے مطابق مطیع ہو اور قلبی اعتبار سے ان کے مقتضیات کا یقین رکھے، یہاں تک کہ اس میں ان صفات کے انوار وتجلیات کے آثار نقش ہو جائیں۔

جہاں تک ان صفات کے ساتھ ''تخلق'' کا معاملہ ہے تو علماء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے

کہ بندہ ان صفاتِ ربانیہ کے رنگ میں رنگ جائے، عملاً ان کے لیے سرِ تسلیم خم کرے اور باری تعالیٰ کی صفات میں سے ہر صفت کا مظہر بن جائے، چنانچہ خلقِ خدا کے ساتھ اس کا معاملہ ایسا ہو کہ اس میں باری تعالیٰ کی نیابت وخلافت کے آثار جھلکنے لگیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو روئے زمین میں اپنا خلیفہ اور اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے، جیسے ایک حدیث شریف میں وارد ہے:

"إن الله خلق آدم على صورته، فجعله سميعا بصيرا، وهداه إلى الخير والشر والحق والباطل."

یعنی "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے، چنانچہ ان کو سمیع وبصیر بنایا اور خیر وشر اور حق وباطل کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔"

(بخاری، مسلم ومسند احمد)

چنانچہ بندہ سے یہ مطلوب ہے کہ باری تعالیٰ کے اوامر کے مطابق عمل کرے، بلند تر کمالات، قابلِ تعریف صفات، عمدہ افعال وکردار اور قیمتی اعمال کا حامل ہو، اور اسی کے مطابق تمام مخلوق کے ساتھ کسی دنیوی منفعت اور غرض کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی وخوشنودی کی خاطر اور اپنے فرض اور منصب کے تقاضے کی ادائیگی کی نیت سے یہی معاملہ رکھے، باری تعالیٰ کے اسماء کے ساتھ "تخلق" اور ان کی صفات میں رنگ جانے کا یہی مقصود اور یہی مراد ہے، ذیل میں ہم ایک مثال ذکر کر رہے ہیں، جس سے یہ تینوں مراتب واضح ہو جائیں گے:

لفظ "الرحمٰن" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک مبارک اسم ہے، اس کے متعلق مرتبہ "تحقق" تو اس پہلو کی معرفت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے عظیم رحمت کی صفت ثابت ہے، جو اس کی صفتِ ازلی وابدی اور اس کے بقا کے ساتھ باقی ہے اور باری تعالیٰ اس صفت کے ساتھ حقیقتاً متصف ہیں، اگرچہ اس کی مکمل حقیقت وماہیت کا ادراک ومعرفت نہ ہو سکے، نیز یہ اعتقاد بھی ہو کہ مخلوق میں جو صفاتِ رحمت پائی جاتی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کے آثار وانوار کا پرتو اسی چشمے

کا فیضان اور اسی نہر سے پھوٹے پانی کی بوند ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے کہ اس کی کوئی مخلوق اور کوئی بندہ اس صفت میں اس کا شریک وہم پلہ ہو: ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ'' (اس کا مثل کوئی نہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے)۔

صفتِ رحمت میں مرتبہ ''تعلق'' یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعضا و جوارح اور ظاہر و باطن سے، قیام و قعود اور سونے جاگنے میں عاجزی اختیار کرے اور اس کا ایسا شکر ادا کرے جو اس لامحدود رحمت کے لائق ہو، جسے اعضا و جوارح اور قلب و زبان سے شمار نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی جان لے کہ اس ذات کے ہم پر انعامات و احسانات ہیں، لہٰذا ہم پر اس کی اطاعت واجب ہے۔

صفت رحمت کے متعلق مرتبہ ''تخلق'' یہ ہے کہ انسان، بندگان خدا پر مہربان ہو، مصائب میں ان کی غم گساری کرے، شدائد و تکالیف میں ان کی اعانت کرے، اپنے مال سے ان پر خرچ کرے اور اس کو اپنے واجبات میں سے اور اپنے فرائض منصبی کا تقاضہ سمجھے اور مقصود صرف اپنے خالق و مالک کی رضا جوئی ہو، اس کے علاوہ حق تعالیٰ کی صفت رحمت کے دیگر متعلقات کو بھی اختیار کرے۔

بہر کیف یہاں اسی اجمالی بیان پر اکتفا کرتے ہیں؛ اس لیے کہ اس مقام پر تمام تر تفصیل اور فیصلہ کن کلام نہیں کیا جا سکتا۔

راقم عرض گزار ہے: ان تین مراتب میں سے ہر مرتبہ، سابقہ مرتبہ پر متفرع ہے، چنانچہ تخلق، تعلق کی فرع اور تعلق، تحقق کی فرع ہے۔ تحقق، مرتبۂ اعتقاد و یقین ہے، تعلق، مرتبۂ صفاتِ نفسانیہ ہے اور تخلق، مرتبۂ صفات فعلیہ ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور یقین کے مراتب کے اعتبار سے ان تین مراتب کی قوت و ضعف میں بھی تفاوت ہے، مرتبۂ اولیٰ میں کامل شخص، مرتبۂ ثانیہ میں بھی کامل ہوگا اور مرتبۂ ثانیہ میں کامل، مرتبۂ ثالثہ میں بھی کامل ہوگا، نیز بندوں کے طبعی وفطری اخلاق و ملکات کے اعتبار سے بھی تفاوت پایا جائے گا، چنانچہ بعض بندگان خدا، صفاتِ جلالیہ کے رنگ میں ڈھل جانے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور بعض صفات جمالیہ کے زیادہ قریب ہوتے

ہیں، کامل وہ ہے جو ان دونوں قسم کی صفات میں کمال رکھتا ہو۔ اس بحث کے متعلق یہاں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔

میری رائے کے مطابق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان اسمائے حسنیٰ سے پند و نصیحت حاصل کریں، انہیں مضبوطی سے تھامیں اور ان کے تقاضوں پر عمل کریں، یہ اعتقاد رکھیں کہ انہی کے ذریعے انسان کو کمال حاصل ہو سکتا ہے، یہ یقین رکھیں کہ اس کی نجات اور کامیابی و کامرانی کا دارومدار ان اسمائے حسنیٰ کا علم حاصل کرنے اور ان کے مضبوط کڑے ۔جو کبھی ٹوٹ نہ سکے گا۔ کو تھامنے میں ہے، یہ بھی جان لیں کہ انہی میں دائمی سعادت اور رضائے خداوندی پوشیدہ ہے، یوں اس کے فطری خصائل ان کے تابع اور ان کے رنگ میں رنگ جائیں گے اور وہ قرآنی احکام و اوامر کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے اس مردے کی مانند ہو جائے گا جو غسل دینے والے کے تابع ہوتا ہے، اس کی جانب سے بکھری ہوئی عبرتوں، ترغیب و ترہیب اور قصص و امثال سے پند و نصیحت حاصل کرتے ہوئے، قرآن کے حقائق و مصالح اور دنیوی و اخروی منافع کے حامل اعمال اور ابتدا و انتہا میں غور و تدبر کرتے ہوئے، قرآن کے ظاہر و باطن کے متعلق بصیرت حاصل کرتے ہوئے، قرآنی تنبیہات و تعلیمات کو بیدار مغزی سے قبول کرتے ہوئے اور اس کے اشارات و تلمیحات سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے احکامِ قرآنی پر عمل کرے گا۔

مزید براں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”قرآنی مقاصد تو وہی ہونے چاہئیں جن میں مبدأ و معاد کا تذکرہ انسانوں کے معاش کی اصلاح اور دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی ہو۔“

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

”قرآن حکیم کے مقاصد وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدأ و معاش و معاد اور فلاح و نجاحِ دنیا و آخرت وابستہ ہو۔“

مقصد یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے مقاصد، بندگانِ خدا کو مبدأ و معاد کے احوال کے متعلق متنبہ کرنا ہے، یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ باری تعالیٰ معبودِ برحق، بنانے والا، قدرت والا اور با اختیار ہے، آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کا خالق ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، اسی نے مخلوق کو پیدا کیا، جبکہ اس سے قبل کچھ نہ تھا، اسی نے انسان کو پیدا کر کے برابر خلقت سے نوازا اور اس کی بہترین صورت بنائی اور اپنی تمام مخلوقات پر اس کو فضیلت و کرامت بخشی، اس کو ایسا نور عطا کیا جس کے ذریعے وہ امور کی شناسائی حاصل کر سکتا ہے اور کائنات میں بکھری نشانیاں دیکھ سکتا ہے، اس کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل کیں اور اس کو اس دین و شریعت کی پیروی کا حکم دیا جو اس کے معاش و معاد اور دنیا و آخرت میں نجات کا ضامن ہے اور انسان کو یہ باور کرایا کہ یہ دنیا دھوکے کا سامان ہے، انسان اس کے حسن و جمال اور دلفریبی و آب و تاب، زمینی و آسمانی مناظر، ملاحت و شگفتگی اور مٹھاس و شیرینی سے دھوکہ نہ کھائے؛ اس لیے کہ بالآخر اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے اور وہی ٹھکانہ ہے، اس کے سامنے حساب و کتاب کا مرحلہ طے کرنا ہے اور اس کی جانب لوٹنا ہے، تب یہ دنیا ہلاک و فنا ہو جائے گی اور تمام امور و معاملات اللہ کے ہاں پہنچ جائیں گے، قرآن کریم نے اس دنیا کے مختلف مراتب و احوال اور حالات و اطوار بیان کیے ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

’’اعْلَمُوٓا أَنَّمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَٰلِ وَالْأَوْلَٰدِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُۥ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَىٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَٰمًا ۖ وَفِي الْأٓخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَٰنٌ ۚ وَمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَٰعُ الْغُرُورِ‘‘ (الحدید:۲۰)

ترجمہ: ’’تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں ایک

دوسرے سے زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ ہے کہ اُس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہوجاتی ہے، سو اُس کو تو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چُورا چُورا ہوجاتی ہے اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اُس) میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگی محض دھوکے کا اسباب ہے۔"

ان مقاصد کی رو سے اعجازِ قرآنی کا پہلو نمایاں اور خوش نما ہے اور واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی زبردست کتاب اور حکیمانہ نصائح سے بھرپور ہے، جو ان مذکورہ امور کو اچھوتے اور دل کش اسلوب میں نہایت فصیح اور واضح انداز میں جو لوگوں کے لیے نرمی کا پہلو رکھتا اور نفع بخش ہے، بیان کرتا ہے، کوئی شریعت اس کے مساوی نہیں اور کوئی کتاب اس کے ہمسر نہیں اور قرآن ایسے منفرد انداز میں جس تک پہنچنے سے حکماء اور دانشوروں کی عقلیں قاصر ہیں، پچھلی شرائع الٰہیہ کے خلاصے اور ادیان سماویہ کے جوہر پر مشتمل ہے، قرآن کریم نے ان تمام ادیان و شرائع کا مغز اخذ کیا، ان کے نصاب کو مکمل کیا، ان کی یکتا موتیوں کی مانند اور روشن تعلیمات کو منتخب کیا اور ان کے نچوڑ اور مکھن کو اپنے اندر سمولیا، اب انہی قرآنی تعلیمات پر ابدی سعادت اور دائمی نجات کا دارومدار ہے، انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوسکتی ہے اور جنت کی نعمتوں کے حصول میں کامیابی مل سکتی ہے، نیز قرآن نے ایسے معاشرتی آداب اور نفیس احکام چنے، جو نظامِ فطرت اور قوانین عالم کے عین موافق ہیں، انسانی عقلیں ان سے زیادہ محکم و بلند پایہ آداب واحکام کا تصور بھی نہیں کرسکتیں، واقعی آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ ہی کی اعلیٰ مثال ہے اور وہ زبردست، حکمت والا ہے، کیا دنیا میں ایسی کوئی کتاب ہے جس کو سعادت ونجات کا مدار ٹھہرایا جاسکے؟! کیا قرآن کریم کے پیش کردہ نظام کے علاوہ انسانیت کے پاس ایسا منفرد محکم اور صحیح نظام ہے، جو انسانی فطرت کے موافق ہو؟! کیا انسانوں کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی صحیفہ و کتاب ہے، جو حق اور

صراطِ مستقیم کی جانب درست رہنمائی کرتی ہو؟! کیا دنیا میں ایسی حکیمانہ نصیحت اور نور مبین ہے، جو انسانیت کے واسطے بیک وقت دنیوی کامیابی، بلند مرتبوں تک رسائی اور آخرت میں ابدی جنتوں کی نعمتوں کے حصول میں کامرانی کی راہوں کو بیان کرتی ہو؟! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَإِنَّهُۥ لَكِتَـٰبٌ عَزِيزٌ ۝ لَّا يَأْتِيهِ ٱلْبَـٰطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِۦ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔'' (حم سجدہ:۴۱، ۴۲)

ترجمہ: ''اور یہ قرآن بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اُس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اُس کے پیچھے کی طرف سے، یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

حقائق کے اعتبار سے اعجازِ قرآنی

حقائق کے پہلو سے اعجاز قرآنی کے متعلق حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حقائق سے میری مراد وہ دقیق ومخفی امور ہیں، جن کے ادراک سے عقل وفہم قاصر ہیں، فکر وخیال ان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، انسانی عقلیں ان کے متعلق اختلاف اور پراگندہ خیالی کا شکار رہی ہیں، اس حوالے سے ان کا باہمی اختلاف اور بحث ومباحثہ کبھی ختم نہیں ہوا اور نہ ہی (فکری میدان میں) ان کے تیر وتفنگ ہدف تک پہنچ پائے ہیں، جیسے: خلقِ افعال کے متعلق عقلاء حیران اور اس کے سطحی ادراک میں بھی حکماء سرگرداں ہیں، ان کی تحقیق وتفتیش سے مسئلے کی اتنی حقیقت واضح نہیں ہو پائی کہ بندہ کا اپنے فعل کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ اور کس کیفیت کے ساتھ ہے؟ پھر ''فعلِ حادث'' کا ''قدرتِ ازلیہ قدیم'' کے ساتھ کیسا ربط ہے؟ قرآن ان مشکل اور پیچیدہ امور کے متعلق ایسی تعبیر اختیار کرتا ہے کہ انسانی قدرت ان امور کے حقائق کی وضاحت اور ان کے مقصود کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ کامل ومکمل تعبیر کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

الحمدللہ وجوہ اعجاز قرآنی کے چاروں پہلوؤں (مفرداتِ قرآنی، مرکبات قرآنی، مقاصد اور حقائق) کے متعلق حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی شرح وتفصیل سے راقم فارغ ہوا اور ان کے مجمل کلام کی بھی بقدر ضرورت تفصیل میں نے بیان کردی ہے۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ اس بحث کا پورا حق اسی وقت ادا ہوگا کہ اس موضوع پر ضخیم جلد میں ایک مستقل کتاب تالیف کی جائے، جس میں ہر پہلو سے اعجاز کی نقاب کشائی ہو، نظائر کا باہمی تقابل ہو، پھر بہت سی مثالیں پیش کی جائیں؛ تاکہ یہ بحث شیشے کے برتن کے شگاف اور صبح صادق کی پو پھٹنے سے زیادہ واضح اور نمایاں ہو جائے۔ بہر کیف میں نے اپنی دانست کے مطابق اہم مباحث پر اکتفا کیا ہے اور عربی محاورہ ہے: "ما لا یدرك كله لا یترك كله" یعنی "جس چیز کو مکمل حاصل نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کو کلی طور پر ترک کرنا بھی دانش مندی نہیں۔"

راقم کے خیال میں یہاں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کو بلفظہٖ درج کردینے میں کوئی حرج نہیں، جو انھوں نے ایک تحریر کی زینت بنائی ہے، یہ عبارت گویا پختہ الفاظ میں ایک متن متین ہے، اگرچہ میں نے شیخ کے مقصود کی مذکورہ شرح وتفصیل کے ضمن میں حسب ضرورت اس کا کچھ حصہ نقل کیا ہے، (لیکن ذیل میں پوری عبارت درج کی جارہی ہے؛) تاکہ بلاغتِ ایجاز اور جامعیتِ اختصار کے میدان میں شیخ کے ید طولیٰ اور وسیع مہارت کا اندازہ ہو کہ وہ کیسے نرالے انداز میں بھرپور مواد کو مختصر کلمات وتعبیرات میں سمیٹ لیتے تھے اور اصحابِ فہم وبصیرت کے سامنے واضح ہوگا کہ بسا اوقات ان کے کلام کا ایک جملہ اپنی تشریح وتوضیح کے لیے مستقل رسالے کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ عبارت پیش کرنے کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ تحقیق کے کمال تک رسائی کے حامل ائمہ اور دیگر علمائے امت کے درمیان امتیاز نمایاں ہو، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے گویا (اس تحریر میں) بعد کے مفسرین کو چار اصول تھما دیئے ہیں (جن کی روشنی میں وہ اعجاز قرآنی کے پرت کھول سکتے ہیں)، بلاشبہ قرآن کریم کے مفسر کے لیے ضروری ہے کہ ان امور اربعہ کی بحث وتحقیق میں مشقتیں جھیلے اور تفسیر قرآنی میں

انہیں پیش نگاہ رکھے۔ اب حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''قرآن مجید وحکیم کا اعجاز، مفردات اور ترکیب وترتیب کلمات اور مقاصد وحقائق کی جملہ وجوہ سے ہے:

''مفردات'' میں قرآن مجید وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے جس سے ''أوفی بالحقیقة وأوفی بالمقام''، ثقلین نہیں لا سکتے، مثلاً: جاہلیت کے اعتقاد میں ''موت'' پر ''توفي'' کا اطلاق درست نہ تھا؛ کیونکہ ان کے اعتقاد میں نہ بقائے جسد تھی نہ بقائے روح، ''توفي'' وصول کرنے کو کہتے ہیں، ان کے عقیدے میں ''موت''، ''توفي'' نہیں ہوسکتی، قرآن مجید نے ''موت'' پر ''توفي'' کا اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصولیابی ہوتی ہے نہ فنائے محض، اس حقیقت کو کلمہ سے کشف کردیا اور کہیں اس لفظ کا اطلاق اپنے اصلی معنی سے ''جسد مع الروح'' کے وصول کرنے پر کیا۔

''ترکیب وترتیب'' جیسے: ''وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ''، ظاہر قیاس یہ تھا کہ عبارت یوں ہوتی: ''وجعلوا الجن شرکاء للّٰہ''، لیکن مراد یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے شریک ٹھہرائے، کوئی معمولی جرم نہیں کیا اور وہ شریک بھی کون؟ (جن)، پس یہ مراد اسی ترتیب اور نشستِ الفاظ سے حاصل ہوسکتی ہے۔

''مقاصد'' سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے، جیسے علمائے کرام نے اسمائے حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے، مقاصد قرآن حکیم کے وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدأ ومعاش ومعاد اور فلاح ونجاح دنیا وآخرت وابستہ ہو۔

''حقائق'' سے میری مراد وہ امورِ غامضہ ہیں، جن سے عقول وافکار قاصر رہے اور تجاذبِ جوانب اور نزاعِ عقلاء باقی رہا، جیسے: مسئلہ خلقِ افعالِ عباد کہ عبد کا ربط اپنے فعل سے کیا ہے؟ اور کیسے ہے؟ اور اس فعل کا ربط قدرتِ ازلیہ سے کیا ہے؟

قرآن مجید ایسے مقام میں وہ تعبیر اختیار فرمائے گا کہ جس سے ''أوفى بالحقيقة''
طوقِ بشر سے خارج ہو۔'' حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مکمل ہوا۔

اصحابِ فہم وبصیرت اور وجوہ اعجاز کے متعلق بحث وتحقیق کرنے والوں کو چاہیے کہ اعجازِ قرآنی کی وجوہ کے متعلق قدماء ومتاخرین کی آرا اور ہمارے شیخ امام العصر مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کے درمیان خوب گہرائی سے غور وفکر فرمائیں تو یقیناً واضح فرق محسوس کریں گے، اگر آپ منصف مزاج ہیں، فیصلہ کرنے میں بصیرت افروزی کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس راہ کی بلندیوں اور گہرائیوں کو جانچ چکے ہیں تو رات اور دن کا فرق پائیں گے؛ کیونکہ دونوں آرا میں بہت تفاوت ہے اور بقول کسے: ''ما يوم حليمة بسر'' یعنی ''حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا وہ دن کوئی راز تو نہیں ہے۔''

راقم عرض کرتا ہے: میں نے اس موضوع کے متعلق مستقل کتب ورسائل میں درج علمائے امت - اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں ان کی برکات وعلوم سے مستفید فرمائے - کا کلام دیکھا اور خوب باریک بینی کے ساتھ نگاہ ڈالی ہے، مثلاً: شیخِ سنت امام ابوبکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''إعجاز القرآن''، امام ابوالحسن کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''إعجاز القرآن'' اور فاضل ادیب مصطفی صادق رافعی مصری کی ''إعجاز القرآن'' وغیرہ اور اس کے علاوہ علماء نے اپنی دیگر موضوعات سے متعلق کتب کے ضمن میں اس بحث کے حوالے سے جو کچھ ذکر کیا ہے، جیسے: امام قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الشفاء'' میں، امیر یمنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الطراز'' میں اور شیخ عبدالقاہر جرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''دلائل الإعجاز'' میں جو مضامین درج کیے ہیں، نیز علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الإتقان'' میں قدماء ومتاخرین اکابرامت کے اقوال کا جو انتخاب کیا ہے، وہ بھی میری نگاہ سے گزرا ہے، لیکن حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات جیسا جامع اور منفرد کلام مجھے کہیں نہیں ملا، اس میدان میں ہمارے شیخ سب سے فائق اور نمایاں دکھائی دیتے ہیں، نہایت عمدگی سے قیمتی افادات پیش کر گئے

ہیں، کیا کہنے ان کے !اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں ان کو مزید بلندیِ منزلت عطا فرمائے، شیخ کے ان قیمتی جواہر ریزوں کی چمک دمک دیکھیے اور عش عش کیجیے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ انواعِ اعجاز کے ضمن میں اعجازِ قرآنی کی وہ جزئیات بھی درج ہوگئی ہیں، جو علمائے امت نے ذکر کی ہیں، البتہ تمام جزئیاتِ اعجاز کا احاطہ تو نہیں کیا جاسکتا، بلکہ تمام جزئیات سے تو وہی علیم وخبیر ذات واقف ہے، جس نے اپنے علم سے قرآن کریم کو نازل فرمایا ہے اور وہی تمام مغیبات کو مکمل طور پر جانتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وَعَلٰی تَفَنُّنِ وَاصِفِیْهِ بِوَصْفِهِ یَفْنَی الزَّمَانُ وَفِیْهِ مَا لَمْ یُوْصَفْ

ترجمہ: ”اگرچہ محبوب کے اوصاف بیان کرنے والوں کے اسالیبِ بیان گوناگوں ہیں، لیکن زمانہ ختم ہوجائے تب بھی اس کے بہت سے اوصاف بیان نہ کیے جاسکیں گے۔“

البتہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ”الإتقان“ اور شیخ جزائری رحمۃ اللہ علیہ کی ”توجیه النظر“ میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت نظر سے گزری ہے، اس حوالے سے علمائے امت کے کلام میں اس عبارت سے مختصر اور جامع کلام نہیں دیکھا، اہلِ علم کے کلام میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے قریب تر رائے یہی ہے، اگرچہ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں بھی بعض ایسے پہلو ہیں، جن سے ہر کسی کو تنبہ نہیں ہوا، موصوف بھی ان کے واقف کار اور رمز شناس پیش نظر مقالے کے تتمے کے طور پر اس عبارت کو نقل کرنا عظیم فائدے سے خالی نہ ہوگا، اب آپ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ”الإتقان“ کے حوالے سے امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ جامع عبارت (اردو کے قالب میں) ملاحظہ فرمائیے:

”اکثر اہل نظر علماء کی رائے ہے کہ قرآن کریم کی وجہِ اعجاز، بلاغت کے پہلو سے ہے، لیکن اس پہلو کی تفصیل وتوضیح دشوار ہے، انہوں نے ذوق کے حکم کی جانب

میلان ظاہر کیا ہے، تحقیقی بات یہ ہے کہ کلام کی اجناس مختلف ہیں اور اسلوب و بیان کے درجات و مراتب میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے، بعض کلام نہایت فصیح و بلیغ اور پختہ ہوتے ہیں، بعض فصیح، قریب الفہم اور سہل ہوتے ہیں اور بعض فصاحت رکھتے ہیں، لیکن ان میں سلاست اور اطلاق وارسال ہوتا ہے، کلام کی یہ تینوں اقسام بلند درجہ اور قابل تعریف وتوصیف ہیں، ان میں پہلا اعلیٰ، دوسرا درمیانی اور تیسرا ادنیٰ درجے کا کلام ہے۔

قرآنی بلاغت ان اقسام میں ہر قسم سے وافر حصہ لیے ہوئے ہے اور ہر نوع کا ایک شعبہ اخذ کیا ہے، قرآن نے ان اوصاف کی ترتیب و تنظیم کے ذریعے کلام کا ایک منفرد اسلوب پیش کیا ہے، جو بیک وقت فخامت وعظمت اور عذوبت کا حامل ہے، حالانکہ انفرادی طور پر یہ دونوں اوصاف متضاد ہیں؛ اس لیے کہ عذوبت (کلام میں) سہل طرازی کا نتیجہ ہوتی ہے، جبکہ جزالت ومتانت (یعنی فخامت) کلام میں ایک گونا شدت و سختی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان دو متضاد اوصاف کا باہمی بعد کے باوجود ایک ہی نظمِ کلام میں یکجا ہونا بھی قرآن کریم کی ایک خاص فضیلت ہے؛ تاکہ قرآن، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نمایاں معجزہ ہو سکے۔

انسانوں کے لیے اس جیسا کلام پیش کرنا چند وجوہ کی بنا پر دشوار ہے:

انسانی علم عربی زبان کے تمام اسماء اور ان کے احوال ۔جو درحقیقت معانی کے ظروف ہوتے ہیں۔ کا احاطہ نہیں کرسکتا، نیز انسانی فہم ان الفاظ پر محمول اشیاء کے تمام معانی کا ادراک نہیں کرسکتی، اسی طرح کلام کی وہ تمام وجوہ۔ جن سے کلام مرکب ہوتا اور باہم ربط پیدا ہوتا ہے۔ کی کامل معرفت بھی حاصل نہیں کہ انسان ان وجوہ میں سے احسن وافضل کا انتخاب کر کے قرآن کریم کے مثل کلام لا سکے۔

کلام تین اشیاء سے قائم ہوتا ہے:

① حاصل الفاظ ② ان الفاظ کے ساتھ قائم معانی

③ الفاظ ومعانی میں باہمی ربط وتعلق، جو باہم نظم وترتیب پیدا کر سکے۔

آپ قرآن کریم میں غور کریں گے تو قرآن میں یہ تینوں امور انتہائی اعلیٰ پیمانے پر ملیں گے، حتیٰ کہ قرآن کریم کے الفاظ سے بڑھ کر فصیح وبلیغ اور شیریں آپ کو دکھائی نہیں دیں گے، نیز حسن تالیف وترکیب اور باہم مناسبت ویکسانیت کے اعتبار سے نظم قرآنی جیسا کوئی نظم نظر نہیں آئے گا۔

قرآن کے معانی کو دیکھیے تو ہر صاحب عقل ودانش گواہی دے گا کہ قرآن اس باب میں بھی اعلیٰ درجے پر فائق ہے۔

کلام وبیان کے یہ تینوں فضائل، کلام کی مختلف انواع میں متفرق طور پر تو پائے جاتے ہیں، لیکن ایک ہی نوع میں صرف علیم وقدیر ذات کے کلام عالی شان میں یکجا نظر آئیں گے۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوا کہ قرآن معجز اس لیے ہے کہ وہ کلام کو حسن نظم تالیف کے ساتھ فصیح وبلیغ الفاظ میں پیش کرتا ہے، ان الفاظ کے ضمن میں صحیح ترین معانی ومفاہیم بیان کرتا ہے، مثلاً: توحید باری تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ تنزیہ وتقدیس، دعوتِ طاعت، اس کی عبادت کے طریقے کا بیان یعنی حلت وحرمت، ممانعت واباحت کا ذکر، نیز پند ونصیحت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اچھے اخلاق کی رہنمائی، برے اخلاق سے زجر وتنبیہ، قرآن ان تمام امور میں سے ہر ایک کو اس کا مقام دیتا ہے کہ اس سے بہتر انداز دکھائی نہیں دے گا اور نہ ہی عقل انسانی اس سے زیادہ بہتر اسلوب کا تصور کر سکتی ہے۔ نیز قرآن کریم گزرے زمانوں کے واقعات اور ان پر نازل شدہ قہر وعذاب خداوندی بھی بیان کرتا ہے اور مستقبل کے واقعات کے متعلق پیش گوئیاں ذکر کرتا ہے اور ان تمام امور دعویٰ وحجت اور دلیل ومدلول کو جمع کرتا

ہے؛ تاکہ قرآنی دعوت کے لزوم، اس کے اوامر کے وجوب اور نواہی کی ممانعت کی مزید تاکید وتائید ہو اور یہ بات یقینی ہے کہ ان تمام امور کی تالیف اور متفرق ومنتشر امور کو (مربوط) نظم ونسق کے ساتھ جمع کرنا ایسا مشکل وپیچیدہ کام ہے کہ انسانی قویٰ ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں، بلکہ ان کی محدود قدرت اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی، چنانچہ خلق خدا اس کے مقابلے سے قاصر اور اسی صورت معارضہ ومناقضہ سے عاجز ودر ماندہ رہی۔‘‘

کچھ آگے علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’اعجازِ قرآنی کی جو وجہ میں نے بیان کی ہے، عام لوگ اس طرف مائل نہیں ہوئے، یہ وجہ دلوں کو بھاتی اور نفوس کو متاثر کرتی ہے۔‘‘

اعجازِ قرآنی کی ایک اور وجہ

ہمارے شیخ امام العصر مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

’’مذکورہ وجوہ کے علاوہ اعجازِ قرآنی کی ایک اور وجہ بھی ہوسکتی ہے، لیکن میں اس کو یقینی طور پر اعجازِ قرآنی کی وجوہ میں شمار نہیں کرتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بیانِ دلائل کے سلسلے میں نظمِ قرآنی کا ایک اسلوب یہ ہے کہ قرآن کسی امر کے لیے ایسے کلام سے استدلال کرتا ہے، جس کا ظاہری اسلوب خطابی ہوتا ہے (جس میں عام طور پر دلائل ذکر نہیں کیے جاتے)، جبکہ اس کا باطن درحقیقت ایک دلیل لیے ہوئے ہوتا ہے، یعنی اپنے ظاہری الفاظ اور مدلول مطابقی کے ذریعے خطابی والزامی اسلوب میں کسی امر کے اثبات پر دلالت کرتا ہے، جبکہ عبارت کا اشارہ ومفہوم اور مدلول التزامی قطعی ومضبوط حجت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے علمائے تفسیر نے باری تعالیٰ کے ارشاد: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (انبیاء:۲۲) (زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو وہ دونوں درہم

برہم ہوجاتے) سے "دلیلِ تمانع" (توحیدِ باری تعالیٰ پر ایک اہم عقلی دلیل) کے متعلق بحث فرمائی ہے۔ اور اسی کی روشنی میں ان لوگوں کو جواب دیا ہے، جنھوں نے علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی تکفیر کی ہے؛ اس لیے کہ انھوں نے "شرح العقائد" میں اس آیت کی ظاہری عبارت ومنطوق سے مستفاد مفہوم بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "(آیت میں مذکور) یہ حجت دلیل الزامی ہے اور لزوم (یعنی تعددِ آلہہ پر لزومِ فساد) عادی ہے"۔ یعنی قطعی نہیں ہے۔ (اس بحث کی تفصیل علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح العقائد" اور اس کی شروح وحواشی مثلاً: مولانا فرہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی "النبراس" وغیرہ میں ملاحظہ فرمائیے)۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر شیخ عبداللطیف کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کی بنا پر ان پر خوب طعن وتشنیع کی ہے، حتیٰ کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے اور ان کی تکفیر کے لیے سند یہ پیش کی ہے کہ شیخ ابو معین نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تبصرۃ الأدلۃ" میں معتزلہ کے سرخیل ابو ہاشم جبائی کی اس بنا پر تکفیر کی ہے کہ موصوف نے اس آیت میں تعددِ الٰہ (کی نفی) اور اثباتِ توحید کے متعلق ردوقدح سے کام لیا تھا، چنانچہ بعد ازاں علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد شیخ علاء الدین محمد بن محمد بن محمد حنفی بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے دفاع میں ایک مستقل رسالہ تالیف فرمایا ہے، جس میں علامہ موصوف کے کلام کی مراد واضح کرکے اطمینان بخش جواب تحریر فرمایا ہے، اس جواب کا خلاصہ شیخ کمال بن ابی شریف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "المسامرۃ" میں درج کیا ہے، جو "فتح القدیر" و "التحریر" جیسی شاہ کار کتابوں کے مؤلف اور نامور حنفی محقق، علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "المسایرۃ" کی شرح ہے، نیز علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی "شرح المسایرۃ" میں اس جواب کا خلاصہ ذکر کیا ہے۔"

ان دونوں حضرات کی تلخیص کا خلاصہ قدرے تصرف اور مفید اضافے کے ساتھ پیش کررہا ہوں:

''قرآن کریم میں ذکر کردہ دلائل، دواؤں کی مانند ہیں، ایک ماہر وحاذق طبیب دواؤں کو طبائع کے مزاجوں کے موافق اور قوت وضعف، حرارت وبرودت جیسی کیفیات کا لحاظ رکھتے ہوئے استعمال کرتا ہے، ان امور کی رعایت نہ کرے تو اصلاحِ بدن کے بجائے فساد اور نفع کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، لہٰذا حاذق طبیب ہر مریض کے مزاج کے موافق علاج ودوا ہی تجویز کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح قرآن عزیز وذکر حکیم بھی صانع مختار کے وجود اور توحید باری تعالیٰ کے اثبات وغیرہ کے سلسلے میں وہی دلائل منتخب کرتا ہے، جو نزول قرآن کے وقت مخاطبین کی عقلوں کے موافق ہوں، چونکہ نزول قرآن کے وقت اکثر مخاطبین منطقی دلائل وبراہین کے فہم سے قاصر اور قطعیت کا فائدہ دینے والے دلائل سے نا آشنا تھے، اس بنا پر ان کے فہم سے بلند تر اسلوبِ کلام ان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا، جیسے گلاب کی مہک، گبریلے (جیسے کیڑے) کے لیے مضر اور آفتاب کی روشنی، چمگادڑ کی آنکھ کے لیے ضرر رساں ہوتی ہے۔ البتہ اصحابِ فہم وذکاوت کے لیے محض الزامی دلائل کافی نہیں ہوا کرتے، قرآن کریم کے ان مخاطبین ایسے ذہین وفطین لوگ بھی موجود تھے، اب قرآن تو عام عرب وعجم اور ہر رنگ ونسل کے لوگوں کے لیے اللہ کا ایک پیغام ہے، اس لیے قرآن میں ایسے قطعی دلائل کی جانب اشارہ وتنبیہ بھی ضروری تھی، جو شفائے قلوب وشرح صدور کا باعث ہوں، چنانچہ قرآن کریم نے اپنے دلائل کے ظاہری دلائل مخاطبین میں سے اکثریت کے نفع کی رعایت کی ہے، لیکن اربابِ دانش وبینش کے اذواق بھی ان سے صرفِ

نظر نہیں کرتے، جبکہ ان ظاہری دلائل کی تہوں میں ایسے قطعی دلائل کی جانب اشارہ کر دیا ہے، جو خواص اور اربابِ عقل وفہم پر حجت تام کر دیں۔"

یہ "المسایرۃ" کے دو شارحین کے ذکر کردہ مباحث کا خلاصہ ہوا، جو انہوں نے حذف واضافے کے ساتھ علامہ علاء الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، موصوف کا کلام طویل ہے، کسی کو تفصیلات جاننے کی خواہش ہو تو (مذکورہ کتب کی) مراجعت کرے؛ کیونکہ یہ تفصیل بھی خوب مفید ہے۔

نامور فقیہ وفلسفی ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہمارے شیخ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ اس "وجہ اعجاز" کی جانب اشارہ کیا ہے اور اپنی کتاب "فصل المقال" میں اس کو اعجاز قرآنی کی مستقل وجوہ میں شمار کیا ہے، نیز امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں کئی آیات کے ذیل میں اس "وجہ اعجاز" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مستقل وجوہِ اعجاز میں شمار کرنے پر اصرار نہیں فرمایا، اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، لیکن میری دانست میں اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

① یا تو ممکن ہے کہ شیخ اس وجہ کو بلاغت قرآنیہ کے ملحقات اور قرآن کریم کے اسالیبِ بیانیہ کے توابع میں شمار کرتے ہوں اور گزشتہ صفحات میں ذکر کر چکا کہ شیخ کا مقصد اعجاز کی انواع واقسام کا بیان ہے، اس کی ضمنی جزئیات پیش نظر نہیں، جبکہ یہ وجہ اعجاز کی مستقل نوع نہیں ہے۔

② دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بعض اکابر علمائے امت نے تنبیہ فرمائی ہے کہ مقاصد کے اثبات اور اغراض کے بیان میں سب سے درست، مضبوط ومحکم اور اعتراضات سے سالم اسلوب قرآن کریم کا اسلوب ہے، یہی اسلوب دلوں کو شفا اور آنکھوں کو جلا بخشتا ہے، جبکہ فلاسفہ کے اختراعی قواعد پر مبنی اکثر دلائل قطعی ویقینی نہیں ہوتے، چنانچہ (اہل جہنم کو پیش کی جانے والی غذا کی مانند) یہ فلسفیانہ دلائل نہ موٹا کرتے ہیں، نہ بھوک مٹانے کے کام آتے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "العقل والنقل" (درء تعارض العقل والنقل: ۹۱/۱)۔ جو اُن کی کتاب "منہاج السنۃ النبویۃ" کے حاشیہ پر چھپی ہے۔ رقم طراز ہیں:

"جو شخص بھی ان نصوصِ قطعیہ کے معارض کلامی وفلسفیانہ مباحث میں غور کرے گا،

جبکہ اس کو نصوص، ان کے لوازم، ان میں پنہاں مباحث اور ان کے منافی آرا و اقوال کی کامل معرفت حاصل نہ ہو تو ایسا شخص اطمینان بخش یقین تک نہیں پہنچ سکتا، یہ فلسفیانہ بحثیں، شک اور حیرت کا سامان ہی فراہم کرتی ہیں، انہی ماہر فلسفی فضلاء کو ہی دیکھیے (علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی مراد امام ابوحامد غزالی، شیخ ابن عربی، ابن سبعین، ابن فارض، صاحب "خلع النعلين" اور تلمسانی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ ہیں) جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے نصوص سے متعارض بعض معقولات (عقلی دلائل) کو نصوص پر مقدم کرنا ضروری ہے، آپ انہیں الٰہیات کے اصولی مسائل میں حیران وسرگرداں پائیں گے۔"

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر طویل بحث فرمائی ہے، چنانچہ اس سے قبل فرمایا:

"امام ابوعبداللہ رازی (مراد امام فخر الدین بن خطیب الری) نے اپنی کتب میں کئی مقامات پر مثلاً "أقسام اللذات" وغیرہ میں یہ اشعار درج کیے ہیں:

نِهَايَةُ أَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالُ ۔۔۔ وَأَكْثَرُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَالُ

وَأَرْوَاحُنَا فِيْ وَحْشَةٍ مِّنْ جُسُوْمِنَا ۔۔۔ وَحَاصِلُ دُنْيَانَا أَذًى وَوَبَالُ

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا ۔۔۔ سِوٰى أَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ: قَالَ وَقَالُوْا

ترجمہ: ① "عقلوں کی پیش رفت کی انتہا آخر کار، رکنا (اور عاجز آ جانا) ہی ہے اور (عقلی میدان میں) لوگوں کی اکثر کوششیں گمراہی پر ہی منتج ہوتی ہیں۔

② ہماری روحیں، ہمارے جسموں سے وحشت زدہ ہیں اور ہماری دنیا کا حاصل تکلیف و وبال ہے۔

③ عمر بھر کی بحث و تحقیق سے لوگوں کی قیل و قال جمع کرنے کے سوا ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔"

امام ابوعبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا:

’’میں نے کلامی مباحث اور فلسفیانہ مناہج میں بہت غور وتدبر کیا، میری نظر میں یہ مباحث نہ کسی مریض کو شفا بخش سکتے ہیں اور نہ کسی پیاسے کو سیرابی کا سامان فراہم کرسکتے ہیں، عقل وفہم سے سب سے قریب تر طرز استدلال، قرآن کا اسلوبِ بیان ہے، چنانچہ ’’اثبات‘‘ کے متعلق میں قرآن کی یہ آیات پڑھتا ہوں:

① ’’اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى.‘‘ (طٰہٰ:۵)

ترجمہ: ’’وہ بڑی رحمت والا، عرش پر قائم ہے۔‘‘

② ’’إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ.‘‘ (فاطر:۱۰)

ترجمہ: ’’اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے اور اچھا کام اس کو پہنچاتا ہے۔‘‘

اور نفی کے بارے میں یہ آیات پڑھتا ہوں:

① ’’لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ.‘‘ (شوریٰ:۱۱)

ترجمہ: ’’کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔‘‘

② ’’وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهِ عِلْمًا.‘‘ (طٰہٰ:۱۱۰)

ترجمہ: ’’اور اس کو ان کا علم احاطہ نہیں کرسکتا۔‘‘

③ ’’هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا.‘‘ (مریم:۶۵)

ترجمہ: ’’بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے؟‘‘

میری طرح جو بھی تجربہ کرے گا تو وہی سمجھے گا جو میں سمجھا ہوں۔‘‘ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا منقولہ کلام پورا ہوا۔



قرآن کریم کے چند تفسیری نکات
امام العصر رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات کی روشنی میں

قرآن کریم محض نظریہ اور معلومات کی کتاب نہیں

حضرت امام العصر مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قرآن عزیز میں جو کچھ بھی ذکر کیا گیا ہے، خواہ کسی حکم کے ضمن میں ہو یا کسی خاص واقعے کا عنوان ہو، بہر حال وہ کسی نہ کسی مرتبے اور کسی نہ کسی صورت میں ضرور قابل عمل بات ہوتی ہے، قرآن میں ذکر کردہ کوئی بھی بات محض نظریاتی و علمی حیثیت نہیں رکھتی کہ جس کا عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔''

یہ ایک دقیق تشریعی نکتہ ہے، اس کی مثال قرآن کریم کی اس آیت سے سمجھیے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ.'' (بقرہ:۱۱۵)

ترجمہ: ''تم لوگ جس طرف منہ کرو، اُدھر (ہی) اللہ تعالیٰ کا رخ ہے۔''

جس طرح اس حکم کا مقصود عام نہیں ہے کہ ہر وقت، ہر جہت کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنا درست ہو، اسی طرح اس آیت سے محض علمی ونظریاتی فائدہ یا قبلے کے متعلق شش و پنج میں مبتلا شخص کے لیے اس کے شانِ نزول کو مخصوص رکھنا بھی مقصود نہیں، بلکہ کسی سواری پر سوار ہونے کی

حالت میں نفلی نماز پڑھنے کے متعلق یہ حکم معمول بہ ہے (یعنی اس حالت میں سوار حسب سہولت کسی بھی جہت کی طرف رخ کر کے نفلی نماز پڑھ سکتا ہے)۔

نیز باری تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ملاحظہ کیجیے:

''وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي۔'' (طٰہٰ:۱۴)

ترجمہ:''اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۔''

چنانچہ نماز محض ذکر کا نام نہیں ہے، بلکہ نماز، شارع کی جانب سے مقرر کردہ خاص ارکان اور متعین آداب پر مشتمل ایک حقیقت ہے،لیکن اس کے باوجود بعض صورتوں میں نماز کا ذکرِ محض ہونا بھی معمول بہ ہے؛ لہٰذا آیت کا مصداق محض عقلی اور غیر معمول بہ نہیں، بلکہ اس مفہوم پر ''صلاۃ الخوف'' میں عمل کیا جاتا ہے،خاص طور پر اگر امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول رائے کی رعایت کی جائے، ان کا فرمانا ہے کہ جب ''صلاۃ الخوف'' بھی دشوار ہوجائے تو صرف تکبیر پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ نیز فقہائے کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حائضہ عورت کو چاہیے کہ نماز کے وقت وضو کر کے بیٹھ جائے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے (یہ دونوں احکام بھی اس آیت کے معمول بہا ہونے کی ہی صورتیں ہیں)۔

مزید براں آیتِ وضو ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ... '' الآیۃ (مائدہ:۶) بھی اس ضمن میں داخل ہوسکتی ہے، جس میں سر اور پاؤں کو یکجا اور ہاتھوں اور چہرے کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ تیمم میں ایک جانب (سر اور پاؤں) ساقط ہوجاتی ہے، اس سے سر کے ساتھ پاؤں کے ذکر کرنے کا فائدہ ظاہر ہوا، حالانکہ (سر اور پاؤں کے وظیفے میں فرق ہے) پاؤں دھوئے جاتے ہیں، جبکہ سر پر مسح کیا جاتا ہے، اسی طرح یہ آیت بعض دیگر صورتوں میں مسح کے حکم کا ماخذ رہے گی، مثلاً: موزے پہننے کی حالت اور بلا حدث نماز کے لیے وضو کی حالت (آیت کے مصداقات میں داخل رہیں گی)۔

یہ قرآن کریم کا ایک معجزانہ اسلوب ہے، مزید تفصیل کے لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "مشکلات القرآن" (ص: ۱۳۵ و ۱۳۶) ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"(قرآن کی) ہر آیت کسی نہ کسی درجے میں ضرور معمول بہ ہوتی ہے، اگرچہ منسوخ ہی کیوں نہ ہو"۔

مثلاً: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ." (بقرہ: ۱۸۴)

ترجمہ: "جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں، ان کے ذمے فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا کھلا دینا یا دے دینا ہے۔"

یہ آیت اگرچہ اپنے ظاہری عموم کے اعتبار سے منسوخ ہے، لیکن حاملہ اور مرضعہ دودھ پلانے والی عورت) کے حق میں معمول بہ ہے۔"

اس کی کچھ تشریح "مشکلات القرآن" (ص: ۴۹) میں ملاحظہ فرمائیے۔

آیاتِ قرآنیہ اور احادیث میں ظاہری تعارض کا ایک حل

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"کبھی قرآن کریم کے ظاہری نظم ونسق سے ایک حکم مستفاد ہوتا ہے اور پھر اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق وارد حدیث اس حکم کے مخالف ہوتی ہے، جس کی بنا پر آیت کی صحیح غرض ومقصود کے متعلق اضطراب وتشویش پیدا ہوجاتی ہے۔"

حضرت فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک اس (تعارض) کی تطبیق یوں ہوسکتی ہے کہ ایسے مقامات پر قرآن کریم کی دو مرادیں ہوتی ہیں: اولین مراد اور ثانوی مراد۔ چنانچہ قرآن عظیم کے نظم

کا مقتضی تو اولین مراد ہوتا ہے، جبکہ اس کے شان نزول میں وارد حدیث کا مقتضی ثانوی مراد شمار ہوتا ہے اور اسی ترتیب کے مطابق آیت کے نظم سے دونوں معنی مراد ہوتے ہیں۔“

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس دقیق نکتے کے ذریعے قرآن کریم کے بیشتر مقامات سے متعلق بہت سے اشکالات حل ہوجاتے ہیں، مثلاً:

ا:......سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ“ (قیامہ:۱۶)

ترجمہ: ”اے پیغمبر! آپ قبل اختتامِ وحی قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے۔“

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وارد مرفوع روایت کو پیش نظر رکھا جائے تو عام ذہنوں کے لیے اس آیت کا ماقبل اور مابعد کے ساتھ ربط سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول وحی کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے؛ تاکہ بھول نہ جائیں۔ (بخاری) اس آیت میں اس سے ممانعت کی گئی ہے، (ملاحظہ فرمایئے کہ آیت کا سیاق وسباق قیامت کی ہولناکیوں کے بیان میں ہے، جبکہ حدیث میں مذکور شان نزول اس موضوع سے خارج ہے، اس بنا پر بظاہر آیت وحدیث میں تعارض واضح ہورہا ہے) یہی وجہ ہے کہ روافض نے قرآن کریم کے ناقص ہونے پر اس آیت کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، حاشا وکلا! قرآن کریم ایسے نقائص سے پاک ہے، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق روافض کا دعویٰ ہے کہ موجودہ قرآن کریم میں تقریباً دس پاروں کے بقدر نقص ہے، حالانکہ قرآن کریم وہ کلام ہے کہ جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے (ایسے عظیم کلام کے متعلق نقص کا دعویٰ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟!)۔

(حضرت رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:) میرے نزدیک مذکورہ آیت سے متعلق اس مشکل عقدے کا حل یہی ہے کہ حدیث پاک میں ذکر کردہ شانِ نزول آیت کی ثانوی مراد ہے، جس کو دوسرے مرتبے میں ملحوظ رکھا جائے گا، جبکہ نظم کلام (اور سیاق وسباق) کا مقتضی آیت کی اولین مراد شمار ہوگا، جس کی روشنی میں نظم مربوط اور کلام مرتب و منظم صورت میں واضح ہوتا ہے، (اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ) یہ آیت اور اس کا (ماقبل و) مابعد احوالِ قیامت اور قیامت کی ہولنا کیوں کے بیان سے متعلق ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کچھ احوالِ قیامت ذکر فرما کر ان کے بعد ارشاد فرمایا: ''لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ''، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے متعلق سوال کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے کہ آپ پوچھنے لگیں: قیامت کب واقع ہوگی؟ جیسے مشرکین اس بارے میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں: ''لِتَعْجَلَ بِهِ'' یعنی آپ بھی قیامت کے وقوع کے متعلق جلدی دکھانے لگیں، جیسے وہ لوگ کرتے ہیں: ''إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ'' یعنی قیامت کے احوال کو جمع کرنا اور آپ کے سامنے بیان کرنا ہمارے ذمے ہے؛ تاکہ آپ انہیں خوب سمجھ لیں اور جان لیں: ''فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ'' پھر جب ہم ان کو آپ کے سامنے پڑھ کر سنا دیں تو آپ ان کی تلاوت کیجیے اور پڑھیے: ''ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ'' پھر جب اس کا مقررہ وقتِ موعود آیا تو اس کا بیان ہمارے ذمے ہے۔

چونکہ قیامت کے وقوع کے بیان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ اطہر میں مختلف خیالات آسکتے تھے اور بتقاضائے بشریت قلق ہوسکتا تھا، اس بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دلانا مقصود تھا، چنانچہ ان اندیشوں کو واقعیت کا درجہ دیتے ہوئے خطاب فرمایا، اپنے خاص بندوں یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ گفتگو میں عادتِ باری تعالیٰ یہی ہے، اسی بنا پر ان آیات کے بعد ارشادِ ربانی ہے:

’’كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ.‘‘

ترجمہ: ’’ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو۔‘‘

اس میں بشری فطرت اور انسانی طبیعت کا بیان ہے کہ انسان فطری طور پر جلد ملنے والے منافع کا خوگر اور دیرپا ثمرات سے غافل و نا آشنا واقع ہوا ہے۔ مذکورہ کلام کی تفصیل بھی بیان کی جاسکتی ہے، جس سے مزید قلبی اطمینان حاصل ہوگا، لیکن صاحب عقل وفہم کے لیے یہی اشارات کافی ہیں، یہ قرآن کریم کے نظم کا اعجاز ہی ہے کہ مختصر عبارت میں بہت سے مقاصد کو سمیٹ لیتا اور ان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیتا ہے، ایسے مقامات پر قرآن کریم کو محض شانِ نزول میں منحصر سمجھنا مناسب نہیں، بلکہ ان کے سیاق وسباق اور غرض ومقصود کی رعایت بھی نہایت ضروری ہے۔

اس قاعدے کی ایک اور مثال میرے نزدیک باری تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

’’فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ.‘‘ (بقرہ:۲۳۰)

ترجمہ: ’’پھر اگر کوئی (تیسری) طلاق دے دے عورت کو تو پھر وہ اس کے لیے حلال نہ رہے گی اس کے بعد۔‘‘

حضرات شوافع رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یہ آیت صدرِ کلام یعنی ’’اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ‘‘ (وہ طلاق دو مرتبہ (کی) ہے) سے مربوط ہے اور یہاں تیسری طلاق کا بیان مقصود ہے، نیز ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان جو کچھ ہے، وہ جملہ معترضہ کے طور پر بیان ہوا ہے، نیز خلع طلاق نہیں، بلکہ فسخِ (نکاح) ہے، اس کی تائید امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ‘‘ (چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ) تیسری طلاق کا بیان ہے، اگر ’’فَإِنْ طَلَّقَهَا‘‘ ما قبل سے متعلق ہو تو یہ چوتھی طلاق شمار ہوگی، اس بنا پر اس جملے کو صدرِ کلام کے ساتھ متعلق قرار دینا ناگزیر ہے۔‘‘

میرے نزدیک اس اشکال کی توجیہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے فرمان: "تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ" سے مراد "ترکِ رجوع" ہے، جو "امساک" (یعنی اپنے پاس روکنے) کے مقابلے میں آتا ہے اور یہ قرآن کریم کی اولین مراد ہے، جبکہ تیسری طلاق بحیثیت ایک فرد کے اس کے تحت داخل ہوگی؛ کیونکہ طلاق کی حقیقت "ترکِ امساک" (اپنے پاس نہ روکنا) ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: "تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ" طلاقِ ثالث سے عام ہوگا، اس کے بعد "فَإِنْ طَلَّقَهَا" میں ازسرِ نو طلاق کا بیان نہیں ہے کہ اس کو چوتھی طلاق شمار کیا جائے، بلکہ یہ "تسریح" کی دو اقسام میں سے ایک قسم کا بیان ہے، لہٰذا حدیث پاک سے مستفاد مفہوم قرآن کریم کی ثانوی مراد شمار ہوگی اور نظمِ قرآنی کے ظاہری مستفاد کو مرادِ اولیٰ کی حیثیت دی جائے گی، قرآن کریم اور حدیث میں تعارض کی صورت میں میرے نزدیک یہی مسلک راجح ہے۔

اسی بنا پر علمائے حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: آیت کے اس ٹکڑے کا تعلق متصل ماقبل سے ہے، آیت کے آغاز سے نہیں ہے؛ کیونکہ ابتدائے آیت سے مربوط کرنے کی صورت میں نظمِ قرآنی بے ربط ومنتشر ہو جائے گا، علمائے اصول نے بھی اس مقام پر عمدہ بحث فرمائی ہے، لیکن میری نظر میں "تلویح" کے ایک محشی (۱) کے علاوہ کسی نے بھی اس کی صراحت نہیں کی کہ قرآن کریم کے نظم کی دو مرادیں ہوسکتی ہیں، "تلویح" کے محشی لکھتے ہیں: لفظِ خمر کا اطلاق اس مشروب پر بھی ہوتا ہے، جو فقہائے حنفیہ کے نزدیک "خمر" ہے اور اس مشروب پر بھی جسے جمہور فقہاء "خمر" شمار کرتے ہیں، حنفیہ کی بیان کردہ تعریف قرآن کریم کی مرادِ اولیٰ ہے، جبکہ جمہور فقہاء کا مذہب مرادِ ثانوی ہے۔"

(۱) یاد پڑتا ہے کہ حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا تھا: یہی سبب ترجیح ہے، حضرت کے بقول "توضیح" کے حاشیہ میں لکھا ہے، مراجعت کرلی جائے؛ کیونکہ میرا حافظہ تردد کا شکار ہے۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام، راقم کی فہم ودانست کے مطابق تشریح وتوضیح کے ساتھ مکمل ہوا۔

راقم عرض کرتا ہے: حضرت شیخ کی مذکورہ رائے ایک وقیع اصولی رائے ہے، جس کی ضرورت بہت سے احکام ومسائل میں پڑتی ہے، اہل بلاغت خصوصاً امامِ بلاغت شیخ عبدالقاہر جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ کلام اس کے قریب ہے، انھوں نے کلامِ فصیح کے معانی کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: معانی اولیہ اور معانی ثانویہ۔ نیز یہ ذکر کیا ہے کہ طبقاتِ فصاحت کا مدار ثانوی معانی کے اعتبار سے اس کے امتیاز وخصوصیت پر ہے اور اسی کی بنا پر فصحاء وبلغاء کے کلام کو امتیاز حاصل ہوتا ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس قاعدے کو اہمیت دیتے اور اسے ان اہم اور ضروری قواعد میں شمار فرماتے تھے، جن سے مفر نہیں، چنانچہ اعتبار اور مراد کے تعدد کے اعتبار سے اس بلاغی قاعدے کو مذکورہ قرآنی قاعدے کی نظیر قرار دیا جاسکتا ہے، اگرچہ دونوں مقامات پر محلِ تعدد مختلف ہیں، البتہ دونوں نظیروں کا مآل ایک ہونا ممکن ہے، چنانچہ جس طرح معانی اولیہ اور معانی ثانویہ کے درمیان ربط وتعلق ضروری ہے، اسی طرح مرادِ اولی اور مرادِ ثانوی کے درمیان مناسبت وتعلق ضروری ہے، ورنہ دونوں (مرادوں اور معانی) کو ایک ہی کلام کے تحت داخل کرنا کیونکر ممکن ہوگا؟! لیکن ان معانی اور مرادوں کے تعدد کا معاملہ کلماتِ مفردہ کی مانند نہیں کہ انہیں مشترک قرار دیا جاسکے، اگرچہ ضدین ہی کیوں نہ ہوں، یا عمومِ مشترک کہا جاسکے؛ کیونکہ مفردات کے احکام، مرکبات کے احکام سے جداگانہ ہیں، اور ہماری بحث مرکبات سے متعلق ہے، اس بحث کو یاد رکھیے؛ یہ نہایت نفیس اور لطیف بحث ہے، ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔

نظمِ قرآنی کا مدار عربی محاورہ ہے

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

”اگرچہ قرآن کریم میں ضمناً بہت سی لطیف رہنمائیاں اور دلائل وبراہین پائے

جاتے ہیں، جن سے فلسفیانہ ذوق ومزاج کے مالک لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ امور نظمِ قرآنی کے مقصودی فوائد واغراض کا معیار ومدار نہیں قرار دیئے جاسکتے ، البتہ جو شخص خوب غور وخوض کرے اور قرآن کریم کے مخفی اسرار ورموز اور لطائف واشارات میں غوطہ زن ہو تو قرآن ایسے روشن دلائل کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جن سے قرآن کریم پر ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن بہر کیف قرآن کریم کے جلیل القدر نظم کا مدار (گردوپیش میں) جاری عرف اور عربی محاورہ ہی ہے، جس میں اس کے مطلوب سے مستفاد (مخفی ودقیق) براہین کے بجائے اہلِ عرف کے ہاں تسلیم شدہ اور قبولیت یافتہ دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔''

گزشتہ بیان کی بنسبت یہ تعبیر زیادہ خوبصورت اور حقیقت کے زیادہ موافق ہے، پچھلی تعبیر سے جھلکتا تھا کہ قرآن کریم کا ظاہری انداز حکیمانہ ہے اور اس کا باطن دلائل وبراہین کا خزینہ ہے، اگر چہ لفظِ ''ظہر'' اور ''بطن'' حدیثی تعبیر کا حصہ ہیں، لیکن زیرِ بحث مقام میں اس تعبیر سے وہم ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی دونوں (ظہر وبطن) کو کلام کا مدار ومعیار ٹھہرایا ہے۔

بہر کیف قرآنی آیات کا مصداق تو وہی معانی ومطالب ہیں، جو عام عربی عرف کے محاورہ کے موافق ہوں اور وہی تفسیرِ قرآن کے لیے مدار ہیں، بعدازاں علوم ومعارف قرآنیہ کی تشریح وتوضیح کے قرآنی اشارات سے مدد لی جائے گی، جو لطائف واسرار کے ناپیدا کنار دریاؤں کے ضمن میں ودیعت رکھے گئے ہیں، بلاشبہ استدلال واحتجاج کے پہلو سے قرآن کریم کا یہ انوکھا اور منفرد اسلوب جو عام انسانی طبیعتوں کے موافق ہے، حکیم ودانا اور ادنیٰ انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں (ایسا اسلوب انسانوں کے لیے) دور افتادہ اور دشوار ہے، بشری طاقت، وسائل عقل ودانش اور فنی مناہج ایسے منفرد اسلوب تک رسائی سے عاجز ہیں۔

آیتِ توحید کا مدار ومقصود

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا.'' (انبیاء:۲۲)

ترجمہ: ''زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔''

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''اس آیتِ توحید کا مدار ومقصود یہ نہیں کہ کئی معبودوں کے موجود ہونے کی صورت میں یہ دکھائی دینے والا فساد کا شکار ہو جائے گا اور زمین وآسمان اس مضبوط ومحکم نظام سے خارج ہو کر نیست ونابود ہو جائیں گے، جیسا کہ عام ذہنوں کو سطحی نگاہ سے آیت کا یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے، بلکہ اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ اگر خدائے واحد وقہار کے علاوہ کوئی ایک یا کئی معبود اس کائنات کا نظام چلاتے تو یہ آسمان وزمین درہم برہم ہو جاتے، یعنی آسمان وزمین میں خدائے برحق ویکتا کے ہونے کی صورت میں فساد متعین ہے، خواہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ایک معبود ہو یا متعدد ہوں، آیت کا مدار اور اساسی فائدہ یہی غرض ہے۔''

نیز حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدہ ''ضرب الخاتم علی حدوث العالم'' کے درج ذیل شعر میں اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

وَلَوْ كَانَ إِلَّا اللّٰهُ قَدْ قَامَ فِيْهَا
لَقَدْ فَسَدَا بِالْجَوْرِ يَجْرِيْ لِمَا هُنَا

ترجمہ: ''اگر اللہ کے علاوہ آسمان وزمین میں کوئی اور کارساز ہوتا تو اس نظامِ کائنات میں ظلم وناانصافی کی بنا پر فساد برپا ہو جاتا۔''

راقم عرض کرتا ہے: اس آیت کے متعلق علمائے نحو کے کلام میں بھی یہی نکتہ ہے، ان کا کہنا ہے: آیت میں ''اِلا'' استثنائیہ نہیں، بلکہ صفت کے بیان کے لیے ہے اور ''غیر'' کے معنی میں ہے؛ کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق یہاں ''اِلا'' کو استثنا پر حمل نہیں کیا جا سکتا، اور ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟! اس لیے کہ اگر ''اِلا'' کو استثنا پر حمل کیا جائے تو آیت کا معنی کچھ یوں ہوگا: ''اگر آسمان و زمین میں کئی معبود ہوں اور ان میں سے اللہ تعالیٰ کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو آسمان و زمین فساد کا شکار ہو جائیں گے۔'' اس کا مفہوم تو یہ ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو ان متعدد معبودوں سے مستثنیٰ نہ کیا جائے، بلکہ اللہ بھی ان کے ساتھ ہو تو آسمان و زمین میں فساد برپا نہ ہوگا، تب یہ آیت توحید کی دلیل کیونکر قرار پائے گی؟! اس صورت میں تو اللہ تعالیٰ کو مستثنیٰ کیے بغیر تعدّدِ آلہہ بھی جائز ہو جائے گا۔ البتہ اگر ''اِلا'' کو ''غیر'' کے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدائے واحد کے علاوہ تمام معبود، خواہ ایک ہو یا متعدد اور خواہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہو یا نہ ہو (اس نظام کو چلائیں) تو آسمان و زمین تباہ و برباد ہو جائیں گے اور یہ دکھائی دینے والا مضبوط و محکم اور انوکھا و منفرد نظام درہم برہم ہو جائے گا، جیسے اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

''وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَـٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَـٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔'' (مؤمنون: ۹۱)

ترجمہ: ''اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو (تقسیم کر کے) جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔''

آیتِ توحید کے الفاظ کی بھی یہی غرض اور مطلوب ہے، البتہ اس کے مفہوم سے تعددِ آلہہ کا باطل ہونا بھی مستفاد ہوتا ہے، اس نکتہ کو اسی طرح خوب سمجھ لینا چاہیے اور ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

پھر آیت کریمہ کے ضمن میں جس ''برہانِ تمانع'' کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، علمائے امت نے اس کی کئی پہلوؤں سے تحقیق وتقریر فرمائی ہے، جن میں سے بعض ظنی اور بعض قطعی ہیں، امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''تفسیر کبیر'' میں (''برہان تمانع'' کی) بیس سے زائد وجوہ ذکر کی

ہیں، ان میں سے ''برہانی'' ہیں اور بعض ''اقناعی و(الزامی)'' ہیں، چاہت ہو تو ''تفسیر کبیر'' کی مراجعت کر لی جائے، وہاں علمی پیاس سے سیرابی کا سامان اور اشکالات کا درماں مہیا ہے۔ واللّٰہ الموفق والهادي إلی سواء الطریق!

قرآن مجید کی مُعجز مقدار

علمائے امت کا اس بابت اختلاف ہے کہ قرآن کریم کی کتنی مقدار معجز ہے؟ علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''إعجاز القرآن'' (ص:۱۹۸، مطبوعہ سلفیہ) میں چند آرا ذکر کی ہیں۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''میرے نزدیک قرآن کریم کی سب سے چھوٹی آیت بھی معجز ہے۔''

البتہ یہ پہلو اور اتنی مقدار میں اعجاز بہت ہی پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ماہر و باکمال اہل علم سے بھی مخفی رہ جاتا ہے اور اس کے مقصود تک اسی کی رسائی ہو سکتی ہے جس نے معانی ومفاہیم میں غور وخوض کی مشقت اٹھائی ہو، علومِ بیان ومعانی کے سمندروں میں غوطہ زنی کی ہو اور راہ اعجاز کے ان تمام پہلوؤں کی رعایت برتی ہو جن پر ہم گامزن رہے ہیں۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''(کتبِ) فقہ میں، فقیہ امت وامام الائمہ، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو منقول ہے کہ قرآن کریم کی ایک چھوٹی آیت بھی نماز میں فرض قراءت کی ادائیگی کے لیے کافی ہے، نیز جنبی شخص کے لیے (بطورِ تلاوت) ایک آیت سے کم قراءت کرنا جائز ہے اور ایک پوری آیت بطورِ تلاوت پڑھنا تو جائز نہیں، البتہ بطور دعا وثنا پڑھ سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مسائل اسی نکتے پر مبنی ہوں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرآن کریم کی معجز مقدار ایک آیت ہو اور اگر واقعتاً یہ مسائل اسی نکتے پر مبنی ہیں تو

یہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دقتِ نظر اور بلندیِ مرتبت کی نمایاں دلیل ہوگی؛ بلاشبہ وہ فقیہ امت ہیں، حقائق واسرار کے میدان میں انہیں رسوخ حاصل ہے۔

اس نکتے کے متعلق فقہاء میں سے کسی کی تصریح میری نگاہ سے نہیں گزری، البتہ بعض فقہاء نے اس مسئلے سے استدلال کرتے ہوئے اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ ایک آیت سے کم پر ''قرآن'' کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، واللہ اعلم!''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:

''اس کی تعیین نہیں کرسکتا کہ ایک طویل آیت کی کتنی مقدار معجز ہے؟۔''

خاتمۂ کلام

گزشتہ صفحات میں مسئلہ اعجازِ قرآنی کے متعلق حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے افادات اور اس مقدمے کے مناسب درمیانے انداز میں اپنی فکری رسائی کے مطابق ان کے عمدہ کلام کی تشریح وتوضیح کی ہے، قارئین کو ان مباحث سے مشکلاتِ قرآنی کے متعلق غور وخوض اور حقائق قرآنیہ میں غوطہ زنی کے حوالے سے حضرت کے مرتبہ ومقام اور اعجازِ قرآنی کے متعلق ان کی وسعتِ افکار کا اندازہ ہوگیا ہوگا، اسی بنا پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ تحدیثِ نعمت کے طور پر فرماتے تھے:

''اللہ تعالیٰ نے میری طبیعت میں فصاحت وبلاغت کا معیار ودیعت فرمادیا ہے، جس کی بنا پر میرے لیے فصیح وبلیغ اور غیر فصیح وبلیغ کلام بالکل نمایاں ہیں، ذوق اور وجدان کے اعتبار سے فصیح وغیر فصیح کلام کی خصوصیات اور مراتب میرے نزدیک واضح ہیں اور اس پہلو سے میں کسی کا مقلد نہیں، کتنے ہی ایسے اشعار جن پر علمائے ادب نے طعن وقدح فرمایا ہے، میرے نزدیک فصیح ہیں، بہت سے کلمات پر انہوں نے جرح کی ہے، جبکہ میرے نزدیک وہ بلیغ ہیں۔''

راقم عرض کرتا ہے: اس قبیل کی ایک مثال ابوطیب متنبی کے درج ذیل شعر کا دوسرا مصرعہ ہے:

وَتُسْعِدُنِيْ فِيْ غَمْرَةٍ بَعْدَ غَمْرَةٍ
سَبُوْحٌ لَهَا مِنْهَا عَلَيْهَا شَوَاهِدُ

ترجمہ: ''میری ہر مشکل میں وہ گھوڑا میری مدد کرتا ہے، جو گویا ماہر تیراک ہے، اس کی عمدگی پر اس کے اوصاف وکمالات خود گواہ ہیں۔''

بعض علمائے فن کا کہنا ہے کہ اس شعر کا دوسرا مصرعہ کثرتِ تکرار (ضمائر) کی بنا پر غیر فصیح ہے، لیکن حضرت شیخ فرماتے ہیں:

''اس مصرعے کی فصاحت پر تنقید کا کوئی سبب نہیں، میرے نزدیک یہ فصیح ہے۔''

علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''إعجاز القرآن'' اور حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

چونکہ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علومِ فصاحت وبلاغت میں نہایت بلند مرتبے پر فائز تھے، اس بنا پر انہیں علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''إعجاز القرآن'' کلی طور پر پسند نہ تھی، چنانچہ حضرت فرماتے تھے:

''باقلانی تو ائمہ متکلمین کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ''علم اعجازِ قرآنی'' ان کا فن ہی نہیں، یہ تو شیخ عبدالقاہر جرجانی اور علامہ زمخشری کا فن ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر فن کے لیے جدا رجالِ کار پیدا فرمائے ہیں، علم بلاغت اور علم کلام دونوں میدانوں کے ماہرین جدا جدا ہیں۔''

راقم عرض کرتا ہے: علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہمارے حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام ایسا ہی ہے جیسے امام ابن اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ نے ''المثل السائر'' (ص:۱۴۸) میں امام ابن جنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''ابوالفتح ابن جنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے ابوطیب متنبیؔ کے اشعار کی تشریح وتوضیح کے لیے ''المفسر'' نامی کتاب تالیف کی ہے، ابوطیب متنبیؔ کا شعر ہے:

تَبُلُّ خَدِّيْ كُلَّمَا ابْتَسَمَتْ مِنْ مَّطَرٍ بَرْقُه ثَنَايَاهَا

ترجمہ: ''میری محبوبہ جب بھی مسکراتی ہے تو میرے رخساروں کو ایسی بارش سے تر کر دیتی ہے، جس کی بجلی محبوبہ کے اگلے دانتوں (ثنایا) سے نکلتی ہے۔''

ابن جنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر کی تشریح کچھ یوں کی ہے: ''محبوبہ عاشق کے چہرے پر تھوکا کرتی تھی، ان کے خیال میں ابوطیب متنبیؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محبوبہ جب ہنستی مسکراتی تھی تو اس کے منہ سے تھوک اڑ کر عاشق کے چہرے پر جا لگتا تھا، چنانچہ شاعر نے اس تھوک کو بارش سے تشبیہ دی ہے۔''

''میرا نہیں خیال کہ (شعر کے) اس مفہوم کی طرف کسی کا وہم وگمان گیا ہوگا، جو اس شخص کے خیال وخاطر میں آیا ہے، عربیت کا ایسا امام جس کی طرف طلباء رختِ سفر باندھ کر (استفادے کے لیے) جاتے ہیں، جب ان کا ایسا کلام ہے تو دیگر لوگوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ درحقیقت فنِ فصاحت وبلاغت اور علمِ نحو واعراب دونوں جدا گانہ میدان ہیں۔''

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں (ص: ۱۱۳):

''علم فصاحت کے اسرار ورموز، علمائے عربیت سے حاصل نہیں کیے جا سکتے، ان سے تو نحوی یا صرفی مسائل اخذ کیے جا سکتے ہیں، یا لغوی کلمات اور اس قبیل کے امور کے متعلق استفادہ کیا جا سکتا ہے، فنِ فصاحت وبلاغت کے اسرار ورموز کے الگ مردانِ کار ہیں جو اسی فن کے ساتھ مخصوص ہیں۔''

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا تجزیہ

راقم عرض گزار ہے: ایک عرصہ قبل ۱۳۴۶ھ میں جب میں نے علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''إعجاز القرآن'' کے متعلق حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نقد وتبصرہ سنا تو علمِ بلاغت کے

میدان میں حضرت کی انتہائی مہارت اور رسوخ وکمال کے اجمالی اعتقاد کی بنا پر یہ کلام میرے دل میں جاگزیں ہوگیا تھا، بعدازاں احوال کا ارتقا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے مطالعہ کی توفیق بخشی اور ان کی عالی شان کتاب کے مرتبے سے شناسائی ہوئی تو کتاب کے حوالے سے حضرت شیخ۔ اللہ ان کا مرتبہ بلند فرمائے۔ کے نقد وتبصرہ کے متعلق میں تردد کا شکار ہوگیا اور اس کتاب کے حوالے سے شیخ کے کلام کے بارے میں پہلے جیسی قدر نہ رہی، پھر میں نے علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کا دوبارہ بغور مطالعہ کیا، حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے متعلق (منتشر) طبیعت کو یکجا کیا اور اعجازِ قرآنی کے باب میں شیخ کے فرمودات کے متعلق اپنے افکار وخیالات کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ پھر شیخ اور علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے کلام اور ان کے باہمی امتیازات پر طویل عرصہ غور وخوض کیا تو مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شیخ کا نقد وتبصرہ، اعجاز قرآنی کی معرفت کے پہلو سے ان کی بلندیِ مرتبت کی بنا پر برحق ہے اور ان جیسی شخصیت کو علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ میں نے ان امور کی چھان بین اور تحقیق کی، جن پر اس تنقید کا مدار ہے تو مجھے اطمینان بخش وجوہات مل گئیں، ذیل میں ان وجوہ کی جانب انتہائی اختصار کے ساتھ اشارہ کررہاہوں:

امرِ اول

علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب پر آپ بصیرت افروز گہری نگاہ ڈالیے اور اس کی بلندیوں اور پستیوں کا بغور وتدبر جائزہ لیجیے تو ان کی اس کتاب میں اعجازِ قرآنی کے متعلق کوئی ایسی بات نہ ملے گی جو اُن سے پہلے نہ کہی گئی ہو، اعجازِ قرآنی کی عمارت میں ایسا کوئی بند دروازہ نہ تھا جو انہوں نے کھولا ہو اور دیگر اہل علم نے ان کی خوشہ چینی کی ہو، بلکہ امام خطابی، واسطی اور جاحظ ودیگر ائمہ ان سے قبل وہ بحثیں ذکر کرچکے ہیں، جو علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''إعجاز القرآن'' میں درج کی ہیں،

البتہ ان ائمہ کے کلام میں جہاں اجمال وابہام تھا، علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تفصیل وتوضیح کی ہے اور ہر مقام کی تشریح کا حق ادا کیا ہے، لیکن علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی (بلند پایہ) شخصیت کے لیے یہ کوئی بڑا کارنامہ شمار نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ قابل حیرت معاملہ ہے، نیز یہ کہنا بھی دور کی کوڑی ہوگی کہ موصوف اس باب میں متقدمین اہل علم کے کلام سے ناواقف تھے۔ مزید براں انہوں نے اپنی کتاب میں بعض ایسے امور کے متعلق اکتاہٹ میں مبتلا کردینے والا طویل کلام کیا ہے کہ ان پر وجوہِ اعجاز کی وضاحت کا دارومدار ہی نہیں۔

اس کے برخلاف آپ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام پر بار بار غور کیجیے اور خوب گہری جانچ پرکھ کیجیے، ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو اس موضوع کے نئے مباحث ہاتھ آئیں گے، بلکہ اس وسیع میدان، میں جس کو طے کرتے کرتے افکار وآرا کی سواریاں نڈھال ہوجاتی ہیں، انہیں سب سے فائق پائیں گے۔

امرِ دوم

حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''پورے قرآن کریم کا اعجاز میرے لیے طلوع ہوتے آفتاب سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔''

اس کی وجہ گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ حضرت کے نزدیک قرآن کریم کی سب سے چھوٹی آیت بھی معجز تھی، ان کے ہاں معاملہ ایسا نہ تھا کہ کچھ آیات کا اعجاز واضح ہو اور دیگر کا پوشیدہ ہو، البتہ مراتبِ اعجاز اور طبقاتِ بلاغت کے درمیان تفاوت تو مسلم ہے، لیکن یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔

دوسری جانب علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں (ص:۱۶۵):

''ہمارے اعتقاد کے مطابق قرآن کریم کے کچھ حصے کا اعجاز بہت واضح ہے، جبکہ بعض مقامات پر پوشیدہ و دقیق ہے۔''

نیز (ص: ۱۶۳) فرماتے ہیں:

’’قرآن کریم کے بعض مقامات میں (اعجازِ قرآنی پر) دلالت بہت واضح اور ظاہر ہے اور آیت بھی واضح اور ظاہر باہر ہوتی ہے۔‘‘

مزید (ص: ۱۹۹) رقم طراز ہیں:

’’غور کیجیے کہ بعض سورتوں اور آیات میں اعجازِ قرآنی زیادہ نمایاں ہے، جبکہ بعض میں پوشیدہ تر، اس بنا پر بعض مقامات کی (اعجاز کے اعتبار سے) حالت جاننے کے لیے زیادہ غور وخوض اور بحث و تحقیق کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ اس کے بغیر بھی اعجاز واضح ہوجاتا ہے اور بعض جگہوں پر دقتِ نظر اور گہری تفتیش کی ضرورت پڑتی ہے؛ تاکہ اعجاز واضح ہو اور مطلوب حاصل ہو اور عین ممکن ہے کہ بعض سورتوں میں وجہ اعجاز واضح ہی نہ ہو، تب اجماع کی طرف لوٹنا (اور قرآن کریم کو بلاشبہ معجز کہنا) پڑتا ہے، یا پھر (اعجاز کے حوالے سے) توقیف کا مذہب اختیار کرنا ہوتا ہے، یا پھر یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ تمام اہل عرب اس (قرآن کریم کا مثل لانے) سے عاجز رہے تھے (لہٰذا یہ اس کلام کے معجز ہونے کی دلیل ہے۔‘‘

وجوہِ اعجاز اور اس موضوع کے مناسب جس قدر مباحث مجھے میسر آئیں، اس مقدمے میں درج کردی ہیں اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور حسنِ توفیق سے اس باب کا خلاصہ پیش کردیا ہے، جس نے اہل عقل ودانش کو اس موضوع سے متعلق کسی مستقل کتاب کے مطالعہ سے گویا مستغنی کردیا ہے۔

واللہ ولي التوفیق، وصلی اللہ علی أفصح العرب العرباء، وعلی آله وصحبه وبارك وسلم تسلیما كثیرا.

متشابہ آیات کے متعلق ایک لطیف بحث

اعجازِ قرآنی کے متعلق اس بحث کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جلال الدین

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الإتقان'' میں آیاتِ متشابہات سے متعلق نوع (یعنی ترسیٹھویں نوع) کا خلاصہ پیش کردیا جائے۔ آیاتِ متشابہات سے مراد ایسے کلمات ہیں، جن کے معانی یکساں ہیں، لیکن الفاظ مختلف ہیں، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''اس موضوع پر کچھ اہل علم نے مستقل تالیفات ترتیب دی ہیں، جن میں میری دانست کے مطابق امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ کو پہل حاصل ہے، علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو نظمایا ہے اور پھر علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''البرهان في متشابه القرآن'' میں اس کی توضیح وتشریح فرمائی ہے، اس سے بہتر امام ابوعبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''درة التنزيل وغرة التاويل'' ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ابو جعفر بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کی ''ملاك التاويل'' ہے، لیکن اس (آخری) کتاب سے میں مطلع نہیں ہوسکا۔ قاضی بدر الدین بن جماعہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس فن میں ''کشف المعاني من متشابه المثاني'' کے نام سے ایک لطیف کتاب مرتب کی ہے اور ''أسرار التنزيل'' جو ''قطف الأزهار في كشف الأسرار'' کے نام سے معروف ہے، میں بھی اس موضوع سے متعلق کافی مواد ہے۔''

''متشابہات'' سے مراد ہے کہ قرآن کریم (بعض اوقات) ایک ہی قصہ مختلف صورتوں اور جداگانہ اسالیب میں بیان کرتا ہے، بلکہ اسی ایک قصے (اجزا) میں کہیں تقدیم اور کہیں تاخیر بھی ہوتی ہے۔ مثلاً (بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے) سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ'' (البقرة:۵۸) (اور دروازے میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے) کہتے جانا کہ توبہ ہے، توبہ ہے) جبکہ سورۂ اعراف میں (یہی واقعہ جدا ترتیب سے بیان ہوا) ہے: ''وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'' (الاعراف:۱۶۱)

(اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) اور (عاجزی سے) جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہونا)۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے: ''وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ'' (البقرہ:۱۷۳) ترجمہ: ''اور ایسے جانور کو جو (بقصدِ تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو''۔ (یعنی لفظ ''بہ''، ''أھل'' کے بعد ہے)، جبکہ باقی قرآن میں (یوں) ہے: ''وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' (ملاحظہ کیجیے: المائدہ:۳، الانعام:۱۴۵، النحل:۱۱۵)۔

اسی طرح بعض مقامات پر آیت، بعض الفاظ یا حروف کی زیادتی کے ساتھ ہوتی ہے اور دیگر جگہوں پر اس زیادتی کے بغیر، جیسے: سورۂ بقرہ میں ہے: ''سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ'' (البقرہ:۶)، جبکہ سورۂ یٰسین میں ہے: ''وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ'' (یٰسین:۱۰)، نیز سورۂ بقرہ میں ہے: ''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ''، (البقرہ:۱۹۳) (اور دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جاوے)، جبکہ سورۂ انفال میں ہے: ''كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' (الانفال:۳۹)۔

کبھی ایک لفظ ایک مقام پر معرفہ اور دوسری جگہ نکرہ یا ایک جگہ مفرد اور دوسرے مقام پر جمع، یا ایک مقام پر ایک حرف کے ساتھ اور دوسری جگہ دوسرے حرف کے ساتھ، یا ایک جگہ ادغام کے ساتھ اور دوسرے مقام پر ادغام کے بغیر ہوتا ہے۔ یہ نوع درحقیقت ''نوع المناسبات'' کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، ذیل میں اس نوع کی چند مثالیں مع توجیہات پیش کی جا رہی ہیں۔

① سورۂ بقرہ میں ارشادِ ربانی ہے: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' (البقرہ:۲) (راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو)، جبکہ سورۂ لقمان میں ہے: ''هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ'' (لقمان:۳) ترجمہ: (ہدایت اور رحمت ہے نیک کاروں کے لیے) چونکہ سورۂ بقرہ میں مجموعۂ ایمان کا ذکر ہے تو اس کے مناسب ''المتقین'' تھا، جبکہ سورۂ لقمان میں رحمت کا تذکرہ تھا، تو ''محسنین'' کا ذکر اس کے مناسب تھا۔

② سورۂ بقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا'' (بقرہ:۳۵) (اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں اور کھاؤ دونوں)، جبکہ سورۂ اعراف میں ''فَكُلَا'' (الاعراف:۱۹) (اس فرق کی توجیہ کے متعلق یوں) کہا گیا ہے: سورۂ بقرہ میں ''سکنیٰ'' سے مراد اقامت اور ٹھہرنا ہے، اور سورۂ اعراف میں مراد ''اتخاذ سکنیٰ'' یعنی جائے اقامت بنانا مراد ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں چونکہ باری تعالیٰ کی جانب سے قول کی نسبت تھی: ''قلنا یاأدم'' تو اکرام کی زیادتی مناسب تھی، اس لیے ''واؤ'' لایا گیا، جو ''سکنیٰ'' اور ''أکل'' کے جمع ہونے پر دلالت کرتا ہے، اسی بنا پر اس آیت میں مزید اکرام کے لیے ''رغدا'' اور ''حیث شئتما'' بھی کہا گیا ہے؛ اس لیے کہ یہ زیادہ عام ہے، جبکہ سورۂ اعراف میں (اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے بغیر ''ویاآدم'' ہے، چنانچہ وہاں ''فا'' لایا گیا جو ''أکل'' کے ''سکنیٰ'' مرتب ہونے کو بیان کرتا ہے، جس کے بنانے کا حکم دیا گیا ہے؛ کیونکہ ''أکل'' (کھانا پینا) جائے اقامت کی تعیین کے بعد ہی ہوا کرتا ہے، اسی لیے ''من حیث شئتما'' فرمایا، جو ''حیث شئتما'' کی مانند عمومِ معنی پر دلالت نہیں کرتا۔

③ ارشادِ باری عزاسمہ ہے: ''وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ.'' (البقرۃ:۴۸) (اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کی طرف داری چل سکے گی)، جب کہ اس کے بعد (سورۂ بقرہ ہی میں دوسرے مقام پر) ہے: ''وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ'' (البقرہ:۱۲۳) (اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ

قبول کیا جاوے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی)۔ لفظِ "عدل" دوسری آیت میں مقدم اور پہلی آیت میں مؤخر ذکر ہوا ہے، نیز پہلی آیت میں قبولیتِ شفاعت کی تعبیر ہے، جبکہ دوسری میں شفاعت کی جانب "نفع" کی نسبت ہے۔ اس (تقدیم وتاخیر اور تعبیری فرق) کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ "منھا" کی ضمیر کا مرجع پہلی آیت میں پہلا "نفس" (شفاعت کرنے والا نفس ہے اور دوسری آیت میں دوسرا نفس (مجرم نفس) ہے، چنانچہ پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ شفاعت کرنے اور دوسرے کی جانب سے بدلہ دینے کے لیے پیش ہونے والے نفس کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور اس آیتِ شفاعت کا ذکر اسی بنا پر مقدم کیا گیا ہے کہ شفاعت کرنے والا فدیہ دینے سے پہلی ہی شفاعت کرتا ہے۔ دوسری آیت کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے کہ جو نفس اپنے جرم کی بنا پر مطلوب ہے، اس کے جرائم کے بدلے نہ اس کا فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے حق میں کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت مقبول ہوگی۔ اس آیت میں لفظِ "عدل" (فدیہ) کا تذکرہ مقدم ہے (اور شفاعت کا ذکر بعد میں ہے)؛ اس لیے کہ شفاعت کی ضرورت فدیہ وتاوان رد ہونے کی صورت میں ہی پیش آیا کرتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت میں "وَلَا تُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ" فرمایا (یعنی شفاعت کی جانب عدمِ قبولیت کی نسبت کی گئی)، جبکہ دوسری آیت میں "وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ" کہا گیا ہے (یعنی شفاعت کے غیر نافع ہونے کو بتایا گیا ہے)؛ کیونکہ شفاعت کی قبولیت، شفاعت کرنے والے کے لیے ہوتی ہے اور شفاعت کا فائدہ اسی شخص کو پہنچتا ہے جس کے لیے شفاعت کی جاتی ہے۔

④ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ." (البقرہ: ۴۹) (اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ رہائی دی ہم نے تم

کو متعلقینِ فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے، تمہاری سخت آزادی کے گلے کاٹتے تھے)۔اور سورۂ ابراہیم میں (اسی مضمون کے متعلق) ''واؤ'' کی زیادتی کے ساتھ فرمایا: ''وَيُذَبِّحُوْنَ ''؟اس لیے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل سے خطاب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس گفتگو میں اکراماً ان کو پیش آنے والے مصائب ومشکلات کو شمار نہیں فرمایا، جبکہ دوسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام (کی حکایت) ہے، انہوں نے مصائب والآم بھی شمار کرائے ہیں۔سورۂ اعراف میں ''يذبّحون '' کے بجائے'' يقتلون '' (الاعراف:۱۴۱)(بکثرت مارڈالتے تھے) آیا ہے، یہ ''تنوعِ الفاظ'' کے قبیل سے ہے،جس کو (علمِ بلاغت کی اصطلاح میں) ''تفنّن'' کہا جاتا ہے۔

۵ ارشادِ ربانی ہے: ''وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ'' (البقرہ:۵۸) یہی مضمون سورہ اعراف میں چند الفاظ کے اختلاف کے ساتھ ہے، اس اختلاف میں نکتہ یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت ''منعم عليهم'' (جن پر انعامات کا فیضان ہوا) کے تذکرہ کے ذیل میں ہے، چنانچہ (سورۂ بقرہ میں) ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''يَا بَنِيْٓ إِسْرَائِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ ....الخ''لہٰذا یہاں ''وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ'' میں قول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب کرنا مناسب ہے، اسی طرح یہاں کے مناسب لفظ'' رغدا'' ہے؛اس لیے کہ اس سے ''منعم به'' (جن چیزوں کے ذریعے انعام ہوا) کا اتمام معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس مقام پر'' وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'' کو مقدم کرنا اور لفظِ'' خَطَايَاكُمْ '' کو ذکر کرنا بھی مناسب ہوا؛اس بنا پر کہ'' خطايا''، جمع کثرت کا صیغہ ہے اور'' وسنزيد '' میں ''واؤ'' کا اضافہ بھی بجا ہے؛ اس لیے کہ'' واؤ'' ماقبل ومابعد کے جمع ہونے پر دلالت کرتا ہے اور'' فكلوا'' میں ''فا'' بھی اس مقام کے مناسب ہے؛اس بنا پر کہ'' أكل''(کھانا پینا)''دخول''

پر مرتب ہے (کیونکہ داخل ہونے کے بعد ہی کھانا پینا ہوا کرتا ہے)، جبکہ سورۂ اعراف کی آیت سے پہلے بنی اسرائیل کی سرزنش کے تناظر میں ہے، بنی اسرائیل نے کہا تھا: ''اِجْعَلْ لَّنَا إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ'' (الاعراف:۱۳۸) (ہمارے لیے بھی ایک (مجسم) معبود ایسا ہی مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں)، پھر انہوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا (اور اس کی پوجا کرنے لگے)، لہٰذا اس مقام کے مناسب (براہِ راست خطاب کے بجائے صیغۂ مجہول ہی) تھا ''وَإِذْ قِيْلَ لَهُمْ''، اسی طرح لفظ ''رغداً'' کا ترک بھی مناسب ہوا۔ نیز ''سکنی'' (رہائش) کے ساتھ تو ''أکل'' (کھانا پینا) بھی یکجا ہوتا ہے، اس لیے فرمایا: ''وکلوا'' (فا کے بجائے واو کے ساتھ)، اسی طرح گناہوں کی مغفرت کا پہلے ذکر کرنا اور ''سنزید'' میں ''واو'' کو ترک کرنا بھی اس مقام کے مناسب ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف کی آیت میں چونکہ بعض لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے کا ذکر ہے: ''وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ'' (الاعراف:۱۵۹) (اور قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو (دین) حق کے موافق ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے موافق انصاف بھی کرتے ہیں) تو اس کے مناسب یہ تھا کہ ظالموں کا تذکرہ بھی اسی انداز میں ہو: ''فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ'' (سو بدل ڈالا ان ظالموں نے)، جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت: ''فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ'' (البقرہ:۵۹) میں ظالموں کے علاوہ باقی لوگوں کی سلامتی کی جانب اشارہ ہے؛ اس لیے کہ صرف ظالموں پر عذاب نازل ہونے کی صراحت ہے، اس طرح لفظِ ''إرسال'' شدتِ وقوع کے اعتبار سے ''إنزال'' سے زیادہ مبالغہ کا حامل ہے تو سورۂ بقرہ کے مضمون تذکرۂ انعامات کے مناسب (لفظِ ''إنزال'' ہی) ہوا اور سورۂ بقرہ کی آیت کا اختتام لفظِ ''یفسقون'' کے ساتھ کیا گیا ہے، اور لفظِ ''فسق'' سے ''ظلم'' لازم نہیں آتا؛

(اس لیے کہ ''فسق'' خاص اور ''ظلم'' عام ہے) جبکہ لفظِ ''ظلم'' کو ''فسق'' لازم ہے، لہٰذا (دونوں مقامات میں) ہر لفظ اور تعبیر اپنے سیاق کے مناسب ہے۔

⑥ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ''فانفجرت'' (البقرہ:۶۰) (پس فوراً پھوٹ نکلے)، جبکہ سورۂ اعراف میں فرمایا: ''فانبجست'' (الاعراف:۱۶۰) (پس فوراً پھوٹ نکلے)؛ اس لیے کہ پانی کی کثرت کے بیان میں لفظ ''الانفجار'' زیادہ مبالغہ کا حامل ہے، لہٰذا نعمتوں کے تذکرہ کا سیاق کے مناسب یہی تعبیر ہے۔

⑦ سورۂ بقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً'' (البقرہ:۸۰) (اور (یہودیوں نے یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوئے گی (بھی) نہیں مگر (بہت) تھوڑے روز) جو (انگلیوں پر) شمار کر لیے جاسکیں)، جبکہ سورۂ آل عمران میں لفظِ ''معدودات'' (صیغۂ جمع) ہے۔ علامہ ابن جماعہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی توجیہ یوں فرماتے ہیں: ''اس قول کے قائل یہود کے دو فرقے تھے، ایک فرقے کا کہنا تھا کہ انہیں دنیا کے ایام کے بقدر سات دن جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا اور دوسرے فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ انہیں چالیس دن تک عذابِ جہنم میں گرفتار کیا جائے گا؛ اس لیے کہ ان کے آباء واجداد نے اتنی ہی روز بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ اب سورۂ بقرہ کی آیت میں دوسرے فرقے کی مراد ہونے کا احتمال ہے؛ کیونکہ ''جمع کثرت'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، جبکہ سورۂ آل عمران میں بظاہر پہلا فرقہ مراد ہے؛ اس بنا پر کہ (تعبیر میں) جمع قلت لائی گئی ہے''۔ امام ابوعبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یہ فرق (علمِ بلاغت کے) ''بابِ تفنّن'' کی قبیل سے ہے۔

⑧ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى'' (البقرہ:۱۲۰) (بھائی) حقیقت میں تو ہدایت کا وہی راستہ ہے جس کو خدا نے بتلادیا)، جبکہ سورۂ آل عمران

میں فرمانِ اقدس ہے: ''اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ '' (آل عمران: ۷۳) اس لیے کہ سورۂ بقرہ میں ہدایت سے مراد ''تحویلِ قبلہ'' سے اور آلِ عمران میں ہدایت سے مراد ''دینِ اسلام'' ہے؛ کیونکہ اس سے قبل ارشاد ہے: ''لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ '' اور اس کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول دین دینِ اسلام ہی ہے۔

⑨ سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا '' (بقرہ:۱۲۶) (اے میرے پروردگار! اس کو ایک آباد شہر بنا دیجیے امن وامان والا)، جبکہ سورۂ ابراہیم میں فرمایا: ''هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا ''؛ اس لیے کہ پہلی آیت میں مذکور دعا مکہ کے شہر بننے سے قبل اس وقت کی گئی تھی، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت ہاجرہ و اسماعیل علیہما السلام کو اس بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ کر جا رہے تھے، چنانچہ اس موقع پر دعا کی کہ اللہ اس وادی میں شہر بسا دے، جبکہ دوسری آیت میں مذکور دعا اس موقع کی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام دوبارہ مکہ تشریف لائے، اس وقت قبیلہ جُرہم وہاں آباد ہو چکا تھا اور مکہ ایک شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر مکہ کے لیے امن وآشتی کی دعا فرمائی۔

⑩ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا '' (البقرہ: ۱۳۶) (مسلمانو!) کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا) اور سورۂ آل عمران میں یوں ارشاد ہے: ''قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا'' (آل عمران: ۸۴) (یعنی پہلی آیت میں حرف ''اِلیٰ '' ہے اور دوسری آیت میں حرف ''علیٰ '' ہے)؛ اس لیے کہ پہلی آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے اور دوسری آیت میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا گیا ہے۔ حرف ''اِلیٰ '' کے ذریعے تمام جہات سے انتہا کو بیان کیا جاتا ہے اور حرفِ ''علیٰ '' کے ذریعے صرف ایک جہت یعنی جہتِ علو سے انتہا کا بیان ہوتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کے

پاس قرآنِ کریم ہر جہت سے آتا تھا کہ قرآن کے مبلغ ان کے پاس تمام جہات سے آتے تھے، (اس لیے مسلمانوں سے خطاب کے وقت حرف ''إلی'' کے ساتھ ''إِلَيْنَا'' کہنا مناسب تھا)، جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قرآن کریم صرف جہتِ علو کی جانب سے آتا تھا؛ اس لیے آپ سے خطاب کے موقع پر ''حرف ''علی'' کے ساتھ'' ''عَلَيْنَا'' کہنا مناسب ہوا، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے والے امور کے متعلق اکثر حرفِ ''علی'' اور امت کی جانب آنے والے امور کے متعلق اکثر حرف ''إلی'' استعمال ہوتا ہے۔

⑪ سورۂ بقرہ میں ایک مقام پر ارشاد ہے: ''تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا'' (البقرہ:۱۸۷) (یہ خداوندی ضابطے ہیں سو ان سے نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا)، جبکہ اس کے بعد دوسرے مقام پر فرمایا: ''فَلَا تَعْتَدُوْهَا'' (البقرہ:۲۲۹) (سو تم ان سے باہر مت نکلنا)؛ اس لیے کہ پہلی آیت چند منہیات (امورِ ممنوعہ) کے بعد وارد ہوئی ہے، اس کے مناسب یہی تھا کہ ان امور کے قریب جانے سے بھی روکا جائے، جبکہ دوسری آیت چند اوامر و احکام کے تذکرے کے بعد آئی ہے، اس مقام کے مناسب تھا کہ ان احکام و اوامر (کی حدود) سے تجاوز اور تعدّی سے منع کیا جائے، اور ان کے حدود پر ٹھہرنے کا حکم دیا جائے۔

⑫ (قرآنِ کریم کے نزول کے متعلّق) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ'' (آل عمران:۳) (اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے)، جبکہ (تورات وانجیل کے متعلّق) ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيْلَ'' (آل عمران:۳) (اور (اسی طرح بھیجا تھا) تورات اور انجیل کو)؛ اس لیے کہ قرآن کریم تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے، لہٰذا اس کے (نزول کے بیان) کے لیے ''نَزَّلَ'' (بصیغہ تفعیل) لانا ہی مناسب تھا، جو (فعلِ نزول کے) تکرار پر دلالت کرتا ہے، اس کے

برخلاف تورات اور انجیل یکبارگی نازل ہوئی ہیں (لہٰذا ان کے نزول کے بیان کے لیے لفظ"أنزل"لایا گیا ہے:"إنزال"یکبارگی نزول کے مفہوم کو بیان کرتا ہے۔

⑬ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے:"وَلَا تَقْتُلُوْٓا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ"(الانعام:۱۵۱) (اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو) اور سورۂ اسراء میں ارشاد ہے:"وَلَا تَقْتُلُوْٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ"(اسراء:۳۱) (اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل مت کرو)؛ اس لیے کہ پہلی آیت میں مفلس فقراء سے خطاب ہے یعنی ان سے کہا گیا ہے کہ اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کی بنا پر قتل مت کرو، اس مقام پر یہ خوبصورت تعبیر استعمال کی گئی ہے:"نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ"(ہم (ان کو اور) تم کو رزق (مقدر) دیں گے) جس سے تمہارا فقر زائل ہو جائے گا، پھر فرمایا:"وإيّاهم"یعنی ہم تم سب کو روزی دیں گے۔ جبکہ دوسری آیت میں اغنیاء و مالدار طبقے سے خطاب ہے، یعنی ان سے کہا گیا ہے کہ اپنی اولاد کو اس اندیشے کی بنا پر قتل نہ کرو کہ ان کی وجہ سے کہیں فقر لاحق نہ ہو جائے، اس لیے اس موقع پر یہی فرمانا مناسب تھا:"نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ"(کیونکہ) ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی)۔

⑭ارشاد باری تعالیٰ ہے:"فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ"(الاعراف:۲۰۰) (تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے) اور سورۂ فصّلت میں ارشاد ہے:"إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ"(فصلت:۳۶) (یعنی دوسرے مقام پر"هو"ضمیر بھی لائی گئی ہے اور پہلی آیت میں نہیں ہے)۔ علامہ ابن جماعہ رحمۃ اللہ علیہ نے (اس فرق کی توجیہ بیان کرتے ہوئے) لکھا ہے:"سورۂ اعراف کی آیت پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۂ فصلت کی آیت بعد میں نازل ہوئی ہے، اس لیے (دوسری آیت میں ان صفات کے ذریعہ تعریف بالکل برمحل تھی کہ جن کا تذکرہ اس سے قبل بھی شیطان کے وساوس کے متعلق ہدایت کے ضمن میں گزر چکا تھا، گویا کہا گیا کہ یوں اسی سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ سے پناہ مانگو (جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے)۔"

⑮ ارشاد ربانی ہے: ''اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ'' (التوبۃ:۶۷) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں)، ایمان والوں کے متعلق فرمایا: ''بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ'' (آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں) اور کفار کے متعلق ارشاد ہوا: ''وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ'' (التوبۃ:۷۳) (جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں)؛ کیونکہ منافقین کا باہمی تعاون کسی متعین دین اور شریعت کے متعلق نہیں تھا، بلکہ ان میں سے بعض یہودی اور بعض مشرک تھے، اس لیے ان کے متعلق فرمایا: ''من بعض'' یعنی شک اور نفاق کے معاملے میں یہ منافقین بعض، بعض سے ہیں۔ ان کے برخلاف مؤمنین کا باہمی تعاون دین اسلام کی بنیاد پر تھا اور اسی طرح علانیہ کفر کا اظہار کرنے والے کفار بھی سب ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے، اور باہمی تعاون پر متفق تھے، برخلاف منافقین کے کہ ان کی حالت ایسی ہی تھی جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى'' (حشر: ۱۴) (اے مخاطب! تو ان کو (ظاہر میں) متفق خیال کرتا ہے، حالانکہ ان کے قلوب غیر متفق ہیں)۔ مذکورہ چند مثالوں سے (آیاتِ قرآنیہ میں کارفرما ''مناسبات'' کے متعلق) روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، اس حوالے سے بہت سی مثالیں تقدیم وتاخیر، فواصل وغیرہ متعلق انواع میں بھی گزر چکی ہیں۔''

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متفرق قیمتی فرمودات

ہمارے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے (علومِ قرآن کے متعلق) بہت سے منفرد اور بکھرے ہوئے قیمتی ملفوظات ہیں، جن کی روشنی میں قرآن کریم سے متعلق مختلف مباحث میں ربط پیدا ہوجاتا ہے، یہ ملفوظات، جواہر پاروں اور لعل و یاقوت کی مانند ہیں، پُر حکمت اور بصیرت افروز ہیں، اسالیبِ قرآن کے متعلق بنیادی اصولوں کے قائم مقام ہیں، ذیل میں حضرت کے ایسے ملفوظات کسی قدر وضاحت کے ساتھ ترتیب وار درج کررہا ہوں۔ وباللہ التوفیق والعصمۃ!

① قرآنی طرزِ بیان اور عام طریقۂ تالیف

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"قرآنِ کریم کا اسلوبِ کلام، فقہی فتاویٰ کی کتاب کی طرح جزئیات در جزئیات بیان کرنے، یا ان جزئیات کو علماء عصر کی جدید تالیفات کی طرح شمار کردہ مواد و مضامین میں تقسیم کرنے کا نہیں، بلکہ قرآن عام عربی اسلوبِ گفتگو کے مطابق کلام کو ایک دوسرے پر عطف کرکے بیان کرتا ہے، اسی بنا پر ایک ہی میں ذکر کردہ مرتب آیات کے موضوعات کے متعلق بھی علمائے تفسیر کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے؛ کیونکہ بعض اوقات یہ پہلو مخفی ہوتا ہے کہ دوسری آیت کا موضوع پہلی آیت کے موافق ہی ہے یا اس سے عام یا خاص ہے، یا پھر دونوں آیتوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کوئی اور ہے؟!"

بلاشبہ یہ ایک اہم بحث ہے جو خصوصی اہتمام کا حق رکھتی ہے۔

② ایک ہی واقعہ کے اجزا میں تقدیم وتاخیر

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

”قرآنِ کریم کا بنیادی موضوع، تاریخ کا استیعاب اور تمام واقعات وحوادث کو بیان کرنا نہیں ہے، اس بنا پر قرآنِ کریم ایک مقام پر اختصار سے کام لیتا ہے اور دوسرے مقام پر تفصیل بیان کرتا ہے، ایک ہی واقعہ کے مختلف اجزا میں ایک جگہ تقدیم اور دوسری جگہ تاخیر ہوتی ہے، اس تقدیم وتاخیر کے پس منظر میں ایسی دقیق ولطیف حکمتیں اور اسرار ورموز کارفرما ہوتے ہیں کہ انسانی عقلیں ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں، اس حوالے سے قرآن کریم (کے اسلوب) میں ایسی خصوصیات وامتیازات ہیں جو (دقت ولطافت کی بنا پر) طبیعت کی یکسوئی اور نہایت دقتِ فکر کی محتاج ہیں۔“

(علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی) ’الإتقان“ کے دوسرے حصے کی متعدد انواع ملاحظہ فرمایئے، اس موضوع سے متعلق اسرار ومعارف دکھائی دیں گے۔

③ مشکلاتِ قرآنی، مشکلاتِ حدیث سے بڑھ کر ہیں

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

”مشکلاتِ قرآن، مشکلاتِ حدیث سے بڑھ کر ہیں، مگر افسوس کہ امتِ مرحومہ (کے اہلِ علم) نے قرآن کریم کی ویسی خدمت نہیں کی جیسے ذخیرۂ حدیث کی خدمت فرمائی ہے، حالانکہ قرآن کریم (کی خدمت) کا اہتمام حدیث سے زیادہ اہم تھا۔“

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی پہلے گزر چکا ہے:

”مطبوعہ ذخیرۂ تفسیر میں قرآن کریم کی کوئی ایسی تفسیر نہیں جو مرتبہ ومقام میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی ”فتح الباري لصحيح البخاري“ کے ہم پلہ ہو، قرآن کریم کے نمایاں امتیازات وخصوصیات کو حاوی ہو اور اس کے مخفی دقائق کو واشگاف کرتی ہو۔“

④ قرآنی تعبیر کا احاطہ، مطلوبہ غرض کی حد تک ہوتا ہے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

"قرآنِ کریم کا نظم، غرضِ مطلوب کے بیان ہونے اور مقام کے بخوبی سمجھ میں آجانے کے بعد محض عبارت کے استیعاب کی خاطر الفاظ کا احاطہ نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات قرآن کسی ایسے لفظ کو بھی چھوڑ دیتا ہے جس کی (اس مقام پر) بظاہر ضرورت محسوس ہوتی ہے؛ اس لیے کہ مقصود کی وضاحت اور مطلوبہ ضرورت پوری ہوجانے کے بعد اس لفظ کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔"

⑤ الفاظ کے انتخاب میں قرآنِ کریم کا اسلوب

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

"اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو قرآنیات کا ذوق اور علومِ عربیہ کا کچھ حصہ مرحمت فرمایا ہے وہ یہ جان لے گا کہ قرآنِ کریم کا اسلوبِ کلام، سطحی عوامی اندازِ گفتگو جیسا نہیں، بلکہ الفاظ کے چناؤ، ان کی اصل وضع اور حقیقی معنی موضوع لہ (جس معنی کے لیے لفظ وضع کیا گیا ہے) کی رعایت کے پہلو سے قرآنِ کریم کا جداگانہ اسلوب ہے؛ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی ایک لفظ کی جگہ، کوئی دوسرا مناسب لفظ رکھنا دشوار (بلکہ ناممکن) ہے؛ اس لیے کہ مخلوق اشیا کے حقائق اور ایسے الفاظ وتعبیرات سے ناواقف ہے جو اس مقام کا مکمل حق ادا کرسکیں۔"

⑥ قرآنِ کریم میں تکرار کی حکمت

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قرآنِ کریم میں (مضامین کا) تکرار کبھی تو کسی قدرِ مشترک کی بنا پر ہوتا ہے اور کبھی

قدرِ مغایر کی وجہ سے ہوتا ہے، تکرارِ محض بہت کم ہی ہے، پہلی قسم کے تکرار کی تو ہمیں بہت ضرورت پیش آتی ہے اور کیوں نہیں؟! اگر پہلی قسم کا (قدرِ مشترک کی بنا پر) تکرار نہ ہوتو قرآنِ کریم کی تفسیر خود قرآن سے آسان نہ ہوگی اور احکام وفوائد کے مآخذ بھی اس کثیر مقدار میں میسر نہیں آسکیں گے۔"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مشترک موضوع (کے متعلق مکرر آیات) میں بھی ایک لفظ سے ایک حکم مستنبط ہوتا ہے اور دوسرے لفظ سے دوسرا حکم مستفاد ہوتا ہے تو گویا دونوں مقام، متن اور شرح کی مانند قرار پاتے ہیں، ورنہ (اگر ایک ہی مقام ہوتا تو وہ) محض متن (بلاتوضیح وتشریح) رہ جاتا، نیز تکرار (مضامین) سے مطلوبہ غرض ومقصود کا قابلِ اہتمام ہونا بھی معلوم ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں نماز کا ذکر نوسو (۹۰۰) سے زائد بار ہے، (تو اس سے دین میں نماز کے حکم کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے)۔"

⑦ قرآنِ کریم کی آیات کا باہمی نظم ونسق

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قرآنِ کریم کے بعض مقامات پر آیات میں جو ظاہری بے ربطی نظر آتی ہے، وہ ایک خاص علمی نکتے پر دلالت کرتی ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ جن امور کے درمیان باہمی ربط ومناسبت کے اظہار سے ہماری عقلیں قاصر ہیں، ان میں بھی ربط وتعلق ضرور ہوتا ہے، جن کا احاطہ علّام الغیوب ذات کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک فقیہِ مجتہد، فقہ کے کسی باب کے تحت احکام وجزئیات کو تسلسل کے ساتھ درج کرتا ہے تو بسا اوقات ہمارے ذہن ان جزئیات واحکام کے درمیان باہم مناسبت تلاش کرنے سے قاصر رہتے ہیں، ہم انہیں منتشر جزئیات خیال کررہے

ہوتے ہیں، جبکہ اس فقیہ کے نزدیک وہ جزئیات ایک ہی اصل اور قاعدے کے تحت منضبط ہوتی ہیں“۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ زید فرماتے ہیں:

”نظم وربط کے تعلق سے زیادہ اہتمام اور توجہ کا پہلو ایک ہی آیت کے اجزا کے باہمی ربط کو پہچاننا ہے، یہ پہلو سمجھنا کبھی مشکل ہوتا ہے، ایک ہی آیت (کے اجزا) کا باہمی ربط، بہت سی آیات کے ربط کو سمجھنے سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ بطورِ مثال باری تعالیٰ کا درج ذیل فرمان ملاحظہ فرمایئے:

”فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللهُ.“ (بقرہ:۲۲۲)

ترجمہ: ”تو حیض میں تم عورتوں سے علیحدہ رہا کرو اور ان سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہوجاویں، پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہوجاویں تو ان کے پاس آؤ جس جگہ سے حق تعالیٰ نے تم کو اجازت دی ہے۔“

اس آیتِ مبارکہ میں ”فَإِذَا تَطَهَّرْنَ“، ”ہا“ کی تشدید کے ساتھ قراءت ”حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ“ اور (”ہا“ کی تخفیف کے ساتھ قراءت) کا باہمی ربط ایک مشکل بحث ہے؛ اس لیے کہ بظاہر ”طہور“ (پاک ہونا) سے مراد محض خون کا منقطع ہوجانا ہے، جبکہ ”تطہّر“ (خوب پاکی حاصل کرنا) کے مفہوم میں خون منقطع ہوجانے کے بعد غسلِ طہارت کرنا بھی ہے، اب تشدید کی قراءت کا تخفیف کی قراءت پر مرتب ہونا کیونکر درست ہوگا؟! اس صورت میں نظمِ قرآنی سے کچھ ایسا ہی معنی مستفاد ہوگا، جیسے کسی شخص کو کہا جائے: ”فلاں شخص کو کچھ نہ دینا یہاں تک کہ وہ گھر میں داخل ہوجائے، پس جب وہ مسجد میں داخل ہوجائے تو اس کو دے دینا“ (یعنی اس جملے کی مانند مذکورہ آیت بھی بظاہر بے ربط معلوم ہوتی ہے)۔

(اسی آیت کے پیشِ نظر) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار فرمایا ہے کہ حیض کی اکثر مدت (دس ایام) کے بعد خون رکنے کی صورت میں (غسل سے قبل بھی) قربت کرنا جائز ہے۔ اس صورت میں ''طہر'' سے مراد صرف انقطاعِ دم (خون کا رُکنا) لیا گیا ہے، حالانکہ ''طہر'' میں انقطاعِ دم اور غسل طہارت دونوں معنوں کا احتمال ہے، اسی طرح ''تطہّر'' سے انقطاع دم کے بعد غسلِ طہارت کرنا مراد لیا گیا ہے، حالانکہ اس میں بھی کئی احتمالات ہو سکتے ہیں: انقطاعِ دم کے بعد صرف مقامِ نجاست کو دھو لینا، غسل کرنا، یا وضو کی طہارت حاصل کرنا۔ (ان تمام احتمالات کے باوجود امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے اپنے موقف پر جو استدلال کیا ہے، اس پر اشکال ہو سکتا ہے جس کا) جواب یہ ہے کہ یہاں (آیتِ مبارکہ میں) دو مراتب بیان کیے گیے ہیں:

پہلا مرتبہ: نفسِ جواز، توسّع، سہولت اور رخصت کا ہے۔

دوسرا مرتبہ: عزیمت کا ہے۔

اور زیادہ محتاط عمل ہی اولیٰ ہوا کرتا ہے۔ اب تخفیف کی قراءت کے ذریعہ پہلے مرتبے کی جانب اشارہ ہے اور '' فَإِذَا تَطَهَّرْنَ '' کے ضمن میں دوسرے مرتبے کا بیان ہے، جس میں صریح حکم اور واضح اجازت کی صورت میں اولیٰ اور شارع کے نزدیک پسندیدہ عمل کا بیان ہے۔ البتہ اکثر مدتِ حیض (دس ایام) گزرنے کے بعد چونکہ حیض کے) خون کا رُکنا یقینی ہوتا ہے، اس بنا پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے (اپنے موقف میں) اس کی بجا طور پر رعایت فرمائی ہے۔ اگر دونوں قراءتیں یکساں ہوتیں یا قراءتوں کے اختلاف کے باوجود دونوں میں ایک مفہوم مراد لیا جاتا تو یہ دقیق ولطیف نکتہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔''

راقم عرض کرتا ہے: علامہ سید مفتی آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "روح المعاني" میں اس آیت کے اختلافِ قراءت کے متعلق انتہائی جامع کلام ہے، مراجعت کیجیے، مفید ثابت ہوگا۔ موصوف نے کتاب "الكشف" سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"قراءتِ تشدید (قربت کی) غایتِ کاملہ کے بیان کے لیے اور قراءتِ تخفیف، غایتِ ناقصہ کو بیان کرتی ہے، اور افعال میں "حتّٰی" استعمال ہوتو "إلی" کی مانند اپنے مابعد کے (ماقبل میں داخل ہونے کا تقاضہ نہیں کرتا، لہٰذا یہاں بھی یقینی طور پر غایتِ کاملہ مراد ہوگی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غایتِ کاملہ وہ ہوتی ہے، جو اپنے تمام اجزا کے ساتھ غایت بنے اور وہ اپنے مغیا سے خارج ہو، اور غایتِ ناقصہ وہ ہے جو اپنے آخر کے اعتبار سے غایت ہو۔ اسماء پر داخل ہونے والا "حتی" غایت نہ ہونے کی صورت میں اپنے مابعد کے (ماقبل/مغیا) میں داخل ہونے کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ افعال پر داخل ہونے والا "حتی"، "إلی" کی مانند یہ تقاضا نہیں کرتا کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کا جز ہو۔ چنانچہ انقطاعِ دمِ حیض اپنے آخر کے اعتبار سے حرمتِ (قربت) کے لیے غایت ہے، لہٰذا وقتِ انقطاع حرمت میں داخل ہوگا اور غسلِ طہارت اپنی ابتدا کے اعتبار سے حرمت کے لیے غایت ہے، لہٰذا دونوں قراءتوں (یعنی حتی یطهرن تخفیف کے ساتھ ہو یا تشدید کے ساتھ) کے درمیان کوئی تعارض نہیں، ممکن ہے کہ دونوں غایتوں کا فائدہ یہ ہو کہ قربت کی حرمت کے مراتب میں تفاوت ہے؛ اس لیے کہ انقطاعِ حیض کے بعد کی بنسبت انقطاع سے پہلے (قربت کی) حرمت زیادہ سخت ہے۔"

تنبیہ:...... ماقبل میں ذکر کردہ جواب حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے دورانِ درس بیان کیے گئے کلام

کا ایک حصہ ہے، پھر میں نے شیخ کی ''مشکلات القرآن'' کی جانب رجوع کیا تو وہاں ان کے کلام کو نہایت دقتِ نظر اور غموض کا حامل پایا، جو اس بحث کے مختلف پہلوؤں اور دقائق پر مشتمل ہے، مذکور آیت میں اختلافِ قراءت پر وارد ہونے والے ہر اشکال کا شیخ نے کافی شافی جواب تحریر فرمایا ہے، اسی طرح حنفیہ پر وارد ہونے والے اشکالات کے بھی ایسے جوابات ذکر فرمائے ہیں، جن سے قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے اور علمی پیاس بجھ جاتی ہے، مراجعت فرمالیجیے، تکمیلِ افادہ کی غرض سے یہاں اس بحث کا کچھ حصہ ذکر کردیتا ہوں۔

حنفیہ کی جانب سے جواب کی جس قدر وضاحت میں نے کی ہے، میرے خیال میں اس کی طرف شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

> ''حنفیہ کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ (اختلافِ قراءت کو) ایسی صورت پر محمول فرمائیں، جو وجوب اور استحباب کو عام ہو، شاید مراد یہ ہے کہ چونکہ ''تطھّر'' (پاکی حاصل کرنا) بندے کا اختیاری فعل ہے، جس کو وہ اختیار کرسکتا ہے، لہٰذا یہ دو مراتب کو شامل ہوگا: وجوب اور استحباب۔ اقلّ مدت میں حیض کا خون منقطع ہونے کی صورت میں قربت کے لیے غسل واجب ہوگا اور اکثرِ مدت پر منقطع ہونے کی صورت میں غسل مستحب ہوگا۔''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ توجیہ میری ذکر کردہ رائے کے قریب قریب ہے، اگرچہ دونوں کے درمیاں ایک گونا فرق ہے؛ اس لیے کہ وہاں اقل و اکثر کی تفصیل نہیں ہے، البتہ اگر انقطاعِ دم کا یقینی ہونا شرط ہو تو اکثر مدت میں بلا غسل بھی انقطاع کا یقین ہوجاتا ہے، لہٰذا تب غسل واجب نہ ہوگا اور اقل مدت میں غسل کے ساتھ انقطاع کا یقین ہوجاتا ہے، لہٰذا اس صورت میں غسل واجب ہوگا، بہر کیف اس صورت میں دونوں توجیہات کا حاصل اور نتیجہ ایک ہی ہوگا۔

پھر حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فَإِذَا تَطَهَّرْنَ"، "حَتّٰی يَطْهُرْنَ" پر مرتب ومتفرع نہیں، لہٰذا تب ایک کے ربط اور نظم پر اشکال نہیں ہوسکتا، بلکہ "فَإِذَا تَطَهَّرْنَ" ماقبل میں "فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ" سے مربوط ہے"۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:

"تطهّر" سے مراد پانی کے ذریعے (موضعِ نجاست کو) دھونا یا وضو کرنا یا غسل طہارت مراد نہیں ہے، جیسا کہ بعض اہلِ علم کا مذہب ہے، بلکہ مراد طہارت کا عمل کرنا ہے، اور "باب تفعّل" کی سترہ خاصیات میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے، جیسا کہ "البحر المحیط" (۱/۱۶۵) میں مذکور ہے"۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہ ہے کہ مذکورہ (تین) معانی میں سے کوئی بھی لفظِ "تطهّر" کا حقیقی معنیٰ نہیں، بلکہ اس لفظ کا حقیقی معنیٰ "العمل في الطهارة" یعنی طہارت سے متعلق عمل کرنا ہے، جو اختیاری فعل ہے، اور یہ معنیٰ عام ہے اور تمام معانی کو ایسے ہی شامل ہے جیسے کلی اپنے تمام افراد اور جزئیات کو شامل ہوا کرتی ہے، نیز یہ معنیٰ "باب تفعّل" کی ان سترہ خاصیات میں سے ایک خاصیت ہے، جو صاحبِ "البحر المحیط" نے باری تعالیٰ کے ارشاد "فتلقّٰی آدم من ربّه" (البقرہ:۳۷) (بعد ازاں حاصل کرلیے آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند کلمات) کی تفسیر کے ذیل میں ذکر فرمائی ہے"۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جب (ترکیبی ومعنوی اعتبار سے) معاملہ ایسا ہی ہے تو اس آیت میں دو امور داخل ہوں گے:

۱:...... فعلِ اختیاری یعنی طہارت کا عمل کرنا۔

۲:...... فعلِ غیر اختیاری یعنی انقطاعِ دم کی بنا پر حاصل ہونے والی طہارت۔

اس شرح وبسط کے پیشِ نظر ''بداية المجتهد'' میں (علمائے حنفیہ کے موقف پر) وارد ہونے والا عدمِ ربط کا اشکال بھی وارد نہ ہوگا اور اب کلام کی صورت یوں ہوجائے گی کہ کسی شخص سے کہا جائے: ''فلاں کو ایک درہم نہ دینا، یہاں تک وہ اپنے گھر کے قریب ہوجائے، پس جب وہ گھر میں داخل ہوجائے تو اس کو دے دینا۔'' یا کلام کچھ یوں بنے گا: ''اس کو (درہم) مت دینا، یہاں تک کہ وہ (اپنے گھر میں) داخل ہوجائے، پس جب داخل ہوجائے تو دے دینا۔'' اس نفیس بحث کو محفوظ کرلیجیے، واللہ اعلم!

⑧ قرآن کریم میں وقوعِ نسخ کی تحقیق

قرآن کریم میں منسوخ مقامات کی تعداد کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، قدماء نے زیادہ تعداد بتائی ہے: اس لیے کہ ان کے نزدیک لفظِ ''نسخ'' کے مصداق میں توسّع ہے، (ان کے نزدیک) عام کی تخصیص، خاص کی تعمیم، مطلق کی تقیید، مقید کا اطلاق، استثناء کا وقوع وعدمِ وقوع، حکم کا کلی طور پر منسوخ ہونا اور اس کی علت کا ختم (اور غیر مؤثر) ہونا (ان تمام امور پر نسخ کا اطلاق ہوتا ہے)۔

متأخرین اہلِ علم کی اس باب (میں مقامات کی تعداد) کو کم کرنے کی کوشش رہی، حتی کہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف بیس مقامات پر نسخ کو ثابت قرار دیا ہے اور ہندوستان کی نابغۂ روزگار شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''الفوز الكبير'' میں اس تعداد کو مزید کم کرتے ہوئے نسخ کو محض پانچ مقامات میں منحصر کردیا ہے۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

> ''قرآنِ متلو میں کوئی ایسا مقام نہیں جو حکماً ایسا منسوخ ہوگیا ہو کہ کسی ایک صورت میں بھی اس کا حکم باقی نہ رہے یا اس کا کوئی ایک محمل اور مصداق بھی نہ بن سکے، بلکہ کسی نہ کسی مرتبے، کسی نہ کسی حالت، اور کسی نہ کسی زمانے میں اس کا حکم مشروع رہتا ہے۔''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کردہ یہ فائدہ نہایت اہم ہے، اگر آپ صاحبِ ذوق ہیں تو اس نکتہ کا مزہ لیجیے؛ کیونکہ محاورہ مشہور ہے: ''چکھے بغیر جانا نہیں جاسکتا اور جو شخص کسی چیز کو چکھتا رہتا ہے، تو اس چیز کے متعلق اس کو حکمت وبصیرت حاصل ہوجاتی ہے۔'' واللہ الموفق والهادي إلى الحق!

⑨ قرآنِ کریم میں کوئی حرف زائد نہیں

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''قرآنِ کریم میں کوئی ایسا حرف زائد نہیں کہ جس کا معنی ومقصود کی منظر نگاری میں کوئی دخل نہ ہو، بلکہ قرآن میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔''

راقم عرض کرتا ہے: علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ ''المثل السائر'' (ص: ۱۴۵) میں اللہ تعالیٰ کے ارشادِ گرامی ''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ'' (آلِ عمران: ۱۵۸) (بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے) متعلق تحریر فرماتے ہیں:

اس آیت میں ''لفظ ''ما'' زائد نہیں ہے، بلکہ یہ لفظِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کردہ اُس نعمت کی تفخیم وتعظیم بیان کرتا ہے، جس کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نرم خو ہوئے ہیں، اور اس زیادتی کو محض فصاحت ہی کہا جاسکتا ہے، اگر کلام (لفظِ ''ما'' کی) اس زیادتی سے خالی ہو تو تفخیم وتعظیم کا یہ مفہوم حاصل نہ ہوگا، اس طرح کی زیادتی کلامِ عرب میں بھی وارد ہوئی ہے، مثلاً زباء کا قول ہے:

''أمّا إنّه ليس ذلك من عوز المواس، ولا من قلّة الأواس، ولكنه شيمة ما أناس.''

ترجمہ: ''یہ صورتِ حال نہ تو استروں کی نایابی کی بنا پر ہے اور نہ ہی غم خواروں کی کم یابی کی بنا پر، بلکہ مردانِ کار کی خصلت وعادت ہی یہی ہے۔''

اس کلام کا مفہوم ''ولکنه شیمة أناس'' سے بھی مکمل ہوسکتا تھا، لیکن صاحبِ خصلت کی عظمت وفخامت کو نمایاں کرنے کے لیے لفظِ ''ما'' لایا گیا ہے اور اگر اس لفظِ ''ما'' کو حذف کردیا جائے تو کلام کی یہ فخامت اور جزالت برقرار نہیں رہے گی، ایسے دقیق امور کو اہلِ فن علمائے فصاحت وبلاغت ہی پہچان سکتے ہیں۔ نحویوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ ''ما'' زائد ہے، ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ حرفِ ''ما زائدہ'' اپنے ماقبل کے عمل کرنے میں مانع نہیں ہوتا، جیسے وہ ''ما'' کو کبھی ''ما کافہ'' کا نام بھی دیتے ہیں، یعنی وہ حرفِ ''ما'' جو حرفِ عامل کو اس کے عمل سے روک دیتا ہے، اس طرح اس ''ما'' نے حرفِ ''با'' (جارہ) کو جر دینے کے عمل سے نہیں روکا۔'' انتہی ملخّصًا۔

شیخ (مصطفی صادق) رافعی رحمۃ اللہ علیہ ''إعجاز القرآن'' (ص:۳۰۵، طبع سوم) میں رقمطراز ہیں:

''قرآنِ کریم کے جن کلمات کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ زائد ہیں، جیسے: باری تعالیٰ کے فرمان: ''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ'' (آل عمران:۱۵۸) اور ارشادِ ربانی ''فَلَمَّآ أَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ'' (یوسف:۹۶) (پس جب خوشخبری لانے والا آپہنچا) کے متعلق علمائے نحو کا کہنا ہے کہ پہلی آیت میں ''ما'' اور دوسری آیت میں ''أن'' ترکیبی اعتبار سے زائد ہیں، بعض بے بصیرت لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ (ترکیب کی طرح) نظمِ قرآنی کے اعتبار سے (بھی) یہ دونوں (اور ان جیسے حروف وکلمات) زائد ہیں، حالانکہ ایسے اضافات میں منظر کشی کا ایسا خاص رنگ نمایاں ہوتا ہے کہ اگر انہیں کلام سے حذف کردیا جائے تو کلام کا حسن وجمال اور جاذبیت جاتی رہتی ہے؛ کیونکہ پہلی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی قوم کے متعلق نرم خوئی کی تصویر کشی مقصود ہے اور یہ بتانا ہے کہ آپ کی یہ نرم خوئی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ لفظِ ''ما'' وصفِ لفظی کے طور پر لاکر اس نرمی کے مفہوم کی تاکید اور اس کی تعظیم وتفخیم

کا اظہار مقصود ہے۔ مزید براں اس حرفِ ''ما'' کی ادائیگی میں ایسے لطف وعنایت کا احساس ہوتا ہے کہ سیاق وسباق کی بلاغت میں اس سے بڑھ کر خوبصورت مفہوم نہیں ہے۔ پھر اس آیت میں ''باجارہ'' اور اس کے مجرور لفظِ ''رحمۃ'' میں ''ما'' کا فصل، نفس کو مفہوم ومقصود کے تدبر کی طرف متوجہ کرتا ہے اور فکر ونظر کو اس رحمت کی بلندی پر متنبہ کرتا ہے اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آیت کی بلاغت میں یہ سب فطری دِکھتا ہے۔

دوسری آیت میں (حرفِ ''أن'' کے ذریعہ) حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی بدولت خوش خبری سنانے والے کے قیام اور اس کی آمد کے درمیانی فاصلے کی منظر کشی مقصود ہے؛ اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کے درمیان (مسافت کی) دوری حائل تھی تو وہ انتہائی قلق واضطراب کی حالت میں خوش خبری کے منتظر تھے، اس قلق واضطراب کی تاکید اور خوشخبری کی نوید سنانے والے کی آمد پر خوشی وسرور اور جوش وجذبے کی کیفیات کلمہ فصل ''أن'' میں نون کا غنہ بیان کر رہا ہے۔

یونہی قرآنِ کریم میں جہاں کہیں (کسی حرف یا کلمے کے) زائد ہونے کا گمان ہے (ان میں ایسے ہی دقیق نکات مخفی ہیں)؛ کیونکہ قرآن کریم میں (کسی خاص حکمت کے بغیر) محض (بے معنی) زیادتی کا اعتبار اور اس کے مفہوم کا اقرار ایک نقص ہے، قرآن ایسے ہر نقص وعیب سے بلند وبرتر ہے۔''

⑩ قاعدہ ''العبرۃ لعموم اللفظ'' عام نہیں

علمائے اصول کے نزدیک یہ قاعدہ مشہور ہے: ''العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب'' یعنی ''الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے، سبب کے خصوص کا اعتبار نہیں ہوتا۔''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ قاعدہ عام نہیں ہے، اس سلسلے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ متکلم کی غرض اور مقصود کی تلاش وجستجو کا اہتمام کیا جائے، یہ ضروری نہیں کہ متکلم کے کلام کے ظاہری الفاظ، تمام احوال میں اس کی غرض کے عین موافق ومساوی ہوں، بلکہ بسا اوقات ظاہری الفاظ متکلم کی غرض سے عام اور کبھی خاص ہوتے ہیں اور کبھی مساوی وموافق بھی ہوتے ہیں، لہٰذا محض الفاظ کے عموم کا اعتبار اس وقت ہوگا جب شارع کی غرض متعین نہ ہو اور شارع کی مراد ومقصود پر کوئی واضح دلیل نہ ہو۔ دیکھیے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ'' (مزمل: ۲۰) (تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو) کیا اس آیت سے یہ مراد لیا جائے گا کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر محض ایک آیت پر اکتفا، نمازی کے (اپنے قرض سے) سبکدوش ہونے کے لیے کافی ہے؟! کیا دیگر خارجی امور کی رعایت کیے بغیر، نماز میں محض ایک آیت پڑھ لینے سے ایک شخص قرآنی حکم کو پورا کرنے والا شمار ہوگا؟! کیا حکمِ قرآنی پر اتنا عمل کافی ہے کہ سورۂ فاتحہ اور دیگر واجبات کی تعیین کیے بغیر نماز ادا کر لی جائے؟! اگر ایسا ہی ہو تو گویا قرآن نے ہمیں ایسی چیز کا حکم دیا جس کا ہمیں شریعت نے پابند نہیں کیا، بلکہ شریعت کا لازم کردہ حکم کوئی اور ہے!! حاشا وکلاّ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، اگر کوئی شخص ایسے خیالات رکھے گا تو صراطِ مستقیم سے بھٹکا ہوا اور مقصودِ شریعت سے بے بہرہ شمار ہوگا، بلکہ درحقیقت اس حکم سے قرآن کا مقصود مریضوں، مسافروں اور مجاہدین کے لیے حکم برقرار رکھ کر اپنے خصوصی فضل ورحمت سے ان پر قراءت میں تخفیف اور آسانی وسہولت برتنا ہے؛ اس لیے کہ قیام اللیل کے حکم پر عمل ان کے لیے دشوار تھا۔

جہاں تک سورۂ فاتحہ کی (نماز کی) رکنیت اور وجوب کا مسئلہ ہے تو وہ ایک اور قاعدے "الزيادة على القاطع بالظني" (ظنی دلیل مثلاً اخبارِ آحاد کے ذریعے قطعی حکم پر زیادتی) پر متفرع ہے، چنانچہ حنفیہ کے نزدیک ظنیت کے درجے میں یہ زیادتی جائز ہے، یعنی قطعی پر یہ زیادتی ایک ظنی امر ہے، جو حکم کے اعتبار سے بھی قطعی نہیں (ظنی ہی) شمار ہوگا، اگر اس ظنی حکم پر عمل بھی واجب ہوگا۔ جبکہ شافعیہ کے نزدیک یہ زیادتی بھی قطعیت کے مرتبے میں جائز ہے، حنفیہ نے ظنی دلیل پر عمل کو بالکل ترک نہیں کیا، بلکہ قطعیت وظنیت دونوں (دلیلوں کا) فرق ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ایک کو اس کے مناسب درجہ ومقام دیا ہے، (چنانچہ دلیلِ قطعی کی بنا پر مطلق قراءت کو فرض اور دلیلِ ظنی/خبرِ واحد کی بنا پر سورۂ فاتحہ کی قراءت کو واجب قرار دیا ہے)۔

حنفیہ کے ہاں یہ عام تعبیر بھی ملتی ہے: "لا يجوز الزيادة على كتاب الله بخبر الواحد" (خبرِ واحد کے ذریعے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں) یہ تعبیر نامناسب معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ سورۂ فاتحہ کے بغیر محض دلیل قطعی کے تقاضے پر عمل کرنے والا (یعنی محض مطلق قراءت پر اکتفا کرنے والا) اگرچہ حنفیہ کے نزدیک حکمِ قرآنی کی بجا آوری کرنے والا شمار ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص قصداً ایسا کرے تو وہ گناہ گار ضرور شمار ہوگا اور اس پر نماز کا اعادہ بھی واجب ہوگا، جبکہ مذکورہ عام تعبیر کی بنا پر تو قرآنی حکم کے مصداق میں ایک ناپسندیدہ زیادتی ٹھہرے گی، یہ کہنا کسی طور پر مناسب نہیں۔ البتہ امر سے آمر کی غرض ہی مراد ہوگی، لیکن دونوں مراتب۔ منطوقِ قطعی اور معہودِ ظنی۔ کے تفاوت کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔ قطعیات میں اجمال کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر پر ہوتا ہے، مثلاً امت کے لیے حکم کی بجا آوری میں وسعت اور سہولت فراہم کرنا وغیرہ۔"

یہ اہم نکتہ یاد رکھیے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے میں یہی سمجھا ہوں۔

امام حافظ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''إحکام الأحکام'' میں ایک فائدہ میری نظر سے گزرا، جو ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ افادات جیسے نکتے پر ہی مشتمل ہے۔ امام موصوف رقمطراز ہیں:

''یہ قاعدہ مشہور ہو چکا ہے کہ ''العبرۃ لعموم اللفظ، لا لخصوص السبب'' (الفاظ کے عموم کا اعتبار ہے، سبب کے خصوص کا اعتبار نہیں)، لیکن دو الگ الگ نوعیتوں میں فرق کرنا ضروری ہے، ایک صورت یہ ہے کہ سیاق اور قرائن، عموم کی تخصیص اور متکلم کی مراد پر دلالت کر رہے ہوں اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی (خاص) سبب میں کوئی خاص حکم وارد ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں کو یکساں حکم نہیں دیا جا سکتا؛ کسی (خاص) سبب میں عام حکم وارد ہونا اسی سبب کے ساتھ حکم کی تخصیص کا تقاضا نہیں کرتا، مثلاً: باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا'' (المائدۃ:۳۸) (اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے، سو ان دونوں کے (داہنے) ہاتھ (گٹے پر سے) کاٹ ڈالو)۔ یہ آیت حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کے چادر کے سرقے کی بنا پر نازل ہوئی تھی، لیکن بدیہی اور اجماعی طور پر یہ حکم اسی واقعے کے ساتھ خاص نہیں، البتہ سیاق اور قرائن، کلام سے متکلم کی مراد پر دلالت کرتے ہیں اور وہی مجملات کی توضیح اور محتملات کے تعیین کی طرف رہبری کرتے ہیں۔'' (إحکام الأحکام)

⑪ ''أحرفِ سبعہ'' کی تحقیق

امام ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''گزشتہ دو ابواب میں زوائد کی قبیل سے جو حروف ہم نے ذکر کیے ہیں، اہلِ علم نے انہیں اس طور پر (تواتر کے ساتھ) نقل نہیں فرمایا، جیسے دو گتّوں کے درمیان

درج قرآنِ کریم ہے، اسی کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے اور دو گتّوں کے درمیان محفوظ اسی قرآن کے منکر پر کفر کا فتوی لگایا جاتا ہے اور وہی ''مصحفِ امام'' میں ثبت ہے، جس کو مہاجرین وانصار کے اجماع واتفاق کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھوایا اور اس کے علاوہ دیگر (حروف) کو ساقط قرار دیا ہے، بعد ازاں امتِ مسلمہ کا اس پر اتفاق ہو گیا، چنانچہ اب اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا، اب اس قرآن کو ایک ناواقف آدمی بھی ویسے ہی پہچانتا ہے جیسے ایک عالم جانتا ہے اور صدیوں سے یہ متوارث اور نقل در نقل چلا آ رہا ہے، اسی کو مکتب و مدرسے میں بچے سیکھتے ہیں، یہ جمع و نسخ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب میں سے ایک عظیم منقبت ہے، بعض کج رو لوگوں نے اس بنا پر انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا، لیکن ان کی گمراہی خلقِ خدا کے سامنے واضح ہو چکی ہے۔......''

کچھ آگے بڑھ کر رقم طراز ہیں:

''......حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جمع کردہ (مصحف) ہی آج مسلمانوں کے درمیان موجود ہے اور اس کے منکر کے لیے وہی حکم ہے جو مرتد کے لیے ہے کہ پہلے تو اسے توبہ کرنے کی دعوت دی جائے گی اور اگر توبہ کرنے سے انکار کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ باقی رہے وہ حروف جن کا علم اسناد وروایات کے ساتھ منقول نہیں، جنہیں خاص اہلِ علم ہی جانتے ہیں، عوام الناس ان سے واقف نہیں، ان حروف سے اہلِ علم کا مقصود ان دو گتّوں کے درمیاں محفوظ قرآنِ کریم کی تاویل و تفسیر کے لیے استشہاد ہوتا ہے اور وہ اس قرآن کے معانی و مطالب اور وجوہ واحتمالات کی پہچان کے لیے دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً:

۱:......حضرت عائشہ وحضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی قراءت: ''حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ، والْوُسْطٰى صَلَاةُ الْعَصْرِ''۔(البقرۃ:۲۳۸)

۲:......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت: ''وَالسَّارِقُوْنَ وَالسَّارِقَاتُ فَاقْطَعُوْا أَيْمَانَهُمْ.'' (المائدۃ:۳۸)

۳:......حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت: ''اَلَّذِيْنَ يُوَلُّوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصَ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ، فَإِنْ فَاؤُوْا فِيْهِنَّ.'' (البقرۃ:۲۲۶)

۴:......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت: ''لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَبِّكُمْ فِيْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ.'' (البقرۃ:۱۹۸)

۵:......حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی قراءت: ''فَإِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ لَهُنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.'' (النور:۳۳)

یہ قراءتیں اور ان جیسی بہت سی دیگر قراءتیں قرآنِ کریم کی تفسیر کرتی ہیں، قرآنِ کریم کی تفسیر کے متعلق اس نوع کے اقوال تابعین سے بھی مروی ہیں، جنہیں مستحسن شمار کیا جاتا ہے تو پھر جو تفاسیر، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہوں اور نفسِ قراءت میں شمار ہوتی ہوں تو وہ تفاسیر بلند مرتبہ اور قوی ترین قرار پائیں گی، ان تفسیری قراءت سے ادنیٰ درجہ میں تفسیرِ قرآن کی صحت کی معرفت مستنبط ہوسکتی ہے، البتہ علم قراءت کی فضیلت عام لوگ نہیں جان سکتے، بلکہ علماء ہی اس کے مرتبے کی پہچان رکھتے ہیں۔......''

آگے مزید فرماتے ہیں:

''اس نوع کی قراءتیں بہت سی ہیں، اگر غور کیا جائے تو ایک ذہین اور سمجھدار شخص کے لیے ان میں وسیع علمی خزانہ مخفی ہے اور ''احرفِ سبعہ'' کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی حرف کو سات طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے، یہ شئے تو موجود نہیں، بلکہ ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم مجموعی طور پر عربوں کی لغات میں سے سات مختلف لغات میں نازل ہوا ہے، چنانچہ اس میں ایک حرف (لفظ) ایک قبیلے

کی لغت میں ہوتا ہے، دوسرا اس کے علاوہ کسی اور لغت میں اور تیسرا ان دونوں کو چھوڑ کر کسی اور لغت میں ہوتا ہے اور اس طرح (پورے قرآن کریم میں کل) سات لغات پائی جاتی ہیں، نیز بعض قبائل اس حوالے سے زیادہ خوش بخت اور دیگر قبائل کی بنسبت زیادہ حصہ حاصل کیے ہوئے ہیں اور یہ نکتہ احادیث میں بھی واضح ہے (بہر کیف) ''احرفِ سبعہ'' سے مراد یہی لغات ہیں۔''

(ماخوذ از ''فضائل القرآن'' امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ، مخطوط، ۲، ۱۵۲، یا ۱۷۵، مطبعۃ فضالۃ، المغرب، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء)

⑫ حدیث: ''أُنزل القرآنُ علی سبعۃ أحرفٍ'' کی تحقیق

یہ حدیثِ مبارک ''أنزل القرآن علی سبعة أحرف'' (قرآنِ کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے) حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت حذیفہ، حضرت ہشام بن حکیم، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس کو روایت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد اکیس (۲۱) تک پہنچتی ہے، امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ کے بقول: ''یہ حدیث متواتر ہے۔''

روایات کے مختلف طرق کے سیاق وسباق سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقصود رخصت و سہولت مہیا کرنا اور ان لوگوں کی مشکل دور کرنا تھا، جو صرف اپنی لغت اور اپنے لہجے کے عادی ہو چکے تھے (اور دیگر لغات ولہجوں میں قرآنِ کریم کا پڑھنا ان کے لیے دشوار تھا)، بعد ازاں جب انہیں (دیگر لغات ولہجوں میں پڑھنے کی بھی) عادت اور مشق ہوگئی تو باقی حروف منسوخ ہو گئے اور صرف ایک حرف یعنی لغتِ قریش باقی رہ گیا، اصل نزول بھی اسی لغت میں ہوا تھا، پھر ابتدا میں تخفیف اور

آسانی کی خاطر دیگر لغات نازل ہوئیں اور آخر کار (لغتِ قریش کے علاوہ) باقی سب لغات منسوخ ہوگئیں۔ چنانچہ امام ثعلب، امام ابوعبید، امام ازہری رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر اہلِ علم کا مختار قول یہی ہے کہ ''احرفِ سبعہ'' سے مراد سات لغات ہیں۔

پھر ان لغات کا اختلاف یا تو اختلاف کلمات کے قبیل سے ہے، جیسے: ''حتّٰی'' اور ''عتّٰی''، ''الأثیم'' اور ''الفاجر''، ''أقبِل'' اور ''تعال''، ''ھلُمَّ'' اور ''عجّل'' اور ان جیسے کلمات، یا اختلافِ حرکات یا اختلافِ اعراب مراد ہے، یا پھر لہجات اور بوقتِ تلاوت ادائیگی کی کیفیت کے اختلاف کے قبیل سے ہے، یعنی ادغام و اظہار، تفخیم و ترقیق، تسہیل و تحقیق اور امالہ و اشمام (میں اختلاف مراد ہے)۔

بہر کیف مشق ہوجانے اور عادت پڑ جانے کے بعد کلمات کا اختلاف تو ختم ہوگیا، لیکن حرکات و لہجات اور ادائیگی کی کیفیت کا اختلاف برقرار رہا، جسے ایک ہی حرف میں یا رسم الخط میں درج کرلینا ممکن ہے، بہر حال امام ابوشامہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیگر علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ''احرفِ سبعہ'' سے ''قراءاتِ سبعہ'' ہر گز مراد نہیں ہیں، بلکہ ''قراءاتِ سبعہ'' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور (ان شاء اللہ) تا قیامت باقی رہیں گی۔

گزشتہ سطور میں اختیار کردہ یہ رائے امام ابن قتیبہ اور امام ابوعبید رحمہما اللہ کے اقوال کا مجموعہ ہے، امام ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کی تفصیل اپنی کتاب ''تأویل مشکل القرآن'' میں درج کی ہے، مذکورہ کتاب میں صفحہ نمبر ۶ اور اس کے بعد کے صفحات ملاحظہ فرمائیے۔

⑬ قرآنِ کریم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب

امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی آیات کی ترتیب توقیفی ہے، البتہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق:

۱:......بعض اہلِ علم کا کہنا ہے: یہ ترتیب بھی توقیفی ہے۔ امام ابوجعفر نحاس، امام ابوبکر بن الانباری رحمہما اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، نیز امام بیہقی رحمہ اللہ کا بھی یہی رجحان ہے، اس قول کی تائید بعض روایات اور مصحفِ عثمانی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ہوتی ہے، اگرچہ یہ اجماع سکوتی ہے۔

۲:......دوسرا قول ہے: (سورتوں کی یہ ترتیب) اجتہادی ہے اور اس قول پر اجماع بھی نقل کیا گیا ہے، یا یوں کہیے کہ جمہور اہلِ علم کی یہی رائے ہے، جن میں امام مالک، قاضی ابوبکر باقلانی رحمہ اللہ علیہم اور دیگر علماء بھی شامل ہیں۔

۳:......بعض دیگر علماء کا قول ہے: بعض سورتوں کی ترتیب توقیفی اور بعض کی اجتہادی ہے، بعض روایات اور قرائن سے اس قول کی بھی تائید ہوتی ہے۔

۴:......بہتر ہے کہ یوں کہا جائے: قرآنِ کریم کی سورتوں کی ترتیب بالفعل توقیفی ہے، بالقول توقیفی نہیں، یعنی یہ ترتیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل اور مصحفِ عثمانیہ کی ترتیب سے ثابت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ترتیب کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا باہمی اختلاف بھی منقول ہے، جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف (میں سورتوں) کو خاص طرز پر مرتب فرمایا تھا؛ کیونکہ آیات کی ترتیب کی طرح سورتوں کی ترتیب کے متعلق (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا) کوئی صریح ارشاد اور واضح نص نہیں تھی، اس لیے کچھ سورتوں (کی ترتیب) کے متعلق اختلافِ رائے رہا۔ غور وتدبر کے بعد راقم کا میلان اسی مؤقف کی جانب ہے۔ واللہ اعلم!

اس رسالہ کی تکمیل سے جمعہ کی مبارک شب میں ۱۸/رجب ۱۴۳۶ھ کو فراغت حاصل ہوئی، جبکہ اسی سال ماہ جمادی الاولیٰ کے آخر میں اس کی تالیف کا آغاز ہوا تھا۔

اے اللہ! میری جانب سے اس رسالہ کو قبول فرمالیجیے، اس کو محض اپنی رضا وخوشنودی کا ذریعہ بنائیے، اپنے مسکین و عاجز بندے پر حکیمانہ نصیحت اور کتابِ مبین کے اسرار کھلنے کا وسیلہ

بنائیے اور اس غمگین بندے کے لیے اپنی خفیہ خزانوں پر مشتمل کتاب کے علوم کی طرف راہنمائی کا ذریعہ بنائیے۔

اے اللہ! قرآنِ عظیم کو میرے دل کی بہار، میری آنکھوں کا نور، میرے غموں اور پریشانیوں کے ازالے کا سبب بنادیجیے۔

اے اللہ! آپ سے آپ کی خاص رحمت کا سوالی ہوں، جس کے ذریعے آپ میرے قلب کو ہدایت عطا فرمائیے، میرے منتشر و پراگندہ امور کو یکجا فرمائیے، میرے باطن کو درست فرمائیے، میرے ظاہر کو بلند مرتبہ عطا فرمائیے، میرے عمل کو پاک فرمائیے، میرے دل میں رشد و ہدایت الہام فرمائیے، میری محبت مجھے لوٹائیے اور مجھے ہر بُرائی سے محفوظ فرمائیے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سید المرسلین و إمام المتقین محمد و آلہ وصحبہ أجمعین، آمین آمین یا ربّ العٰلمین، ربّ السماوات والأرضین، وربّ الأولین والآخرین!